جولائی ۶۸ء

اقامتِ دین کا داعی

فی پرچہ ۸۰ پیسے

آٹھ روپے

ماہنامہ زندگی رامپور

مدیر:۔ سید احمد قادری

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۱۴ شلنگ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۔۔۔۔ ۸/-
پاکستان سے ۔۔۔۔ ۸/-
ششماہی
ہندوستان سے ۔۔۔۔ ۴/-
پاکستان سے ۔۔۔۔ ۴/-
فی پرچہ ستر پیسے

جلد:۔ ۴۱ | ربیع الآخر ۱۳۸۸ھ مطابق جولائی ۱۹۶۸ء | شمارہ: ۱

فہرست مضامین

(ع - ن)

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آیندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے اس مہینے میں چندہ یا رسالہ بند کرنے کیلئے خط نہ مل سکا تو ان شاء اللہ اگلا پرچہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔ — منیجر ماہنامہ زندگی رامپور

مالک:۔ جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع روہیلا پرنٹرس خاص روڈ رامپور۔ یوپی
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی۔ رام پور۔ یوپی۔

اشارات

سید احمد قادری

حلقۂ مغربی یو۔پی و دہلی کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کا دو روزہ اہم اجتماع، ۲۹۔۳۰ مئی ۱۹۷۶ء کو رام پور میں منعقد ہوا تھا ۲۹ مئی کو درس گاہ جماعت اسلامی رام پور کے ہال میں بوقت ساڑھے آٹھ بجے صبح میں نے "دین کیا ہے؟" کے عنوان پر تقریر کی تھی، وہی تقریر آیتوں کے حوالے بڑھا کر بشکل اشارات پیش کی جا رہی ہے۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد، حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں عنوان پر اظہار خیال کروں، دو اہم باتیں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ دین کے جاننے کا اصل اور صحیح ترین ماخذ کیا ہے؟ ہمیں کہاں سے یہ معلوم ہو کہ دین کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا اصل ماخذ قرآن مجید کی آیات اور صحیح احادیث ہیں۔ اس وقت اردو زبان میں بھی دین کیا ہے؟ کا جواب دینے والی کتابیں پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان میں کی بہت سی ایسی ہیں جن میں دین کا محدود اور ناقص تصور پیش کیا گیا ہے اور اگر میں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان میں کی بہت سی کتابیں دین کا غلط تصور بھی پیش کرتی ہیں اس لئے یہ بات بہت اہم ہے کہ دین کو اس کے اصل ماخذ سے سمجھا جائے۔ میں جو کچھ عرض کرنے والا ہوں اس کا اصل ماخذ کتاب و سنّت ہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرآن کی آیتوں اور صحیح حدیثوں میں جو حقیقتیں بیان کی گئی ہیں اور جو احکام دیئے گئے ہیں ان کی صحیح تعبیر کیا ہے اور کون اس کا مستحق ہے کہ اس کی تعبیر و تشریح کو ہم صحیح اور مستند سمجھیں؟ اس وقت مدعیان اسلام کا ایک طاقت ور طبقہ ایسا موجود، بلکہ سرگرم ہے جو کہتا ہے کہ قرآن قطعی ہے اور احادیث بھی حجت ہیں لیکن اس کی تعبیر وہ ہے جو ہم کرتے ہیں اور اس کی تعبیر کا حال یہ ہے کہ مثال کے طور پر اس کے نزدیک آخرت نام ہے دنیا کے مستقبل کا۔ اس تعبیر کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے کہ قرآن و حدیث کو ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ــــ ہمارے نزدیک وہی تعبیر و تشریح صحیح اور مستند ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے مقدس ساتھیوں اور ائمہ دین نے اپنے قول و عمل سے پیش کی ہے اور جس پر چودہ سو سال سے اہل حق کا اتفاق چلا آ رہا ہے

اس مختصر تمہید کے بعد عرض ہے کہ اگر مجھے اجمال کے ساتھ "دین کیا ہے؟" کا جواب دینا پڑے تو میں کہوں گا کہ:-

دین اسلام ایک ایسے نظامِ اطاعت کا نام ہے جو انسانی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور جس کے دائرے سے حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ باہر نہیں ہے۔ اس نظامِ اطاعت کی سربفلک عمارت جن بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہے انھیں ہم عقائد کہتے ہیں یہ بنیادیں جتنی گہری اور مضبوط ہونگی، عمارت اتنی ہی مضبوط و مستحکم، وسیع اور عالی شان ہوگی اور یہ جتنی سطحی اور کمزور ہونگی عمارت اتنی ہی بودی، تنگ اور بے رونق ہوگی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دین اسلام کے تین بنیادی عقائد ہیں، توحید، رسالت اور آخرت یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان اور آخرت پر ایمان۔ توحید یہ ہے کہ ہمیں اس حقیقت پر کامل یقین اور اطمینان حاصل ہو کہ صرف اللہ ہی اس پوری کائنات کا خالق، مالک، رب، رازق، معبود اور حاکم ہے اس کی الوہیت اور ربوبیت میں اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے، کوئی اس کا مثل اور ہمسر نہیں ہے، اس کائنات کی ہر شئے اپنے وجود اور بقا میں اس کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ تنہا اسی کی ذات غنی اور بے نیاز ہے وہ ہر نقص اور ہر عیب سے پاک ہے اور ہر چیز کی زندگی موت اور بناؤ بگاڑ صرف اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ پرستش کا مستحق صرف وہی ہے کوئی دوسرا پرستش کے لائق نہیں، اطاعت کے لائق صرف وہی ہے کسی دوسرے کی اطاعت اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، وہ مالک ہے اور سب اس کے غلام اور اس کی رعیت ہیں، وہ بادشاہ ہے اور صرف اسی کا حکم اور فرمان لائق تعمیل ہے، اس کے اذن کے بغیر ہر حکم اور ہر فرمان باطل اور مردود ہے۔ وہ علیم ہے اور اس کا علم پوری کائنات پر محیط ہے، ہر چھوٹی بڑی چیز اس کے دائرہ علم کے اندر ہے، اس کے علم تک کسی کی رسائی نہیں الا یہ کہ وہ خود کسی کو کچھ بتائے اور سکھائے وہ انسان کا خالق ہے اور اسی کو حق ہے کہ اس کی تخلیق کا مقصد بتائے، مخلوق کو اس کا حق نہیں کہ اپنی تخلیق کا مقصد خود متعین کرے، وہ رحمان و رحیم، حکیم اور عادل ہے، یہ کائنات اس کی رحمت، حکمت اور عدل کی جلوہ گاہ ہے، وہ ہادی ہے اور اس کی ہدایت، اس کی رحمت، حکمت اور عدل سے ہم رشتہ ہے۔

اجمال و اختصار کے ساتھ یہ ہے توحید کا وہ تصور جو ہمیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت نے عطا کیا ہے، ان میں کی ہر بات پر قرآن حکیم کی متعدد آیتیں گواہ ہیں۔ میں صرف یہاں چند آیتوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں۔ بیانِ توحید میں آیۃ الکرسی ایک بڑی جامع آیت ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین آسمان میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ کون ہے جو

اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔

(البقرہ ۳۴)

یہ اللہ پر ایمان اور عقیدۂ توحید کا کتنا نکھرا ہوا اور واضح تصور ہے جس نے شرک، کفر اور الحاد کے ہر رخنے کو بند کر دیا ہے۔ اس کے بعد سورۂ اخلاص پڑھئے اس میں کہا گیا ہے :۔

"کہہ دو کہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے نہ وہ باپ ہے، نہ وہ بیٹا، نہ کوئی اس کی برابری کا ہے۔"

اس چھوٹی سی سورۃ کو "الاخلاص" کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس نے اسلام کے دیئے ہوئے عقیدۂ توحید کو ہر قسم کے شرک سے پاک کر کے خالص کر دیا ہے، اس میں شرک کا کوئی کھوٹ اور اس کی کوئی آمیزش موجود نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ کا شرک ہو یا بت پرستوں کا یا آریوں کا، اس میں ہر شرک کی نفی کی گئی ہے۔ سورہ البقرہ کی ابتدا میں بندوں کو بندگیٔ رب کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا ہے :۔

"لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے (عذاب سے) بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل نہ ٹھہراؤ"

(البقرہ آیت ۲۱-۲۲)

"دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ بندگی اور پرستش کی مختلف اقسام میں سے کسی قسم کا رویہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے" مدِمقابل ٹھہرانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنی زبان سے کسی کو اللہ کا ہمسر اور مقابل کہا جائے، کوئی مشرک اپنی زبان سے اپنے کسی معبود کو بھی خدا کا ہمسر اور مقابل نہیں کہتا لیکن عملاً

اپنے معبودوں کی پرستش اور ان کی بندگی میں وہ رویہ اختیار کرتا ہے جو صرف اللہ کا حق ہے۔ اللہ کے نزدیک اس کا یہ عملی رویہ دوسروں کو ہمسر اور مدمقابل ٹھہرانے کا ہم معنی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عملی شرک بھی عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔ سورہ الفرقان کی ابتدائی تین آیتوں کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں توحید کی حقیقت کس طرح واضح کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:-

"نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لئے نذیر (ڈرانے والا) ہو۔ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لئے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں جو خود اپنے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے جو نہ مار سکتے ہیں، نہ جلا سکتے ہیں، نہ مرے ہوئے کو پھر اُٹھا سکتے ہیں۔"

(الفرقان ۱۔۲۔۳)

ان آیتوں نے واضح کیا کہ اللہ ہی ہادی (ہدایت دینے والا) اور حاکم ہے پوری کائنات کی بادشاہی اسی کی ہے اور اس کی حکومت و بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی خالق بھی ہے اور اپنی مخلوق کی زندگی، موت اور موت کے بعد پھر زندہ کرنے کا مالک بھی ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو تنہا وہی معبود بھی ہے، کسی بے بس کو معبود بنانا بڑی حماقت اور صریح جہالت ہے کسی کا ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہونا تو دور کی بات ہے اس نے کسی کو اپنا متبنیٰ بھی نہیں بنایا ــــ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں دوسری جامع ترین آیت سورۂ الحشر کے آخری رکوع میں ہے، اس میں کہا گیا ہے۔

"وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، غائب اور حاضر ہر چیز کا جاننے والا، وہی رحمان اور رحیم ہے، وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، نہایت مقدس، سراسر سلامتی، اور امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا، اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے، اس کے لئے بہترین نام ہیں، ہر چیز جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ (بہترین نام) گنائے گئے ہیں جن میں کا ہر نام اس کی کسی ایک صفت کا اظہار کرتا ہے جب تک اللہ پر ان تمام صفات کے ساتھ ایمان نہ لایا جائے جن کا ذکر قرآن اور حدیث میں ہے، توحید مکمل نہیں ہوتی، توحید کے مدعی اہل کتاب بھی ہیں، آریہ سماجی بھی اور کچھ دوسرے فرقے بھی لیکن ان میں سے ہر ایک کی توحید، شرک کے ساتھ مخلوط ہے اور ان میں کا کوئی بھی حقیقی معنی میں موحد نہیں ہے۔ قرآن میں مشرکوں اور اہل کتاب دونوں کے بارے میں کہا گیا ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (اور انہوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق ہے) توحید تمام عقاید و اعمال کی اصل ہے اس لئے جب تک اس کی تکمیل نہ ہو۔ ایمان باللہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص فی الواقع موحد ہو تو پھر اس کے لئے رسالت اور آخرت پر ایمان لانا دشوار نہ رہے اس لئے کہ یہ دونوں عقیدے، عقیدۂ توحید کا تقاضا اور اس کی فرع ہیں۔

رسالت اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام پہنچانے کا ایک عظیم منصب ہے۔ یہ منصب اللہ نے اپنے ان برگزیدہ بندوں کو عطا فرمایا ہے جو اس کے علم میں اس کے اہل تھے۔ رسالت اور نبوت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عبادت، ریاضت، مراقبہ، دھیان گیان یا اور کسی تدبیر سے حاصل ہو سکتی ہو۔ قرآن میں اس حقیقت کو متعدد مقامات پر مختلف اسلوب سے واضح کیا گیا ہے، یہاں ان تمام آیتوں کو پیش کرنا موجب طوالت ہے۔ سورۂ الانعام آیت ۱۲۴ میں فرمایا گیا ہے:-

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغام بری کا منصب کس کو عطا کرے) رسالت، اللہ کی رحمت، حکمت، اور عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی رحمت انسان کی مادی زندگی کے لئے تو تمام انتظامات فرمائے لیکن اس کی روحانی زندگی کے لئے کوئی انتظام نہ کرے۔ یہ کون باور کر سکتا ہے کہ کوئی عادل اور انصاف در بادشاہ اپنی رعیت کو جرائم سے تو بالکل آگاہ نہ کرے اور پھر انھیں کسی جرم پر پکڑ لے۔ یہ بات کسی معمولی حاکم سے بھی متوقع نہیں ہے، سب سے بڑے حاکم سے کس طرح متوقع ہو گی۔ رسالت کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ نے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ اپنی مرضیات و نامرضیات کی پوری تفصیل بتا دی ہے اور اس کے نازل کردہ قوانین ہی جزا اور سزا کے معیار ہیں۔ ہم سب لوگ یقین رکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے سب سے پہلے نبی و رسول تھے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی و رسول ہیں اور قرآن حکیم اللہ کی آخری کتاب ہے اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی کتاب آنے والی ہے۔ قرآن ہی کے مجموعۂ احکام کا نام دین اسلام ہے۔

دنیا کے آخری نبی نے اپنے قول و عمل سے اس مجموعۂ احکام کی پوری طرح توضیح و تشریح کردی ہے اور ان کی سنّت دین کا دوسرا ماخذ ہے۔ قرآن میں کیا ہے، اس کی تفصیل تو قرآن پڑھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے میں یہاں اشارۃً اس کی صرف چھ باتوں کا ذکر کرتا ہوں۔ (۱) دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے صحیح جواب تک ہماری عقل بطور خود نہیں پہنچ سکتی، اگر قرآن اس سوال کا جواب نہ دیتا تو ہم صحیح جواب سے محروم رہ جاتے اور ہماری زندگی تاریکیوں میں بھٹکتی رہتی، قرآن کا جواب یہ ہے کہ دُنیا میں انسان کی حیثیت اللہ کے نائب کی ہے، انسان اس دُنیا میں اپنی من مانی کرنے کے لئے آزاد و خود مختار نہیں ہے، نائب کا کام یہ ہے کہ وہ اس اقتدار اعلیٰ کے قوانین و مرضیات کی پیروی کرے جس نے اس کو اپنا نائب بنایا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اللہ کا باغی شمار ہوگا (۲) انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اسے دُنیا میں کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب انسان بطور خود دے ہی نہیں سکتا اس لئے کہ انسان مخلوق ہے اور کوئی مخلوق بطور خود یہ نہیں جان سکتی کہ اسے کس لئے پیدا کیا گیا ہے، یہ بات صرف خالق جانتا ہے کہ اس نے کوئی مخلوق کس مقصد اور کس کام کے لئے پیدا کی ہے۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کی بندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کا خالق فرماتا ہے:- وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ (ذاریات) میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔) انسان کیا بندگی کرے اور کس طرح کرے؟ اس کا جواب خود قرآن ہے، اللہ نے یہ کتاب یہ بتانے ہی کے لئے نازل کی ہے کہ انسان کیا بندگی کرے اور کس طرح کرے۔ (۳) قرآن میں پیغمبروں اور ان کے ماننے والوں کو صریح حکم دیا گیا ہے کہ وہ دین کو قائم کریں اور قائم رکھیں، انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد ہی اقامت دین ہے (۴) قرآن صراحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ اللہ نے اپنے آخری رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا تھا کہ اس کو تمام باطل ادیان پر غالب کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دین باطل مغلوب نہ ہو، دین حق کی اقامت کا فریضہ مکمل نہیں ہو سکتا، لہٰذا اقامت دین کے لئے اظہار دین ایک ضروری اور لازمی چیز ہے دین حق کے غالب اور دین باطل کے مغلوب ہونے کی معقولیت خود ان کی صفت حق و باطل سے واضح ہے اگر کوئی دین حق ہے تو وہی اس کا مستحق ہے کہ نافذ اور غالب ہو اور اگر کوئی دین باطل ہے تو اس کا باطل ہونا ہی اس کا مقتضی ہے کہ اسے مٹ جانا چاہیے یا کم سے کم مغلوب ہو کر رہنا چاہیے (۵) قرآن کا مجموعۂ احکام انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہے۔ اس میں صرف نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی کے احکام نہیں ہیں بلکہ معاشرت، معیشت اور سیاست کے احکام بھی ہیں، شخصی مسائل سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک کے بارے میں اس کے اندر ہدایتیں

اور احکام موجود ہیں (۶) قرآن انسانوں کے باہمی اختلافات و مقدمات کے فیصلے کے لیے سپریم کورٹ ہے۔ یہ کتاب کا سٹ
ساورن (مقتدر اعلیٰ) کی وہ عدالت ہے جس سے اونچی اس زمین پر کوئی عدالت موجود نہیں ہے۔

آخرت، امتحان و آزمائش کے پیریڈ کے اختتام، اور ایک نئے، ابدی اور لازوال پیریڈ کے افتتاح کا نام ہے۔ وہ انسانی زندگی کا آخری انجام ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ کے لیے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ یہ سارا ہنگامۂ وجود انسان کی آزمائش کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ یہ ایک عارضی دور ہے جب یہ دور پورا ہو جائے گا تو اسے توڑ پھوڑ دیا جائے گا اور قیامت کا ہولناک دن آ جائے گا، میدان حشر میں تمام انسان اپنی اسی روح اور جسم کے ساتھ جو وہ دنیا میں رکھتے تھے خدا کے سامنے حاضر کئے جائیں گے اور ان سب کی زندگی کا محاسبہ ہوگا۔ اس آخری محاسبے کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار انسان کے اپنے عقیدہ و عمل پر ہوگا۔ وہاں نجات نہ خریدی جا سکے گی اور نہ کسی ایسی شفاعت کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کے زور سے نجات حاصل کی جا سکے۔ اللہ تعالیٰ تمام فیصلے اپنے ذاتی علم کی بنا پر کرے گا، شفاعت کی حیثیت، شفاعت کرنے والے کی عزت افزائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی لیے ہر شفاعت اللہ کے اذن پر موقوف ہوگی، بلا اذن کسی کو لب کھولنے کی مجال بھی نہ ہوگی، مشرکوں اور اہل کتاب نے شفاعت کے عقیدے کو بگاڑ ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے عملی لحاظ سے محاسبۂ آخرت کا عقیدہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے اور وہ خدا کی نافرمانی پر دلیر ہو گئے ہیں، افسوس یہ ہے کہ آج بہت سے مسلمانوں نے بھی شفاعت کا وہی تصور اپنا لیا ہے جو اہل کتاب کا ہے، اور جس کی تردید متعدد مقامات پر قرآن نے کی ہے۔ اسی آخری محاسبے کے بعد جنتی جنت میں جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں اور آخرت کا وہ دور شروع ہوگا جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ قرآن اور صحیح احادیث نے ہمیں آخرت کا جو عقیدہ سکھایا ہے اس سے تناسخ کی بھی نفی ہوتی ہے اور اہل کتاب کے تصور کی تردید بھی۔ قرآن نے بیسیوں مقامات پر محاسبۂ قیامت اور آخرت کی جزا و سزا کا نقشہ کھینچا ہے۔ میں ذیل میں صرف سورۂ الزمر کی آخری چند آیتوں کا ترجمہ دے رہا ہوں۔

زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی کتاب اعمال لا کر رکھ دی جائے گی۔ انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے۔ لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

(جناب ڈاکٹر عبدالحق انصاری)

یہ مضامین "مقصد زندگی کا اسلامی تصور" کے وسیع عنوان کے اجزا ہیں جن میں کا ہر جز اپنی جگہ خود ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے ہم اس کو مستقل عنوانات کے تحت شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

اسلامی نظریہ زندگی کا چوتھا اہم تصور تزکیۂ نفس ہے۔ قرآن مجید میں مختلف اعمال کا مقصود اور حاصل نفس کا تزکیہ قرار دیا گیا ہے

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (توبہ ۱۰۳)	اے نبی! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لیکر انھیں پاک کرو اور ان کی نیکوکاری کو ترقی دو اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو۔
وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (اللیل ۱۸)	اور اس آگ سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہوا اور جو اپنا مال اپنے تزکیہ کی غرض سے دے۔
قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○ (نور۔ ۳۰)	اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔
فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَا اَحَدًا	پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو

فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝ (نور - ۲۸)

جب تک کہ اجازت نہ دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى وَأَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَآتِينَ الزَّكٰوةَ وَأَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (احزاب ۳۲-۳۳)

نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔

آخرت کی کامیابی اور دنیا کی حقیقی سعادت کو تزکیہ سے وابستہ کیا گیا ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس ۹-۱۰)

کامیاب ہے وہ جس نے اس (نفس) کا تزکیہ کیا اور خائب و خاسر ہے وہ جس نے اس کو گناہوں سے دبا دیا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (اعلیٰ ۱۴)

کامیاب ہے وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی

وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَأُولٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا ذٰلِكَ

اور جو خدا کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا جس نے نیک عمل کیے ہوں گے ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں۔ سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی ان میں

جَزَاؤُا مَنْ تَزَكّٰى　　وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اس شخص کی جو
(طٰہٰ ۷۶)　　پاکیزگی اختیار کرے۔

انبیاء کرام نے اپنی قوموں کو تزکیۂ نفس کی دعوت دی ہے۔

اِذْ نَادَاهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ	جب موسےؑ کو اس کے رب نے طوی کے
طُوًى اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ	پاک میدان میں ندا دی۔ فرعون کے پاس جا
طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى	وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ کیا تو پاکیزہ
وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى	زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے اور میں تجھے تیرے
(نازعات: ۱۶-۱۹)	رب کا راستہ بتاتا ہوں تو کیا تو اس سے ڈریگا
عَبَسَ وَتَوَلّٰۤى اَنْ جَآءَهُ	نبی چیں بجبیں ہو گیا اور منہ پھیر لیا جب اس
الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى	کے پاس اندھا آدمی آیا اور اے نبی تمہیں کیا
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اَمَّا	معلوم کہ وہ سنور جاتا یا بات اس کے دل میں
مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى	اتر جاتی اور اس سے اس کو فائدہ پہنچتا۔ مگر جس
وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ	نے لاپروائی برتی تو اس کی فکر میں پڑا ہے۔
(عبس: ۱-۷)	حالانکہ اگر وہ نہیں سدھرتا تو تجھ پر کیا الزام ہے

حضرت ابراہیمؑ نے جب اہل عرب میں ایک نبی بھیجے جانے کی دعا فرمائی تو اس کی بعثت کی غرض و غایت اہل عرب کا تزکیہ قرار دیا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا	اور اے ہمارے رب ان لوگوں میں خود
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ	انہیں کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انہیں
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ	تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝	تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے تو بڑا
(بقرہ - ۱۲۹)	مقتدر اور حکیم ہے۔

اور جب اللہ تعالےٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا تو آپ کے مقاصد بعثت میں تزکیہ بھی شامل کیا

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ　　وہی خدا ہے جس نے عرب کے ان پڑھوں میں

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ	انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	آیات سنائے، اور ان کا تزکیہ کرے اور انہیں
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ	کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ درحقیقت وہ
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ	اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ
مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ	نبی ان کے لیے ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ [1]	نبی ہے جو ہنوز ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے۔
(جمعہ ۲-۳)	اور اللہ بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

تزکیہ کی لغوی تحقیق تزکیہ کی اصل زکا ہے جس کے معنے نمو شادابی بڑھوتری اور افزونی کے ہیں۔ الزکاء النماء والریع زکاء نمو اور شادابی کو کہتے ہیں۔ زکا الزرع یزکو زکاء فصل بڑھی ہری بھری اور شاداب ہوئی۔ اَزکاہ اللہ اللہ تعالیٰ نے فصل کو بڑھایا۔ ترو تازہ اور شاداب بنایا۔ الزکاء النماء والزیادۃ زکاء نمو اور بڑھوتری کو کہتے ہیں۔ وکل شیئ یزداد وینمی فھو یزکو زکاء ہر چیز کے بڑھنے اور نمو پانے کے لیے زکاء کا فعل آتا ہے۔ حضرت علی کا قول ہے المال ینقصہ النفقۃ والعلم یزکوا علی الانفاق مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ زکا وزکی الرجل یزکوا اذا صلح جب زکا یا زکی کا فعل انسان کے لیے آتا ہے تو اس کے معنے انسان کے صالح ہونے کے آتے ہیں۔ رجل تقی زکی صالح اور پرہیزگار آدمی۔

کسی چیز کے نمو اور افزونی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسے آفتوں سے بچایا جائے اور خرابیوں اور نقائص سے پاک کیا جائے۔ اس لیے زکاء میں طہارت کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے۔ غلام زکی اس لڑکے کو کہتے ہیں جو قوی تندرست دانا اور صالح ہو۔ اور جسمانی، ذہنی اور اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو۔ زکوٰۃ کو زکوٰۃ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے مال پاک ہوتا، بڑھتا اور ترقی پاتا ہے۔ لانہ تطھیر للمال وتثمیر واصلاح ونماء۔ تزکیہ کے معنے بڑھانا، پروان چڑھانا، تکمیل کرنا، صالح بنانا، کدورت، خرابی اور برائی سے پاک کرنا ہے [2]

[1] محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے یہ مقاصد سورۂ آل عمران ۱۶۴ اور سورۂ بقرہ ۱۵۱ میں بھی انہیں الفاظ میں دہرائے گئے ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو لسان العرب مادہ زکاء المخصص لابن سیدہ ۱۳: ۹م

قرآن مجید میں تزکیہ کا لفظ تطہیر کے ساتھ آیا ہے، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تزکیہ اصلاً بڑھانے، پروان چڑھانے اور ترقی دینے کو کہتے ہیں۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً	اے نبی تم ان کے اموال میں سے صدقہ
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا	لے کر انہیں پاک کرو اور ان کی زندگیوں کو سنوارو
توبہ: ۱۰۳	اور پروان چڑھاؤ۔

ایک دوسری آیت میں تزکیہ کا لفظ تدسیہ کے مقابل میں آیا ہے۔ تدسیہ کے معنے ہیں کسی چیز کو ڈھک دینا، گھٹانا، بگاڑنا اور حقیر کرنا[1] اس اعتبار سے علامہ ابن قیم نے تزکیہ کے معنے کسی چیز کو ظاہر کرنا، اس کی قوتوں کو بڑھانا اور ترقی دینا، اس کو بلند کرنا اور باعزت بنانا لکھا ہے[2]

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ	کامیاب ہے وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا
خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (الشمس۔ ۹-۱۰)	اور ناکام ہے وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

علامہ زمخشری نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے:۔

التزكية الانماء والاعلاء	تزکیہ تقویٰ کے ذریعہ ترقی دینے اور عزت
بالتقوى	بخشنے کو کہتے ہیں
والتدسية النقص والاخفاء	اور تدسیہ فسق و فجور کے ذریعہ گھٹانا اور
بالفجور[3]	چھپانا ہے

امام ابن تیمیہ نے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ کی تفسیر میں لکھا ہے:۔

التزكي هو التطهر والتبرك	تزکیہ کے معنے پاک ہونے اور ترقی پانے
بترك السيئات الموجب زكاة النفس	کے ہیں۔ برائیوں کو ترک کرنے کی وجہ سے جن کے
كما قال "قد افلح من زكاها" ولهذا	نتیجہ میں نفس میں بڑھوتری اور افزونی ہوتی ہے
تفسر الزكوة تارة بالنماء و	جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کامیاب ہے وہ جس نے
الزيادة وتارة بالنظافة والاماطة	نفس کو سنوارا۔ اس لیے زکوٰۃ کے معنے کبھی بڑھوتری

[1] لسان العرب ۔ ۲ ۔ ص ۳۸۵ [2] تفسیر ابن قیم ص ۵۱۱، ۵۱۲

[3] کشاف: ۲: ۷۴۵

والتحقیق ان الزکوٰۃ تجمع بین	اور افزونی بیان ہوتے ہیں اور کبھی پاکیزگی اور
الامرین ازالۃ الشر و زیادۃ الخیر	عبادت۔ مگر حق بات یہ ہے کہ زکوٰۃ دونوں
وھذا ھو العمل الصالح	مفہوم کو جامع ہے۔ شر کا ازالہ بھی اور خیر میں
وھو الاحسان	اضافہ بھی اور یہی عمل صالح ہے اور یہی احسان ہے[1]

اسلامی تزکیۂ نفس ان تشریحات کی روشنی میں قرآن کے تزکیۂ نفس کے تصور میں چند چیزیں لوٹ کرنے کی ہیں۔

۱۔ تزکیہ کے اصل معنے پروان چڑھانا اور ترقی دینا ہے۔ تزکیۂ نفس انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنے بڑھانے، سنوارنے اور تکمیل کو پہنچانے سے عبارت ہے۔ روح و جسم، دل و دماغ سیرت و کردار کی وہ ساری خوبیاں جن سے زندگی کی تکمیل ہوتی ہے ان کی تحصیل کی ہر صحیح کوشش تزکیۂ نفس کی کوشش ہے۔

۲۔ زندگی کو سنوارنے کے معنے اس کو برائیوں سے پاک کرنا بھی ہے۔ اس کے بغیر زندگی کی تہذیب ترقی بے معنے ہے۔ عمل کے اعتبار سے بھی برائیوں کا ازالہ خوبیوں کی تحصیل پر مقدم ہے۔ تطہیر یا اصلاح تزکیہ و تکمیل کا ابتدائی قدم ہے۔ ان ہی وجوہ سے بعض اوقات تزکیہ کو تطہیر و تہذیب کے مرادف قرار دیا جاتا ہے۔ اگر تزکیہ کا حقیقی اور مکمل مفہوم پیش نظر رہے تو اس بات سے کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہوگی لیکن اگر یہ مفہوم واضح نہ ہو تو اسلام کے تصور تزکیہ کے مسخ ہو جانے کا بہت اندیشہ ہے۔

یہ اندیشہ اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب کہ تزکیۂ نفس میں نفس سے مراد انسان کی پوری ذات (self) نہ لی جائے بلکہ صرف وہ شر پسند جزء مراد ہو جسے کبھی نفس امارہ کہا جاتا ہے اور اکثر محض نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ درآں حالیکہ قرآن مجید کی آیت وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا میں نفس انسان کی پوری ذات کے لیے آیا ہے نہ کہ صرف اس کے شر پسند جزء کے لیے۔ ورنہ پھر اس نفس کے تسویہ (تہذیب و تکمیل) اور اس پر شر کے ساتھ خیر کے الہام اور اس کی تطہیر کے ساتھ تکمیل کے کوئی معنے نہیں ہوتے۔ اس آیت کے علاوہ جہاں تزکیہ قرآن مجید میں آیا ہے وہاں منقول نفس نہیں ہے بلکہ کوئی ضمیر ہے۔ مثلاً خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ

[1] تفسیر ابن تیمیہ۔ ۱۱۳

بہا اور اکثر آیتوں میں تزکی کا فعل لازم استعمال ہوا ہے۔ جیسے قَدْ اَفْلَحَ مَن تَزَكّٰى، اور قُلْ هَلْ لَكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ان ساری آیتوں میں انسان کے پورے وجود کا تزکیہ تطہیر و اصلاح تعمیر ترقی مراد ہے۔

۳۔ تزکیہ نفس کا قرآنی تصور تکمیل ذات (SELF PERFECTION) کا تصور ہے۔ اس تصور کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ انسان جسم و روح، دل و دماغ کی قوتوں کی ایک مثالی وحدت ہے خدا نے انسان کو بہترین نقشہ پر پیدا کیا ہے اور اس کی گوناگوں صلاحیتوں اور رجحانات میں اعلیٰ درجہ کا توازن رکھا ہے۔ یہ متوازن اور ہم آہنگ وجود روح اور مادہ، عقل و دل، ظاہر و باطن کے تضاد اور تناقض سے آشنا نہیں ہے۔ ان کے درمیان اہمیت اور درجہ کا فرق ضرور ہے لیکن ان میں کوئی ازلی و ابدی تناقض کوئی لاینحل تضاد نہیں ہے۔ ایک کی ترقی کے لیے دوسرے کا ازالہ یا تدسیہ (SUPPRESSION) ضروری نہیں ہے، بلکہ ایک کی تکمیل دوسرے کی ترقی کی ضامن ہے۔

دوسری بنیاد یہ ہے کہ انسان کے پورے وجود کی ترقی اور تکمیل مطلوب ہے۔ اس وجود کا ہر جزو فی نفسہ قیمتی ہے اور اس کی تہذیب و اصلاح تعمیر و ترقی فی نفسہ مطلوب ہے۔ جسمانی ترقی، اخلاقی بلندی، روحانی تکمیل سبھی اپنے اپنے حدود میں مطلوب و مقصود ہیں۔ اسلامی تزکیہ نفس علم و فکر، قلب و ضمیر، اخلاق و سیرت، ذوق جمال اور جسم و جان کے سارے تقاضوں کے متناسب اور متوازن تہذیب تکمیل کا نام ہے۔

تکمیل ذات کا اسلامی تصور دوسرے تصورات سے دو اہم امور میں ممتاز ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اسلام کی تکمیل ذات اسلامی شریعت کے حدود کے اندر اور کتاب و سنت کی رہنمائی میں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تکمیل ذات کی ساری جدوجہد خدا کی خوشنودی کی طلب اور اس کی مخلصانہ رضاجوئی کے جذبے کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسلام کا تزکیہ نفس خدا کی صفات کے گہرے شعور اور زندہ ادراک کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

۴۔ قرآن و سنت کی نظر میں فرد کی اصلاح، تعمیر و تکمیل معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کے نہ مخالف ہے اور نہ اس سے بے نیاز۔ تکمیل ذات کے لیے اصلاح و تعمیر معاشرہ کی سعی او ر انتہائی سرگرم جدوجہد ناگزیر ہے۔ افراد کی اکثریت کی اصلاح و تکمیل معاشرہ کی اصلاح و تہذیب پر موقوف ہے اور اس کے بغیر ممکن نہیں

اگر محدود پیمانہ پر وقتی طور پر کچھ ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتی۔ غیر معمولی صلاحیت کے افراد کی تکمیل معاشرہ کی اصلاح پر موقوف نہیں ہوتی لیکن اس کی اصلاح کی کوشش کے بغیر ان کی بھی تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔ اسلامی نقطہ نظر سے تکمیل ذات کی جدوجہد بیک وقت تعمیر معاشرہ کی جدوجہد ہے۔ اور اصلاح معاشرہ کی کوشش اگر صحیح نیت و جذبہ کے ساتھ ہو تو تکمیل ذات کی کوشش ہے۔

تکمیل ذات اور تعمیر معاشرہ دونوں کوششوں کو ایک کرنے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ تکمیل ذات کی ہر سعی اجتماعی ہوتی ہے انفرادی ہوتی ہی نہیں۔ یقیناً تزکیہ نفس اور تکمیل ذات کا ایک جزا اور بہت اہم جز خالصتہً انفرادی ہے لیکن "تنہا یہ جز کافی نہیں ہے۔ اس پر قناعت کرکے دوسرے اجزا سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا۔ تکمیل ذات کا اسلامی طریقہ کار انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ دونوں ناگزیر ہیں۔ کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ کسی ایک کے اندر کمی سے تکمیل ذات بھی ناقص رہ جاتی ہے اور تعمیر معاشرہ بھی نامکمل رہ جاتی ہے۔

محمد نجات اللہ صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تحفظِ ملت کا مسئلہ

یہ مقالہ، فاضل مقالہ نگار کے گہرے غور و فکر اور حالات کے سنجیدہ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ قارئین زندگی اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور تجزیہ حالات اور تدابیر پر غور بھی کریں گے۔ (ادارہ)

ہندوستان کے مسلمان ایک نازک صورت حال سے دوچار ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس صورت حال کو اچھی طرح سمجھ کر اصلاح حال کی ممکن تدبیروں پر غور کیا جائے اور ہم اپنے لیے کوئی ایسا لائحۂ عمل مرتب کریں جو ایک طرف ملت اسلامیہ کے شایانِ شان ہو۔ دوسری طرف اس میں حالات کی پوری رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے ان تمام ذرائع و وسائل سے پورا کام لینے کا اہتمام ہو جن سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔

جائزہ

اس نازک صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ لینے کے بجائے میں اس کے صرف اہم ترین پہلو پر سوچنے کی دعوت دوں گا، یعنی یہ حقیقت کہ ملک کی ہندو اکثریت کے بعض عناصر اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیں۔ ان کی تہذیبی انفرادیت کو ختم کرنا اور مادی طور پر انھیں پامال کر دینا ان کا منصوبہ قرار پا چکا ہے۔ پورے ملک میں، بالخصوص ان شہروں اور قصبوں میں جہاں مسلمان معتدبہ تعداد میں اس طرح رہتے ہیں کہ ان کی تہذیبی انفرادیت نمایاں رہتی ہے اور گرد و پیش کے دیہی علاقوں کے مسلمانوں کے لیے تہذیبی رہنمائی فراہم کرتی ہے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر پے در پے جارحانہ حملے اس منصوبے کا اہم ترین جز ہیں۔ خیال یہ ہے کہ مسلسل ضربوں کے نتیجہ میں کچھ لوگ ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے، کچھ لوگ اپنی تہذیبی انفرادیت سے دستبردار ہو کر اکثریت میں ضم ہو جائیں گے، اور باقی لوگوں کو مادی طور پر اتنا صدمہ پہنچے گا کہ وہ

آئندہ عرصہ تک معاشرہ میں کوئی فعال کردار نہ ادا کرسکیں گے۔ مرکزی مقامات پر جب ایسے اثرات مرتب ہوں گے تو گرد وپیش کی مسلمان آبادیاں بھی اس کا اثر قبول کریں گی اور بالآخر پوری مسلمان قوم کے حوصلے پست ہوجائیں گے، ہمتیں چھوٹ جائیں گی اور آئندہ وہ اس ملک میں جان بچا کر ہوزی کماتے رہنے سے آگے کچھ سوچنے کی جرأت نہ کرسکیں گے۔

مسلمانوں پر جارحانہ حملوں کے پہلو بہ پہلو یہ عناصر اس بات کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاں جس حد تک ممکن ہو ابتدائی تعلیم کے جبری نصاب کے ذریعے مسلمانوں کی آئندہ نسل کو تہذیبی طور پر ہندو بنانے کا اہتمام کیا جائے۔ مرکزی حکومت پر زور ڈالا جائے کہ ان کے پرسنل لا کو تبدیل کرکے ان کی معاشرت کی بنیادی اینٹ یعنی خاندان کو اس کی تہذیبی انفرادیت اور قانونی تحفظات سے محروم کردیا جائے۔ ان کے اوقاف کا جوان کے آزاد دینی اور ثقافتی اداروں کے لیے مالی وسائل فراہم کرتے ہیں آئندہ ایسا بندوبست کیا جائے کہ ایسے اداروں کو امداد ملتا کم ہو، جو مدد ملے وہ ایسی شرائط اور پابندیوں کے تحت ملے جو ان کے تہذیبی کردار کو بدل سکے، اور ان کی آمدنی سے آزاد دینی عناصر کو سہارا ملنے کے بجائے مسلم سماج میں ہندو بالاتری کے ایسے ایجنٹوں کو سہارا ملے جو اس سماج کو اندر سے تبدیل کرنے کا کام انجام دیں۔ ساتھ ہی ان عناصر کی پوری کوشش یہ بھی ہے کہ اردو زبان کو نظام تعلیم اور نظم ونسق میں کوئی ایسا مقام نہ ملے جس سے اس کو تقویت حاصل ہو تاکہ دوسری طرح کے دباؤ بالآخر اس زبان کا رواج کم کرنے اور مسلمانوں کو اس زبان سے محروم کردینے میں کامیاب ہوجائیں اور اس وسیع دینی، تہذیبی اور قومی "لٹریچر" سے مسلمانوں کی اگلی نسل کا تعلق منقطع ہوجائے جو اردو زبان میں موجود ہے۔

کوئی انصاف پسند ہندوستانی جو آزادی کے بعد کے اکیس برسوں کے حالات کا بالعموم اور گزشتہ چند برسوں کا خاص طور پر جائزہ لے گا، اس حقیقت سے انکار نہ کرسکے گا کہ ہندوستان میں بعض ہندو تنظیمیں، گروہ اور افراد ضرور موجود ہیں جو واضح طور پر وہ فیصلہ کرچکے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں، مجموعی ہندو آبادی میں ان کا تناسب کیا ہے اور ان کی طاقت کا کیا اندازہ ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے، مگر خود اس حقیقت سے سارے مسلمانوں، ملک کی متعدد سیاسی جماعتوں، اور بعض ممتاز ہندو لیڈروں کو اتفاق ہے۔ اس سے صرف نظر کرنا، ملک کو بڑی

سے بچانے کے لیے اس پر پردہ ڈالنا یا اس کی سطحی تاویلیں کرنا بہت غلط اور نقصان دہ ہوگا۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے اب اس کی کوئی گنجائش نہیں کیوں کہ تعداد، وسائل، قوت اور نفوذ و رسوخ کے اعتبار سے یہ عناصر نہ صرف قابل لحاظ بلکہ خطرناک حد تک طاقتور ہو چکے ہیں اور اندیشہ ہے کہ ان کی قوت فیصلہ کن نہ بن جائے۔ یعنی قطعِ نظر اس سے کہ ہندو اکثریت میں ایسے عناصر کا واقعی تناسب کیا ہے انہی عناصر کا ارادہ ـــــ عمل و اظہار کے اعتبار سے ـــــ پوری ہندو اکثریت کا ارادہ نہ بن جائے ابھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ اور ملک کی ہندو اکثریت پوری طرح ان عناصر کے ساتھ نہیں ہے، لیکن ایسا ہونے کا اندیشہ ضرور ہے، اور یہ اندیشہ قوی ہے۔

یہ بات شبہہ سے بالاتر ہے کہ آر ایس ایس مذکورہ بالا خطرناک عزائم کی حامل ہے اور جن عناصر کی ہم نشان دہی کر رہے ہیں ان کی قیادت اسی کے ہاتھوں میں ہے۔ جن سنگھ فی الجملہ اس ارادہ میں آر ایس ایس کے ساتھ ہے۔ کانگریس کے متوسلین میں اگر بھاری اکثریت نہیں تو معتد بہ تعداد اس ذہن کی حامل ہے۔ ایس ایس پی اور پی ایس پی کا یہی حال ہے۔ مختلف علاقوں میں جو سینائیں قائم ہیں ان کا اصل رخ کچھ بھی ہو وہ اس جذبہ سے خالی نہیں، بالخصوص شیوسینا اس سلسلہ میں کافی آگے معلوم ہوتی ہے۔ جنوبی ہند کی بعض طاقتور سیاسی تنظیموں میں کبھی کبھی یہ رجحان جھلکتا ہے۔ ان تنظیموں اور ایس ایس پی پی اس پی، کانگریس، سوتنتر وغیرہ کے پیروؤں کی غالب اکثریت نے اگر اس ارادہ کو شعوری طور پر پوری قوت کے ساتھ نہیں اپنایا ہے تو وہ اس کی مخالفت کا عزم بھی نہیں رکھتیں۔ زیادہ تر اس لیے کہ وہ اس کام کے ہونے کو برا نہیں سمجھتیں اور کسی حد تک اس لیے کہ کوئی سیاسی جماعت اس طاقتور رجحان کی مؤثر مخالفت کا بیڑا اٹھا کر اپنے سیاسی مفادات کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ اکثر سیاسی جماعتوں میں ایک عنصر ضرور ایسا ہے جو دل و جان سے مسلم کشی کے اس رجحان کا مخالف ہے، اور اس خطرناک ارادہ کو ناکام دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر یہ عنصر کمزور بھی ہے اور کم ہمت بھی۔ اس میں عدل و انصاف اور صداقت نیز ہندوستان کے حقیقی مفاد کی خاطر اس مہلک رجحان کے خلاف سرفروشانہ اٹھ کھڑے ہونے اور بانی قوم سے جھگڑا مول لینے کا حوصلہ نہیں۔ کم از کم اب تک یہ حوصلہ اتنا جاندار نہیں بن سکا ہے کہ کوئی عملی نتیجہ دکھا سکے اور کسی درجہ میں ان رجحانات کو دبا سکے۔

ابھی تک ہم نے کمیونسٹ پارٹیوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم انہیں ان

ارادہ سے بری یا اس کا مخالف سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جہاں تک کمیونسٹ پارٹیوں کے پیرو عام ہندوؤں کا تعلق ہے وہ اس مخصوص معاملہ میں اپنے مرکزی لیڈروں کی پیروی کا کوئی زبردست داعیہ نہیں محسوس کرتے۔ ہندوستان کی غالب اکثریت کی طرح ان کی زندگی بھی خانوں میں بٹی ہوئی ہے زندگی کے جس خانہ میں وہ کمیونسٹ ہیں وہ انھیں اپنی زندگی کے اس خانہ سے بے تعلق نظر آتا ہے جس میں ان کے اندر مسلم دشمنی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ سیاسی اور طبقاتی کش مکش میں کمیونسٹ پارٹیوں کے ساتھ دائیں بازو کی جماعتوں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود وہ بھی مسلم دشمن رجحانات کا گہرا اثر قبول کر رہے ہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں پر جارحانہ حملوں کے ہنگامی اور بحرانی ادوار میں ان کے لیے عام ہندوؤں سے جداگانہ کوئی روش اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان پارٹیوں کی مرکزی لیڈر شپ اگر مسلم دشمنی کی طاقتور تحریکوں کی مخالف ہے تو زیادہ تر اس بنا پر کہ اس سے عارضی طور پر ان کے سیاسی مفادات مجروح ہو سکتے ہیں اور عوام کی توجہات ان امور سے ہٹ سکتی ہیں جن کی طرف توجہ دلا کر ہی وہ ان سے اپنا نظریہ منوا سکتے ہیں۔ لیکن وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو تہذیبی طور پر پامال کرنے کا منصوبہ کامیاب بھی ہو جائے تو اس سے یہاں کمیونسٹ انقلاب کے امکانات پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ ہر منفی تحریک کی طرح مسلم دشمن تحریکیں بھی اپنا مقصد پورا کر کے اپنی موت آپ مر جائیں گی اور وہ حالات و مسائل نہ صرف برقرار رہیں گے، بلکہ مزید شدت اختیار کر لیں گے جو کمیونسٹ انقلاب کے لیے اصل بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں

ہمارا خیال ہے کہ کچھ اسی طرح کے اندرونی احساسات کی وجہ سے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹیوں نے ابھی تک اس مسئلہ میں کوئی ٹھوس عملی قدم نہیں اٹھایا ہے اور نچلی عوامی سطح پر ہندو ذہنوں کو مسلم دشمنی کے رجحان سے پاک کرنے کی کوئی مؤثر مہم نہیں چلائی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ کبھی بھی ایسا نہ کر سکیں گی۔ البتہ ان کے عارضی مفادات انھیں پریس اور پلیٹ فارم سے ان رجحانات کی حامل تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کی مخالفت پر ضرور آمادہ رکھیں گے اور ہمیں اس مخالفت سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمارے لیے اس کا موقع اس لیے بھی ہے کہ کمیونسٹ پارٹیوں کو اب یہ اندیشہ بھی لاحق ہو رہا ہے کہ اگر فسطائی رجحانات رکھنے والی مسلم دشمن تنظیمیں بہت طاقتور ہو گئیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئیں تو ان کا دوسرا حملہ کمیونسٹ عناصر پر ہوگا۔ یہ ایک حقیقی خطرہ

ہے جس کا شعور ابھی کمیونسٹ پارٹی میں پوری طرح بیدار نہیں ہوا ہے، مگر جب یہ پوری طرح بیدار ہو گا تو یہ پارٹیاں خود اپنے بچاؤ کے لیے پوری قوت کے ساتھ ایسی تنظیموں کے خلاف صف آرا ہو سکتی ہیں مگر یہ کہنا دشوار ہے کہ اس صف آرائی کا طریقہ کیا ہو گا۔ کیا وہ مسلم دشمن تحریکوں کی جذباتی بنیادوں کو چیلنج کر کے عوامی سطح پر ذہنوں کو ان رجحانات سے پاک کرنے کی مہم چلائیں گی؟ کیا یہ طریقِ کار اختیار کرنے سے ان کو اپنی مقبولیت خطرے میں پڑتی نہیں نظر آئے گی؟ تو پھر کیا وہ ایسی تنظیموں کے سرمایہ دارانہ معاشی فکر کو اپنے نظریاتی حملہ کا ہدف بنائیں گی اور وقت آنے پر ان کا مقابلہ قوت اور تشدد کے ذریعے کریں گی؟ کیمونسٹ پارٹیوں کے مزاج اور طریقِ کار کا جو ناقص اندازہ ہمیں ہے اس کے پیشِ نظر ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلم دشمنی کے طاقتور رجحانات کو کھلم کھلا چیلنج کر سکیں گی۔ اسی وجہ سے ہمارا خیال یہ ہے کہ مسلمان ان رجحانات کو دبانے کے سلسلے میں کمیونسٹ پارٹیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کی اصل وابستگی صداقت اور عدل و انصاف سے نہیں اپنے انقلابی مفادات سے ہے، ان کا طریقِ کار واضح ہے، اور سرِ دست وہ اتنی طاقت بھی نہیں رکھتیں کہ ان رجحانات کو کامیابی کے ساتھ دبا سکیں، یا ان کی حامل تنظیموں کا زور توڑ دیں

اس جائزے کے خلاصے کے طور پر ذیل کے تین نکات سامنے رکھے جا سکتے ہیں۔

(۱) مسلمانوں کی تہذیبی انفرادیت کو ختم کرنے اور ان کو مادی طور پر پامال کر رکھنے کا منصوبہ اصلاً ہندو اکثریت کی ایک اقلیت کا منصوبہ ہے نہ کہ پوری اکثریت کا۔

(۲) یہ اقلیت بہت طاقتور اور فعال ہے اور پورے ہندو سماج میں زبردست اثر و نفوذ رکھتی ہے۔ کوئی سیاسی جماعت اس کے اثر سے پاک نہیں اگرچہ بعض پر اس کا اثر نسبتاً کم اور بعض پر زیادہ ہے۔

(۳) ہندو اکثریت میں ایک قابلِ لحاظ عنصر ایسا بھی ہے جو اس منصوبہ کو غلط، ظالمانہ اور ملک کے مجموعی مفاد کے لیے مہلک سمجھتا ہے اور اسے ناکام بنانا چاہتا ہے۔ یہ عنصر مختلف نسبتوں کے ساتھ جن سنگھ کے علاوہ تقریباً ہر سیاسی پارٹی میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ایسے ہندوؤں کی ایک بھاری تعداد بھی شامل ہے جو کسی سیاسی پارٹی میں سرگرمی کے ساتھ نہیں شریک ہے بلکہ انسانیت، اخلاق اور ہندو مذہب کی اچھی تعلیمات کو دوسری قدروں سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس صورتِ حال میں کرنا کیا چاہیے۔ میرے نزدیک اس کا جواب

یہ ہے کہ ایک طرف تو انہیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ ارادہ بدل جائے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندو مسلمانوں کی تہذیبی انفرادیت کو ختم کرنے اور ان کو مادی طور پر پامال کر دینے کا منصوبہ ترک کر دیں، تاکہ بالآخر یہ ارادہ ایک ایسی غیر موثر اور ناقابل لحاظ اقلیت کا ارادہ بن کر رہ جائے جسے اطمینان کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکے۔ دوسری طرف اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ جب تک اور جس حد تک یہ ارادہ کارفرما رہے اسے ناکام بنایا جائے اور پوری قوت سے اس کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی جائے۔ مذکورہ بالا تجزیہ سے ظاہر ہے کہ ان دونوں کوششوں میں مسلمان اکیلے نہیں ہوں گے، بلکہ ہندو اکثریت کے مذکورہ تیسرے گروہ کو اپنے ساتھ لے سکیں گے۔

جس طرح کی کلی جارحیت زیر غور ہے اس کے مقابلہ کے لیے ان دو تدابیر کے علاوہ کوئی تیسری تدبیر ممکن نہیں۔ آپ کو کسی خطرناک منصوبے کا نشانہ بنایا جا رہا ہو تو آپ یہی کر سکتے ہیں کہ اس کو بدلنے کی کوشش کریں اور اگر یہ نہ بدلے یا جب تک یہ نہ بدلے اس کا مقابلہ کر کے اسے ناکام بنانے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ کوئی راہ سوچی جا سکتی ہے تو صرف یہ کہ آپ ملک چھوڑ کر چلے جائیں ظاہر ہے کہ کچھ افراد تو ایسا کر سکتے ہیں مگر ہندوستان کے سارے مسلمان نہ ایسا کر سکتے ہیں، نہ ایسا کرنا ان کے شایان شان ہوگا، نہ —— ابھی تک —— ان کے لیے ایسا کرنا جائز ہوگا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اصل مسئلہ صرف مقابلہ کرنے کا ہے، ارادہ بدلنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ میں اس رائے کو غلط سمجھتا ہوں۔ یہ رائے غلط ہی نہیں گمراہ کن بھی ہے اور انسانیت پر عدم اعتماد کے ہم معنی ہے۔ پھر واقعہ یہ ہے کہ یہ رائے موجودہ صورت حال کے بہت غلط، مایوسانہ اور شکست خوردہ مطالعہ پر مبنی ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں مگر صورت واقعہ کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اصلاً مسلمانوں کو مٹا دینے کا ارادہ ہندوؤں کی ایک اقلیت کا ارادہ ہے۔ بھاری اکثریت ان کا ساتھ دیتی ہے۔ کبھی فعّال طریقے پر کبھی خواہی نہ خواہی اور اس ساتھ دینے کے اسباب تلاش کیجیے تو یہ نظر آئے گا کہ ایک طرف تو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں صدیوں سے رائج غلط فہمیاں ہیں، اور دوسری طرف فوری صورت حال کے بارے میں غلط خبریں اور غلط واقعات ہیں جو ان سادہ مزاج عوام کو جارحیت کا آلۂ کار بنا دیتی ہیں۔ اس صورت حال کی تبدیلی ممکن ہے۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

یہ جارحانہ ارادہ پیدا کیوں ہوا اور اسے آسانی کے ساتھ ہندوؤں میں قبول عام کیوں حاصل ہو جاتا ہے؟ اس سوال پر تفصیلی بحث اگرچہ بہت مفید ہوتی لیکن اس مختصر مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں البتہ یہاں اس پر غور و فکر کے نتیجہ کا بیان ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ صدیوں کے غیر ملکی حاکمیت دورِ حاضر کی تنگ نظر قوم پرستی، ماضی قریب کی قومی سیاسی کش مکش اور اس کے نتائج، اور اقوام عالم کی برادری میں ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی اجنبیت کا احساس وہ اہم عوامل ہیں جنہوں نے ہندوستان کی مسلمان اقلیت کی بجائے اکثریت کے ایک عنصر میں ایک زبردست "خوف" پیدا کر دیا ہے جو اسے یہ سمجھاتا ہے کہ ہندوستان کا وہ آن دیکھا مستقبل، جسے یہ عنصر ابھی خود معلوم و متعین نہیں کر سکا ہے، اس وقت تک نہیں تعمیر پا سکتا جب تک مسلم ملت کو ناکارہ و بے اثر بنا کر ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی بساط سے ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح کنارے نہ کر دیا جائے۔ میرے نزدیک جارحانہ ہندو قوم پرستی اور اس کا مسلم دشمن محاذ بنیادی طور پر اسی خوف کی پیداوار ہے۔

اصل علاج

اگر یہ رائے درست ہے۔ اور چونکہ ہم نے یہ رائے تفصیلی استدلال کے بغیر پیش کی ہے لہٰذا پڑھنے والے کو غور و فکر کے بعد خود ہی اس پر اطمینان حاصل کرنا ہوگا۔ تو اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہ جارحانہ مادہ اس وقت تک نہیں بدل سکتا جب تک یہ خوف دلوں سے نہ نکل جائے، اور اس خوف سے پیدا ہونے والی نفرت کی جگہ مسلمانوں کو بھی انسانی ہمدردی کا مستحق سمجھا جانے لگے۔

یہ خوف اس وقت تک دلوں سے نہیں نکل سکتا جب تک ہندو ملت اسلامیہ کو اس نظر سے دیکھنا نہ چھوڑ دیں جس نظر سے اب تک اسے دیکھا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ کچھ تو ملت اپنے اعمال و کردار کی کمزوریوں کے سبب خود بھی بدل گئی ہے، کچھ اسے غلط سمجھا اور سمجھایا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ خوف

تو اس سے زیادہ بری نظر آتی ہے جتنی بری وہ ہے، اور کچھ ان دیکھنے والوں نے ایسا غلط زاویۂ نگاہ اختیار کر رکھا ہے جس کی اصلاح کے بغیر انھیں ٹھیک دکھائی ہی نہیں دے سکتا۔ اصلاحِ حال کے لیے ان تینوں نکتوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ تاکہ مسلمانوں کو بین الاقوامی تعلقات رکھنے والی ایک حریف قوم جس کی دلچسپی اہلِ ہند کی فلاح و بہبود سے نہیں بلکہ اپنے ہم قوم لوگوں کی سیاسی بالاتری سے ہے، سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہونے والا خوف دور ہو اور ہندو انسانی زاویۂ نگاہ سے مسلمانوں کو انسانیت کی تعمیرِ نو کے ایک ایسے پروگرام کا علمبردار سمجھ سکیں جسے اختیار کرنے ہی میں ان کی فلاح و بہبود مضمر ہو۔

ہندوستان کے مسلمان آج وہ "ملتِ اسلامیہ" نہیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو منظور ہے۔ "ملتِ اسلامیہ" ایک ایسے مجموعہ افراد کا نام ہے جس کی اصل وفاداری صرف اللہ سے ہو، جو اپنی زندگی میں جہاں تک ممکن ہو، وہی طور طریقے اختیار کرے جو اسلام نے سکھلائے ہیں، اور اپنے کو ان اخلاقی، ذہنی، فکری اور جذباتی خرابیوں سے پاک رکھے جن کو اسلام نے برا قرار دیا ہے، جو خود اسلام پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ بڑے ذوق و شوق سے سارے بندگانِ خدا کو یہ سمجھانے کی کوشش میں لگے رہیں کہ زندگی کا صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے خدا کی مخلصانہ اطاعت کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ان کی عاقبت بھی خراب ہوگی اور دنیا میں بھی پریشان و تباہ حال رہیں گے، جو اس مشن کو اتنا عزیز رکھتی ہو کہ اپنے دنیوی مفادات کو ان کے آگے ہیچ جانے اور اپنے مشن کی کامیابی کے لیے ان مفادات کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے۔

آج مسلمانوں کی صورتِ حال کیا ہے، اس کی تفصیل بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ ہر ایک جانتا ہے کہ مسلمان اپنی اصل حیثیت سے بہت دور جا پڑا ہے۔ خدائے واحد کی بندگی کا شعور مدھم پڑتا جا رہا ہے اور دوسری لاتعداد وفاداریاں اس کی جگہ لے رہی ہیں۔ اسلام ہی کو اپنا طریقۂ زندگی بنانے کی جگہ مسلمان ہر اس طریقہ کو اختیار کر رہا ہے جو اسے اپنے محدود، عارضی، گروہی یا بسا اوقات شخصی مفاداتِ دنیا کے مطابق نظر آتا ہے۔ مسلمانوں نے بھی دوسری قوموں کی طرح خود کو ایک قوم سمجھ لیا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مسلمان گھرانے کا ہر فرد مسلمان ہے خواہ وہ خدا کا منکر ہو، آخرت کا مذاق اڑاتا ہو اور سلسلۂ وحی و رسالت کا بھی قائل نہ ہو۔ یا اس کی زندگی ہر اخلاقی عیب سے داغ داغ ہو، دنیوی مفادات سے آگے کوئی مقصد نہ ہو، نہ کسی مشن کا شعور نہ اس کی خاطر کوئی سرگرمی

اسلام کی تعلیمات سے عدم واقفیت عام ہے، اس سے عمل و زندگی کا تناسب حوصلہ شکن ہے، اور اس کی دعوت کا علمبردار ہونے کی کیفیت شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ ہمارا فکر شرک و جاہلیت سے متاثر ہے، ہم نے زندگی کو خانوں میں تقسیم کرکے ایک محدود خانہ کے سوا ساری زندگی غیر اللہ کی اطاعت کے لیے وقف کردی ہے۔ ہمارے معاشرے میں مذہب کے نام پر ہر طرح کی رسوم و خرافات رائج ہیں، اخلاق پست ہیں، جذباتی طور پر ابھی عصبیتوں کا دَور دورہ ہے جن میں جاہلیت شعار قومیں ڈوبی رہتی ہیں۔ جب ہم واقعۃً ایسے ہیں تو دیکھنے والوں کو اس سے مختلف کیوں کر نظر آسکتے ہیں؟

ہمیں خود کو بدلنا ہوگا اور ہم خود کو بدل سکتے ہیں۔ ہم سے زیادہ خراب حال معاشرے خود کو تبدیل کرچکے ہیں، ہمارے لیے ایسا کرنا کیوں ممکن نہ ہوگا؟ انسان شرک و جاہلیت کے گڑھے سے اٹھ کر خلافت راشدہ کی اوج کمال پر پہنچ سکتا ہے۔ ہم بگڑی ہوئی مسلمان امت اپنی اصلاح کرکے ملت اسلامیہ بن سکتے ہیں۔ خود اپنے ماضی میں بھی ہم بار بار سنبھلے ہیں، ایک بار پھر سنبھل سکتے ہیں۔

مزید ستم یہ ہے کہ ہندوؤں میں ہمارا تعارف اس سے زیادہ گھناؤنا اور بھیانک ہے۔ ہمارا ہی نہیں جس دین کے ہم علمبردار ہیں اس کی پاکیزہ صداقتوں پر بھی غلط فہمیوں اور گمراہ کن پروپیگنڈے کی کثافتیں تہہ در تہہ چڑھی ہوئی ہیں۔ یہ صدیوں کا غبار جب تک نہ ہٹایا جائے گا آئینہ کو تختہ سیاہ سمجھنے والے معذور ہیں۔ وہ اس چشمۂ صافی کو جس میں ان کے لیے حیات بخش تریاق ہے اس وقت تک گندے پانی کا نالا سمجھ کر پاٹ دینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ جب تک اس کے کوتاہ اندیش متولی اسے صاف کرکے سامنے نہ لائیں گے۔ یہ پروپیگنڈا انگریز اور ہندو نے بھی کیا ہے اور خود ہمارے اپنے افراد نے بھی۔ یہ غلط فہمیاں زبان و قلم سے بھی پھیلائی گئی ہیں مگر ان سے بڑھ کر اپنے انفرادی اور اجتماعی عمل سے ہم نے ہندوؤں کو اسلام کا ایک مسخ شدہ تاثر دیا ہے۔ صدیوں پر پھیلی ہوئی اس تکلیف دہ داستان کو دہرانے سے کیا حاصل؟ اس واقعہ کا ادراک کافی ہے کہ آج ایک عام ہندو اسلام کے بارے میں بہت غلط اور گھناؤنا تصور رکھتا ہے، اور چند مزید عوامل کی بنا پر مسلمانوں کے بارے میں اس کا تصور اور زیادہ خراب ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو کسی اصول حیات کا علمبردار سمجھنے کے بجائے ایک غیر قوم سمجھتے ہیں جسے تاریخ نے ان کے درمیان لا بسایا ہے۔ اسلام اس قوم اور ہندوستان کے باہر بسنے والی بعض قوموں کے درمیان ایک رشتہ کا کام کرتا ہے، اس کے علاوہ اسلام کی کوئی اور حیثیت ان کے سامنے نہیں ہے۔ مزید برآں کا فرد ملت کے سلسلے

میں اسلام کی تعلیم اسلامی تاریخ میں ان کے ساتھ سلوک، اور ان کے بارے میں موجودہ مسلمانوں کے ارادوں
...... کے بارے میں ان کے اندر انتہائی غلط باتیں عرصہ سے پھیلائی جاتی رہی ہیں جن کا کافی اثر ہے۔
یہ تصور بدل سکتا ہے اور یہ غلط فہمیاں دور ہوسکتی ہیں۔ گمراہ کن پروپیگنڈے کا فریب چاک کیا
جاسکتا ہے۔ زبان وقلم سے پھیلائی ہوئی باتوں کا اثر زبان وقلم سے دور کیا جاسکتا ہے۔ عملی خرابیوں کا برا
تاثر اصلاح یافتہ عمل کے اچھے تاثر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ ہمیں نتائج سے مایوس ہونے کا حق نہیں کیونکہ
اس بارے میں ہم نے اب تک کچھ نہیں کیا ہے۔ ہم نے اس ملک کے ہندوؤں سے براہ راست ربط قائم
کرکے انھیں یہ نہیں بتایا کہ اسلام کیا ہے، اور ہم کیا ہیں۔ اگر ہم اچھے مسلمان نہیں بن سکے ہیں تو اس کی ذمہ داری
ہم پر ہے یا اسلام پر؟ نیز یہ کہ ہم اب بندگیِ رب کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمارے
مخاطب کا حقیقی مفاد بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنے خدا سے تعلق پیدا کرے اور اس رشتے کو دوسرے تمام رشتوں
سے زیادہ قیمتی جانے۔ یہ شبہہ بے جا ہے کہ ہم یہ کام نہیں کرسکتے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ساڑھے چھ کروڑ انسان
اپنے پڑوس میں بسنے والے پچاس کروڑ انسانوں سے ربط نہ پیدا کرسکیں، اور ان کے درمیان ایک مفید
پُرمغز اور نتیجہ خیز مکالمہ نہ شروع ہوسکے۔ اس ربط وگفتگو کے امکانات بہت وسیع ہیں، اسی میں ہمارا اور
ہمارے پڑوسیوں کا بھلا ہے۔ پھر ہم اس پر مامور بھی ہیں۔ اس ربط وگفتگو سے یہ بات بھی واضح ہوسکے گی
کہ اسلام ہر انسان کے لیے آزادیِ ضمیر وعقیدہ کا بنیادی حق تسلیم کرتا ہے۔ مسلمان بھی اسی طرح سوچتے
ہیں اور ان کی تاریخ میں بھی اسی اصول پر عمل کیا جاتا رہا ہے۔

مسئلہ کا تیسرا پہلو خود ہندوؤں کے زاویہ نگاہ سے متعلق ہے۔ یہ زندگی کیا ہے، اس کا انجام
کیا ہوگا؟ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کے حقیقی مفادات کیا ہیں، نیز حیات وکائنات
کے صحیح تصورات کی روشنی میں انسان اور انسان کے درمیان رشتہ کیا ہونا چاہیے؟ ان فیصلہ کن
بنیادی سوالات کے سلسلے میں ہندو کا ذہن حقیقت سے دور چند در چند الجھاوؤں کا شکار رہا ہے۔
زندگی کے یہ بنیادی تصورات ہر چیز پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم تعلقات ہوں یا عالمی سیاست
میں ہندو زاویۂ نگاہ کی تعیین ...... ہر ایک پر ان کا گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ آپ ان غلط تصورات کو
بدلے بغیر اس معاندانہ زاویہ نگاہ کو نہیں بدل سکتے جس سے ہندو آپ کو دیکھتا ہے۔ ایک خلق خدا
اور انسانیت کے ایک مشترک مفاد کا تصور اپنائے بغیر 'ہندو قوم'، 'مسلم قوم' کو اپنا حریف ہی سمجھتا رہے گا

مذہب جس گروہ کا بھی ہوتا اسے ہمیشہ دشمن قرار دے کر جارحانہ عزائم کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ قدرتی
طور پر یہ حملہ اس مذہب پر بھی ہوتا ہے جو دوسرے ممالک سے ایک خطرناک رشتے کے علاوہ ان کی
نظر میں ان کے لیے کوئی اور اہمیت نہیں رکھتا۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ تجزیہ خیالی اور غیر واقعی معلوم ہو۔ ایسے لوگوں کو میں مثال کے طور پر
ایک بات پر غور کی دعوت دوں گا۔ جو آدمی مذہبی طور پر کسی سرزمین سے تعلق کو سب سے بڑی قدر کا حامل
سمجھتا ہو اور جذباتی طور پر اس سرزمین سے والہانہ وابستگی کو روحانیت سمجھتا ہو وہ سارے انسانوں
کو ایک نظر سے کیسے دیکھ سکتا ہے اور جو لوگ صدیوں پہلے ہی کیوں نہ باہر سے آکر اس زمین پر آباد ہوئے
ہوں اور اب بھی کسی دوسری سرزمین سے کسی نوع کا تعلق رکھتے ہوں ..... ان کو غیر سمجھے بغیر کیسے رہ
سکتا ہے۔ ایسے آدمی کے اس تصور کی اصلاح کے بغیر آپ اسے اخوت اور مساوات کے درس دے کر
اس کا عملی رویہ نہیں بدل سکتے۔ یہ ایک سرسری مثال ہے۔ آپ غور کریں تو ایسے بہت سے غلط تصورات
ملیں گے جو ہندوستان کی آبادی کے مختلف گروہوں میں گہری جڑیں رکھتے ہیں، جن کا تعلق ان بنیادی امور
سے ہے جن کی اوپر نشان دہی کی گئی ہے اور جو ان گروہوں کا طرز عمل متعین کرنے میں فیصلہ کن اہمیت کے
حامل ہیں۔ توحید صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں جسے اختیار کرنا نجات اخروی کے لیے ضروری ہو۔ یہی وہ
بنیادی تصور ہے جو اگر مفقود ہو تو شرک و جاہلیت کے مفسدانہ اثرات اس دنیا میں افراد اور گروہوں
کی پوری زندگی کو بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ آج ہندوستان کے مسلمانوں کو جو زخم لگ رہے ہیں وہ ان اثرات
سے غیر متعلق نہیں ہیں۔

یہ سوچنا درست نہ ہوگا کہ کروڑوں انسانوں کو جو صدیوں سے شرک و جاہلیت میں ڈھلے ہوئے ہیں
توحید کا درس دینا بڑا کٹھن کام ہے اور وہ بھی اس نازک گھڑی میں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ درس نازک گھڑیوں
ہی میں دیا جاتا اور بحرانی ادوار ہی میں قبول کیا جاتا رہا ہے۔ سکہ چلنے کی نارمل زندگی نے آج تک کسی
تہذیبی انقلاب کی بنیادیں نہیں فراہم کی ہیں۔ انسان فکری گردش اور جذباتی ہیجان کے زمانے میں ہی
عظیم فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ٹھنڈے ٹھنڈے
[illegible] ہندوستانی سماج کی موجودہ گرما گرمی کشاکش انتشار اور بحرانی کلمۂ توحید
دعوت اسلام کے لیے بہترین موقع ہے۔ ہماری کمزوری اور غلطی اس کام میں رکاوٹ نہیں ہونا [illegible]

[illegible] کمزوروں اور مظلوموں کی ہی ہے اور خلاف واقعات نے زعم میں مبتلا کر دیا ہے
[illegible] تبدیل کیا ہے۔

اوپر کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اگر اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور انفرادی سیرت و کردار نیز اجتماعی طرز عمل میں اسلام کا نمونہ بننے کے ساتھ بیان کے غیر مسلم عوام کو اسلام سے متعارف کرانے کی مہم لے کر اٹھ کھڑے ہوں تو ہندوؤں کی بڑی اکثریت کے دل و دماغ اس خوف سے پاک ہو جائیں گے جو ان کے اندر ان کی ایک شر پسند اقلیت غلط فہمیوں، مغالطوں اور خلاف واقعہ باتوں کے سہارے عرصہ سے پیدا کرتی رہی ہے۔ اسلام کا صحیح تعارف اور مسلمانوں کے ایک بے کردار تنگ نظر قوم کے بجائے جن کا اسلام غیر ممالک سے اس کے تعلق کی بنیاد بنا رہتا ہے۔ سارے انسانوں کے لیے ایک اچھے اور مفید طرز زندگی کے داعی اور انسانوں کے بہی خواہ خادموں کی حیثیت سے سامنے آنے سے ہندوؤں کی ایک معتد بہ تعداد میں ان کی جانب سے ہمدردی محبت اور قدر و منزلت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں جو آگے چل کر اتنے طاقت ور ہو سکتے ہیں کہ ہندوؤں کی ایک شر پسند اقلیت اگر اپنے مفسدانہ ارادوں پر قائم بھی رہے تو خیر پسند ہندو ان کا ہاتھ پکڑ سکیں اور انھیں دبا سکیں۔ یہی نہیں دل و دماغ کی اس تبدیلی سے آئندہ بہت سے روشن تر امکانات کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

فوری تدابیر لیکن اس کام میں وقت لگے گا اور مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو جارحانہ حملوں سے بچانا فوری طور پر بھی بہت اہم مسئلہ ہے، ان کی تہذیبی انفرادیت ختم کرنے والے اقدامات کو بھی محض آئندہ اصلاحِ حال کی امیدوں کے سہارے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خود ان امیدوں کا بر آنا اس ملت کے اسلام سے وابستہ رہنے اور اسلام سے وابستہ رکھنے پر منحصر ہے۔ اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا کوششوں کے پہلو بہ پہلو پوری قوت کے ساتھ ایسی تدابیر بھی اختیار کی جائیں جو جارحانہ ہندو قوم پرستی کے خطرناک مسلم دشمن ارادوں کو ناکام بنا سکیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم کام عام باشندگانِ ملک کو مسلمانوں پر کیے جانے والے منظم جارحانہ حملوں کے واقعات کی صحیح تفصیلات سے آگاہ کرنا ہے۔ ملک کا پریس، انگریزی پریس بالعموم اور علاقائی زبانوں کا پریس بالخصوص — اس بارے میں بہت غلط اور گمراہ کن رویہ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایک عام ہندو اخبارات پڑھ کر اور گفتگوئیں سن کر یہ سمجھتا ہی نہیں کہ اس کی قوم کے کچھ لوگ مسلمانوں کی جان و مال

اور عزت و آبرو پر دست درازیاں کر رہے ہیں بلکہ اکثر اسے یہ باور کرالیا جاتا ہے کہ مسلمان ہی جا کے ہیں جو بے گناہ ہندو آبادیوں پر چڑھ آتے ہیں یا ہندو شعائر کی بے حرمتی کر کے ہندو جذبات کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ جھوٹ کے اس سیلاب میں ایک عام آدمی کی حس عدل و انصاف ہی نہیں عقل عامہ بھی بند ہو جاتی ہے اور وہ اسی انداز پر سوچنے لگتا ہے جس انداز پر یہ گمراہ کن پروپیگنڈہ اسے سوچنے کی تربیت دینا چاہتا ہے۔ مگر اب بھی ہر بستی میں، ہر شعبۂ زندگی میں، ہر سیاسی پارٹی اور ہر طبقاتی گروہ میں بے شمار ایسے افراد ہیں جن کے سامنے اگر مسلمانوں پر مسلسل جارحانہ حملوں کے واقعات اپنی اصل تفصیلات کے ساتھ آتے رہیں تو ان کی انسانیت بے دار ہوگی، وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے اور انھیں منظم کیا جا سکے تو ٹھوس اقدام بھی کریں گے لیکن یہ امکان عمل کا جامہ اس لیے نہیں پہنتا کہ اب تک صحیح حالات کو ہر خاص و عام کے سامنے لانے کا اہتمام نہیں کیا جا سکا ہے۔ ہم نے حالات کا جو جائزہ لیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت انجام پا سکے گا جب ہم خود اس کا اہتمام کریں گے۔ بلاشبہ وسائل کی کمی بڑی رکاوٹ ہے اور ہم انگریزی اور علاقائی زبانوں میں ایسا متوازی پریس نہیں وجود میں لا سکتے جو موجودہ پروپیگنڈے کا بھرپور توڑ فراہم کر سکے۔ پھر بھی جو کچھ ہو سکے پریس کے سلسلے میں بھی کرنا چاہیے۔ نہ موجودہ پریس سے بالکل مایوس ہو جانا ٹھیک ہوگا، نہ یہ سوچنا کہ ہم چند اخبارات بھی نہیں نکال سکتے۔ مگر پریس کے علاوہ مختصر کتابچے شائع کرنا، وسیع پیمانہ پر تقریروں اور سر راہے گفتگوؤں کا اہتمام کرنا ایسے طریقے ہیں جن کو اختیار کرنے میں وسائل نہیں حائل ہیں بلکہ خود اعتمادی، ہمت اور امید کی کمی مانع رہے ہیں اس کام کی اہمیت سمجھنی اور سمجھانی چاہیے تاکہ مسلمانوں میں عام طور پر اور ان کی جماعتوں میں خاص طور پر اس کام کا حوصلہ اور اس کے نتائج کے بارے میں حسن ظن پیدا ہو، اور وہ اسے پوری قوت کے ساتھ انجام دینے لگیں۔

یہی طریقہ ہمیں مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم، پرسنل لا، اوقاف، اردو زبان وغیرہ ملی مسائل کے بارے میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔ عام ہندوؤں کو یہ سمجھانا چاہیے کہ مسئلہ کیا ہے، اس کے سلسلے میں حق و انصاف کا تقاضا کیا ہے، اور اس تقاضے کی تکمیل میں کسی کا کوئی نقصان نہیں۔ اکثریت کو اپنے مسائل سمجھائے بغیر ہم محض احتجاج یا ماتم کے ذریعے اپنے مسائل نہیں حل کر سکتے۔ مسئلہ کو ٹھیک طرح صحیح پس منظر میں سمجھائے بغیر ہم تنہا اسے حل نہیں کر سکتے ہیں۔ معقول باتیں خود اپنا وزن رکھتی ہیں، نیز یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ سارے ہندو

مذہبی ذہنیت رکھتے ہیں جو آر۔ایس ایس کے لیڈروں کی ہے۔

دوسرا کام جو ہمیں پوری قوت اور بڑی امیدوں کے ساتھ کرنا چاہیے وہ ان تمام ہندو لیڈروں سربرآوردہ افراد اور عوام سے ربط پیدا کرکے ان کا تعاون حاصل کرنا ہے جو مسلم دشمن تحریکوں کو غلط سمجھتے ہیں، مسلمانوں پر جارحانہ حملوں کو روکنا چاہتے ہیں اور ان کے ملی مسائل کے بارے میں انصاف کے قائل ہیں۔ اس ربط کے طریقے اور حاصل ہونے والے تعاون کے درجے مختلف ہوں گے۔ ہمیں ہر سطح پر تعاون کی قدر کرنا چاہیے اور جتنی مدد جہاں سے مل سکتی ہو حاصل کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ ہماری تہذیبی انفرادیت کے منکر ہوں گے مگر جان و مال کے تحفظ کو ضروری سمجھتے ہوں گے۔ ان سے اس سلسلے میں تعاون حاصل کیا جائے۔ جو لوگ مسلمانوں کی تہذیبی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوں مگر اس کے بارے میں ان کا تصور بہت محدود ہو ان سے اسی محدود تصور کی حد تک تعاون چاہا جائے۔ حالات کی نزاکت اور ہندو تعاون کی غیر معمولی اہمیت کا تقاضا ہے کہ جو ہندو جس حد تک بھی انتہا پسند مسلم دشمن رجحانات کے خلاف ہمارا ساتھ دے سکتا ہو اس کو ساتھ لیا جائے اور ہندو رائے عامہ کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے۔

آج اکثر مسلمان حکومت کے نظم و نسق کی جانب سے مایوس ہیں اور اپنی جان و مال کے تحفظ یا تہذیبی مسائل کے حل کے سلسلے میں کوئی امید وابستہ کرنا خام خیالی سمجھتے ہیں۔ ان کا تجربہ یہ ہے کہ مقامی حکام اور پولیس بلکہ بعض اوقات فوج بھی ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا فرض نہیں ادا کرتے، بلکہ اکثر مجرموں کا ہاتھ پکڑنے کے بجائے ان کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ ان تجربات کی صداقت میں شبہہ دشوار ہے مگر اس کے باوجود پورے ہندوستان کے نظم حکومت سے مایوسی نہ حق بجانب ہے اور نہ حکمت عملی کے مطابق ہے۔ اس مایوسی کے نتائج ہمارے حق میں بہت خراب ہوں گے یہ مایوسی اس لیے حق بجانب نہیں کہ متعدد مقامات پر ایسا تجربہ بھی ہوا ہے کہ مقامی حکام اور پولیس کے صحیح طرزِ عمل نے جارحانہ عزائم کو ناکام بنا دیا یا ایسی فضا قائم رکھی کہ ان عزائم کا عملی طور پر اظہار ہی نہ ہو سکا۔ یہ بات غلط ہوگی کہ ہم ایسے تجربات کو کوئی وزن نہ دیں اور ان کی روشنی میں جو امید پیدا ہوتی ہے اسے ختم کر دیں۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ مقامی افسران کی کوتاہیوں کی مسلسل نشان دہی سے انتظامیہ کی اعلیٰ سطحوں پر کچھ حرکت پیدا ہو اور اس سے مقامی نظم و نسق میں ضروری تبدیلیاں عمل میں آ سکیں۔ مقامی

حکام کے خلاف عمومی بے اعتمادی اور ان سے صورت حال کی اصلاح میں تعاون حاصل کرنے سے مایوسی کی بنا پر دریغ حکمت عملی کے بھی خلاف ہے۔ اس طرح ہم جارحانہ عزائم کے حامل عناصر کے لیے ان حکام کا تعاون حاصل کرنا آسان بنا دیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم بیدار اور چوکس رہیں، جارحانہ حملوں سے پہلے، حملوں کے دوران اور ان کے بعد مقامی حکام اور پولیس کے افسران سے ربط قائم رکھیں۔ ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، ان کی کوتاہیوں سے ان کے اعلیٰ افسران اور ریاستی یا مرکزی حکومت کو باخبر کریں تو ان کے لیے شر پسندوں کا آلۂ کار بننا مشکل ہو جائے گا۔ مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر عام مسلمانوں میں یہ خیال گہری جڑیں پکڑ گیا کہ ملک کا سارا انتظامی عملہ ان کے دشمنوں کے ساتھ ہے تو اندیشہ ہے کہ ان کے حوصلے جواب دے جائیں اور وہ جارحانہ عناصر کے مقابلہ میں ہمت ہار بیٹھیں۔

جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ نیز دینی تعلیم، پرسنل لا اور اوقاف کے سلسلے میں دستورِ ہند اور قانونِ ملکی میں دی ہوئی ضمانتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور انتظامیہ سے ان ضمانتوں کے تقاضے پورے کرنے کا مسلسل مطالبہ کرتے رہنا بہت ضروری ہے اور مایوسی کا شکار ہو کر تساہل برتنا غلط ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کانگریس اور ملک کی اکثر سیاسی جماعتیں جو مختلف ریاستوں میں حکومت چلا رہی ہے مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے درمیان تفریق نہ برتنے کے سیکولر اصول سے وابستگی کا دم بھرتی ہیں، اور بلاشبہہ بعض پارٹی لیڈر اپنے اس دعوے میں مخلص بھی ہیں۔ ضرورت ہے کہ انتظامی عملہ کے غیر سیکولر اور جانب دارانہ طرز عمل کی تشہیر کی جاتی رہے تاکہ ان لیڈروں کے ہاتھ مضبوط ہوں اور انھیں اصلاح حال میں مدد ملے۔ ملک اور ملت دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ حکمرانی کا یہ سیکولر اصول عمل میں بھی برقرار رہے اور اس بات کی نگرانی سب سے آگے بڑھ کر خود ہمیں کرنا چاہیے کیونکہ اس کی خلاف ورزی سے سب سے زیادہ نقصان بھی ہمیں کو ہوتا ہے۔

جارحانہ عزائم کو ناکام بنانے کی تدابیر کا ایک پہلو خود مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ضروری ہے کہ ان کی ہمتیں اور حوصلے بلند رہیں اور مصائب کے ہجوم میں خوف زدہ اور ہراساں ہو کر شکست خوردہ ذہنیت کے شکار نہ ہوں۔ اس کیفیت کی بحالی کے لیے مسلمانوں میں اللہ پر اعتماد، اسی سے مدد چاہنے اور کسی انسانی طاقت سے نہ ڈرنے کا جذبہ بیدار رکھنا ہوگا۔ انھیں بار بار یہ یاد دلانا ہوگا کہ اگر اللہ نہ چاہے تو کوئی انسانی طاقت انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر انھیں صدمات پہنچ

ہیں تو ایسا اللہ کی مشیت ہی کے تحت ہو رہا ہے۔ اللہ کے بتلائے ہوئے طریقوں کے مطابق ان مصائب کو دور کرنے کی پوری کوشش کے ساتھ انہیں خندہ پیشانی کے ساتھ انہیں برداشت کرنا چاہیے اور اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اندر وہ صفات پیدا کرنا چاہیے جو انہیں اللہ کے رحم و کرم اور اس کی نصرت و تائید کا مستحق بنا سکیں۔ ساتھ ہی ان کے اندر مستقبل کے بارے میں امید اور اعتماد کی وہ کیفیت پیدا کرنا چاہیے جو مذکورہ بالا طرز فکر کو اختیار کرنے اور تدابیر کو روبہ کار لانے سے قدرتی طور پر جنم لے گی۔ پھر انہیں یہ بھی بتانا چاہیے کہ جب کسی فرد یا گروہ کی جان و مال عزت و آبرو پر دست درازی کی جائے تو وہ فرد یا گروہ اپنے بچاؤ کے لیے مناسب تدابیر بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ملک کا قانون انہیں ایسا کرنے سے نہیں روکتا۔ بلکہ ان کا مددگار ہے۔ ہر مسلمان کو اپنی ذات خاندان اور بستی کو جارحانہ حملوں سے بچانے کا اہتمام کرنے کا حق ہے اور یہ کام چوری چھپے نہیں علانیہ کرنا چاہیے نچلی سطح کے بعض کوتاہ بین حکام اگر اس کام میں رکاوٹ ڈالیں تو ان سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ تحفظ کی ضمانت دیں اور ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ ان کی دی ہوئی ضمانت پر بھروسہ کیا جا سکے اس کے باوجود انہیں افراد کو ایسی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے سے روکنے کا کوئی حق نہیں جن کی ملک کا قانون انہیں اجازت دیتا ہو۔

ظاہر ہے کہ تدابیر کا یہ پہلو بہت نازک اور غیر معمولی حزم و احتیاط کا طالب ہے۔ دفاعی کوششوں اور جارحانہ تیاریوں کا فرق ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کبھی کسی حال میں بھی اپنے اندر جارحانہ ارادوں کو راہ نہ دینا چاہیے مسلمانوں کے لیے جارحانہ رویہ اختیار کرنا ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی شرعی حیثیت کے پیش نظر نہ شرعاً درست ہو گا نہ اس سے عملاً کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ البتہ اس سے جارحانہ ہندو عناصر کو شہ ملے گی اور انہیں عام ہندوؤں کو گمراہ کرنے اور حکومت کے انتظامی عملہ نیز ملک کی رائے عامہ کے نزدیک مسلمانوں کی پوزیشن مشکوک قرار دینے میں مدد ملے گی۔ ایسی حرکتیں کرنے والے مسلمان ہمیں اپنے دوستوں کی ہمدردیوں سے محروم کریں گے اور دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کریں گے۔

ہر ہندوستانی کی طرح ہر مسلمان کو بھی اس بات کا حق ہے کہ اگر کوئی فرد یا گروہ اس پر حملہ کرے تو وہ اس حملہ کا جواب دے لیکن کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی غیر حملہ آور ہندو سے بھی انتقام لے

دست درازی کرے کہ اس کے چند دوسرے ہم مذہب مسلمانوں پر دست درازی کر رہے ہیں۔ اگر کوئی مسلم ایسا کرے گا تو اپنی عاقبت بھی خراب کرے گا اور دنیا میں بھی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ آج پوزیشن یہ نہیں ہے کہ پوری ہندو قوم مسلمانوں پر حملہ بول چکی ہو بلکہ ہندوؤں میں سے کچھ شرپسند عناصر حملہ آور ہیں۔ اپنے دفاع میں ان حملہ آوروں پر حملہ کیا جا سکتا ہے مگر عام ہندوؤں کی جان و مال اور عزت و آبرو اسی طرح محترم ہے جس طرح سارے انسانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محترم ہے اور ان پر دست درازی حرام ہے۔ ہر انسان کی طرح ہر ہندو ہماری دعوت یعنی اسلام کی دعوت کا مخاطب ہے۔ ایک ہندو سے ہمارا اولین اور اہم ترین تعلق یہ ہے کہ ہمیں اس تک اس کے پروردگار کا وہ پیغام پہنچانا ہے جس کے ہم امین ہیں۔ اس تعلق کی خاطر جو مستقل ہے ہمیں ان عارضی تعلقات کو فیصلہ کن نہ بنانا چاہیے جو بحرانی کیفیت کی پیداوار ہیں۔ وہ لوگ جو ہندوؤں سے اپنے اس تعلق کو بھول جائیں اور دوسری جغرافیائی نسلی یا لسانی قوموں کی طرح ہر اس فرد کو جو ان کی 'قوم' کا فرد نہیں ہے غیر بلکہ دشمن سمجھ کر اس سے معاملہ کریں۔ معاملہ فہم مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ جو لوگ اس طرح سوچتے اور مسلمانوں کو اسی انداز پر سوچنے کی تربیت دینا چاہتے ہیں وہ اسلام اور ملت اسلامیہ پر ظلم کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کے اپنی اصل حیثیت کو بھول جانے ہی کا نتیجہ ہے کہ بعض اوقات ان میں سے بعض غیر ذمہ دار افراد کی مشتعل مزاجی یا عجلت پسندی سے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جو شرپسند عناصر کو سرگرم ہونے اور عام ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ہمیں عام مسلمانوں کی ایسی تربیت کرنا چاہیے کہ ان میں صبر و تحمل کے ساتھ حکمت کے تقاضوں اور اسلام اور ملت اسلامیہ کے مفاد و مصالح کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے کی توفیق ہو۔ مسلمان رہنماؤں اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی صحیح رہنمائی اور بروقت ہدایات کے ذریعہ اس کا اہتمام کریں تاکہ فرقہ وارانہ جارحیت کے انسداد اور مقابلے میں عام مسلمانوں کا طرز عمل مددگار ہو نہ کہ مزاحم۔

مسلمانوں پر جارحانہ حملوں کے مقابلے کے لیے ملک کی رائے عامہ کو حقائق سے باخبر کرنا، امن پسند ہندوؤں کا تعاون حاصل کر کے شرپسندوں کا زور توڑنا اور حکومت کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلانا اور ان کو پورا کرنے پر آمادہ کرنا، نیز مسلمانوں میں اعتماد و توکل علی اللہ اور صبر و تحمل کی کیفیات پیدا کرنے کے ساتھ انہیں اپنے دفاع کے لیے تیار رکھنا ایسی تدابیر ہیں جن پر پوری قوت کے ساتھ عمل کیا جائے تو یہ مفید ہو سکے

سکتے ہیں اور ان کا اثر کم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے ملی مسائل کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی مسلمانوں کو بطور خود ان مسائل کے حل پر آمادہ کرنا، حکومت سے انصاف کا مطالبہ اور انصاف پسند ہندوؤں کی تائید وحمایت حاصل کرکے ملک کی رائے عامہ کی ایسی تربیت کرنا جو ان مسائل کے ضمن میں مسلمانوں کے ساتھ عدل وانصاف کے لیے راہ ہموار کر سکے۔ اس مختصر مقالے میں مذکورہ بالا تدابیر کی عملی تفصیلات سے تعرض ممکن نہیں لیکن اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ ان کے زیر عمل لانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان نظم واتحاد کے ساتھ انھیں اختیار کریں۔ ملی اتحاد فکری انتشار اور طریق کار کے بارے میں متضاد رجحانات کی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زیر غور مسئلہ کے اصل طویل المیعاد حل اور ان فوری تدابیر پر تبادلۂ خیال کریں جنھیں صورت حال کی اصلاح کے لیے اختیار کرنا ضروری ہے۔ امید ہے اس خیال کے نتیجہ میں ملت کے لیے کسی ایسے لائحۂ عمل پر متفق ہونا ممکن ہو جائے گا جس کو پوری یکسوئی کے ساتھ اختیار کیا جا سکے تاکہ مطلوبہ نتائج برآمد ہو سکیں۔ امید ہے کہ یہ مقالہ اس تبادلۂ خیال میں مددگار ثابت ہوگا۔

نوٹ:- یہ مقالہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، بنگلور کے زیر طبع مجموعہ مقالات کے لیے لکھا گیا ہے۔

اسلام میں شخصی آزادی

(پروفیسر انیس احمد، شعبۂ تاریخ اسلام کراچی یونیورسٹی)

انسان نے اپنے حقوق کے تحفظ اور انصاف کی ترویج کے لیے جن بنیادی اداروں کو قائم کیا ہے ان میں مملکت کا ادارہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ ابتدائی دورِ وحشت کا انسان ہو یا جدید متمدن دنیا کا شہری ہر دور میں اور ہر زمانے میں انسانی زندگی نت نئے خطرات سے دوچار رہی ہے اور ظرفہ تماشا یہ ہے کہ سب سے اہم خطرات خود انسان ہی کی طرف سے رونما ہوئے۔ انسان میں نیکی اور بدی، انصاف اور ظلم، حق پرستی اور حق دشمنی دونوں کے داعیات پائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ خیر و فلاح کے کام بھی ہوتے ہیں اور ظلم و عناد بھی۔ یہی وہ تضاد ہے جو ایسے بااقتدار اداروں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو عدل و انصاف کو قائم کرنے کے ذمہ دار ہوں اور جن کے ذریعے انسانی معاشرہ فتنہ و فساد سے پاک کیا جا سکے۔ مملکت، قانون، عدالت یہ سب ادارے اسی فطری ضرورت کو پورا کرنے کی کوششیں ہیں۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے تمام مسائل کے واضح اور متعین حل پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام ابتدا ہی سے ایک ایسے ادارے کے وجود کا قائل رہا ہے جو انسان کے بنیادی سیاسی مسائل کو حل کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ تخلیقِ آدم کے وقت آدم کو خلیفہ کے لقب سے پکارا گیا اور بعد میں انبیاء کرام علیہم السلام کی ذمہ داریوں میں سے ایک قیامِ عدل و انصاف کا قیام کی ذمہ داری بھی رہی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا۔ ہجرت سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا کہ:

وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ [illegible]

وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ	بھی تو لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے
لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا	ساتھ نکال اور اپنی طرف سے اقتدار کو میرا
(بنی اسرائیل)	مددگار بنا دے

قیام مملکت کے سلسلے میں آپ کی کوششوں کی بین دلیل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قرآن پاک میں بے شمار مقامات پر مملکت کے وجود کو ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ الحدید آیت ۲۵، سورۂ المائدہ آیت ۴۴، سورۂ یوسف آیت ۴۰، سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۴، سورۂ اعراف آیت ۱۰۸، سورۂ آل عمران، آیت ۷۵ وغیرہ)

ان آیات قرآنی میں مملکت کی اہمیت اور اس کے جو بنیادی خد و خال پیش کیے گئے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں۔

۱۔ حاکمیت کسی شخص، خاندان، طبقہ یا گروہ کی نہیں صرف اور صرف اللہ کی ہے۔

۲۔ قانون سازی کے جملہ اختیارات تشکیل و تنسیخ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

۳۔ جو مملکت اس قانون الٰہی کو جاری کرے وہ اسلامی ہے اور اس کی اطاعت ہر شہری پر فرض ہے اس مملکت کا مقصد امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے اور یہ اپنے شہریوں کے جملہ حقوق کے تحفظ اور ان کے لیے فوز و فلاح کے مواقع فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔

ان چند بنیادی معروضات کی روشنی میں ہم "اسلام میں شخصی آزادی" کے بنیادی تصور کو زیادہ واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مملکت کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرے۔ اس سلسلے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کا وجود یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہر طبقہ خیال اور ہر مکتب فکر میں بہرحال انسان کے چند بنیادی حقوق تسلیم کیے گئے ہیں جن میں اولیت تحفظ جان، مال، ملکیت، شخصی آزادی اور قانونی معاشرتی اور معاشی آزادی کو حاصل ہے۔

ان بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے سیاسی مفکرین نے ہر دور میں مملکت کو ذمہ دار قرار دیا ہے خواہ یہ مفکرین ایک "فطری حقوق" کے نظریے کے ماننے والے ہوں یا "قانونی حقوق" کے "تاریخی تصور" پر یقین رکھتے ہوں یا "رواجی تصور" پر اور "فلاحی تصور" کے قائل ہوں یا "شخصی تصور" کے۔ جزوی اختلافات کے باوجود [illegible] حقوق پر سب کا [illegible] اتفاق پایا جاتا ہے۔ [illegible]

پر نظر ڈالتا ہے تو اسے بحیثیت مسلمات کے بنیادی محرک کی حیثیت سے انسانی حقوق کے تحفظ کا جذبہ نظر آتا ہے۔ ایک سیاسی مفکر جب سیاسی ارتقا پر نظر ڈالتا ہے تو اسے فرد اور معاشرہ، حکومت اور مقاصد فرائض غرضیکہ ہر ادارے میں انہی حقوق کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ایک معلم اخلاق جب انسانی معاشرے کا جائزہ لیتا ہے تو اخلاق کے وجود اور مذہب کے بنیادی وظائف میں انہی حقوق کا تعین اور تحفظ پایا جاتا ہے۔ گویا وساتیر عالم ہوں یا مجموعہ ہائے پند و اخلاق، ہر فکری کاوش میں انسان کے چند بنیادی فطری اور شخصی حقوق کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیے گئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسی بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے جب سے شعوری زندگی کا آغاز کیا ہے، اسے اپنے حدود کار کے تعین کے لیے چند ایسے ضابطے، چند اصول اور چند کلیے وضع کرنے پڑے جو فرد اور فرد، فرد اور معاشرہ اور فرد اور مملکت کے دائرہ کار کو متعین کر سکیں۔

اس مختصر سی گفتگو کا مرکزی خیال انسانی کے بنیادی حقوق کا صرف وہ پہلو ہے جسے ہم شخصی آزادی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے۔ ایک الہی ضابطۂ حیات ہے اور یہی وہ اصل چیز ہے جو اسلام کے تصور شخصی آزادی اور دیگر تصورات کے درمیان فرق و امتیاز کی بنیاد ہے۔ یہاں پر شخصی آزادی کو متعین کرنے والی قوت اور ادارہ نہ تو محض قانون ہے اور نہ رواج۔ نہ محض معاشرہ اور نہ ہی اجتماعی فلاح بلکہ اس شخصی آزادی کا عطا کرنے والا اور اس کا تحفظ کرنے والا خود اللہ تعالیٰ اور اس کا قانون ہے۔ چنانچہ اس فرد کے لیے جو اسلامی مملکت کا شہری ہو، جس نے اللہ کے قانون کی فوقیت اور قطعیت کا اقرار کر لیا ہو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ؐ چند تحفظات کا ذمہ لیتے ہیں۔

قرآن اللہ تعالیٰ کی قانونی حاکمیت اور رسول کی اطاعت، قانونِ الٰہی کی بالادستی، سلطنت اور خلافت کا قیام، ریاست کے حدود و اطاعت، مشاورت، دستوری مسائل وغیرہ سے بحث کرتے ہوئے انسان کے بنیادی حقوق کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

تحفظ جان: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (۶:۱۵۱) — کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے حق کے بغیر قتل نہ کرو۔

تحفظ حقوق ملکیت: وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ) — اپنے مال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔

تحفظ عزت: [illegible]

وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۔ (الحجرات ۴۹: ۱۱-۱۲)

اور نہ تم ایک دوسرے کو عیب لگاؤ نہ ایک دوسرے کو برے لقب دو۔

نجی زندگی کا تحفظ

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (النور ۲۴: ۲۷)

اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا (حجرات)

اور لوگوں کا بھید نہ ٹٹولو

تنقید کی آزادی

اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا (الاعراف ۷: ۱۶۵)

ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو برائی سے روکتے تھے اور پکڑ لیا ظالموں کو عذاب سخت میں ان فسق کے بدلے جو وہ کرتے تھے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳: ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نکالا گیا ہے لوگوں کے لیے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

اور جب کسی معاملہ میں ان سے (یعنی ارباب امر سے) اختلاف اور تنازع ہو تو خدا اور رسول کے حکم (منشاء) کی طرف لوٹو

آزادیٔ اجتماع کا حق

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ (آل عمران ۳: ۱۰۴-۱۰۵)

اور ہونا چاہیے تم سے ایک ایسا گروہ جو دعوت دے نیکی کی طرف اور حکم دے نیکی کا اور روکے بدی سے ایسے ہی لوگ فلاح پاتے ہیں اور نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جو متفرق ہوئے اور جنہوں نے اختلاف کیا جب کہ ان کے پاس واضح ہدایات آچکی تھیں۔

اعتقاد و مسلک کی آزادی

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ ۲: ۲۵۶)

دین میں جبر نہیں ہے

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس: ۹۹)

کیا تو ان لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں

عدل کا قیام

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (نساء) — اور جب لوگوں کے معاملات میں فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

لِیَقُوْمُ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (المؤمن) — تاکہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم کریں

بنیادی ضرورت فراہم کرنے کا حق

وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ — اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کا اور محروم کا۔

(سورۂ ذاریات ٥١: ١٩)

اسی طرح بے شمار مقامات پر احادیث نبوی میں یہ مضمون نظر آتا ہے کہ جس نے ہمارے طریق پر نماز پڑھی ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا، ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلم ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو چکا ہے۔ سو اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں دغا بازی نہ کرو۔[1]

ان آیات قرآنی میں اور ارشادات نبوی میں جن حقوق اور فرائض کا ذمہ لیا گیا ہے وہ مختصراً یہ ہیں۔

ا۔ شہریوں کی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری براہ راست خدا اور اس کے رسول کی ریاست اس ذمہ داری میں برابر کی شریک ہے۔

٢۔ شہری کی ذاتی ملکیت کے جملہ حقوق محفوظ ہوں گے۔ حکومت ایک نگراں اور محافظ ادارے کے فرائض انجام دے گی۔ اور شہری کی اجازت کے بغیر کسی قسم کی دخل اندازی نہ کر سکے گی۔

٣۔ ہر شہری کی شخصی آزادی محفوظ ہوگی۔

قرآن اور حدیث کے بعد اب میں تاریخ کے چند اوراق آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ان اصول و کلیات کو عملی شکل میں کارفرما دکھایا جا سکے۔

ا۔ جنگ حنین کا واقعہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ سے چند زرہیں طلب فرمائیں صفوان بن امیہ جو ایک عام شہری ہے، ابھی ابھی حدود اطاعت میں داخل ہوا ہے۔ سوال کرتا ہے "اغصبا یا محمد" کیا بلا معاوضہ لینے کا ارادہ ہے اے محمد! آپ فرماتے ہیں۔ "یہ مستعار ہیں جو ان میں سے ضائع ہوں گی ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔" گویا مملکت کو کسی کی ذاتی ملکیت غصب کرنے یا قومی مفاد کے تحت زبردستی حاصل کرنے کا حق نہیں ہے جب تک کہ دونوں فریق کسی اتفاق تک نہ پہنچ جائیں۔

[1] بخاری، باب فضل استقبال القبلہ: بحوالہ امین احسن ... اسلامی ریاست ...

۴۔ رسولِ پاکؐ مدینہ میں مسجدِ نبوی میں خطبہ دے رہے ہیں۔ ایک شخص خطبہ کے درمیان کھڑا ہو کر سوال کرتا ہے کہ میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم توقف فرماتے ہیں کہ شاید کوئی ذمہ دار شخص وجہ جواز پیش کرے۔ سائل دوبارہ سوال دہراتا ہے۔ آپ فوراً اس کے پڑوسیوں کو رہا کر دینے کا حکم دے دیتے ہیں۔

۵۔ مصر کے فاتح عمرو بن العاص کے صاحبزادے محمد ایک مصری کو چند کوڑے مارتے ہیں اور اس خوف سے کہ کہیں بات پھیل نہ جائے اسے گرفتار کرا دیتے ہیں۔ مصری بھاگ کر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا۔ آپ عمرو بن عاص اور ان کے صاحبزادے کو طلب کرتے ہیں اور مصری کو کوڑا دے کر محمد بن عمرو بن عاص کو برسرِ عام پٹواتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اب ذرا گورنر کی بھی خبر لو انہی کی وجہ سے بیٹے کو یہ جرأت ہوئی۔

اسلامی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اسلامی مملکت میں عملی طور پر کسی شہری کی جان، مال، ناموس اور شخصی آزادی کس قدر محترم تھی اور حکومت کس حد تک اس کی ذمہ دار تھی۔

اسلام کے تصورِ شخصی آزادی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ شخصی آزادی من جانب اللہ ہے۔ اس لیے مملکت یا کوئی ادارہ یا فرد اس آزادی کو سلب کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلے میں دیگر نظامہائے سیاسی میں یا تو کوئی فرد یا کوئی معاشرہ یا کوئی ادارہ یا کوئی حکومت یا کوئی قانون یہ شخصی آزادی دیتا ہے اور منطقی طور پر اسے اس آزادی کو سلب کرنے کا حق بھی ہوتا ہے لیکن اسلام میں اس حق کو سلب کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے اور یہی وہ بنیادی خوبی ہے جو اسلامی مملکت میں شخصی آزادی کو تمام تصورات سے ارفع و بلند کرتی ہے۔

اسلامی مملکت کے شہری کو چند حقوق ہی عطا نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ایسے انسان کے وجود میں آنے اور قائم رہنے کے امکانات بھی پیدا کرتا ہے جو ان حقوق اور تحفظات سے مستفید بھی ہو سکے۔

دورِ جدید میں انسانی حقوق کے بلند ہونے کا دعوٰی تو کیا جاتا ہے لیکن ان حقوق کی ظاہری ضمانت کے لیے انسان کو چند ایسے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور قانونی بندھنوں میں جکڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ان حقوق کا تقاضا تو کر سکے لیکن ان سے کوئی استفادہ نہ کر سکے۔

۱۲۱۵ء کا میگنا کارٹا ہو یا ٹامس پین کا منشورِ حقوقِ انسانی ہو یا روسو کا معاہدۂ عمرانی ہو یا دورِ جدید میں بگوٹا کانفرنس کی سفارشات ہوں یا منشورِ اقوامِ متحدہ، ان تمام دستاویزوں کی حیثیت محض کاغذ پر کتابت سے

لکھے ہوئے چند الفاظ سے زیادہ نہیں ۔ یہ الفاظ دیکھنے میں کتنے ہی خوش نما معلوم ہوتے ہوں اور سننے میں کتنے ہی شیریں محسوس ہوتے ہوں، اس انسان کو ہمارے سامنے پیش کرنے سے کلیتہً ناکام ہو چکے ہیں جو عملاً ان حقوق کو حاصل بھی کر سکے ۔ اگر مجھے ایک قدیم تمثیل استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو یہ دستاویز سونے کی کھجوریں ہیں جو کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان حقوق کو قائم کرنے کے لیے جس انسان کی ضرورت ہے اسے یہ دور جنم دینے میں ناکام رہا ہے ۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے جو تصور مملکت دیا ہے وہ اس بات کا ضامن ہے کہ اس کے ہاتھوں انسانی حقوق بہ کمال قائم ہوں گے اور انسان شخصی آزادی کی تمام نعمتوں سے متمتع ہو سکے گا ۔

یہ وہ اہم خصوصیت ہے جو اسلام کے تصور شخصی آزادی کو دیگر تصورات سے ممتاز کرتی ہے ۔ اسلام نے شخصی آزادی کو محض فرد ہی تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ وہ فرد کو ایک جماعت کا جزو قرار دے کر فرد اور ہیئت اجتماعی کے درمیان ایک متوازن رشتہ اور تعلق پیدا کرتا ہے ۔ وہ فرد کو اس حد تک آزادی دیتا ہے کہ وہ دوسرے کی آزادی پر اثر انداز نہ ہو ۔ اسی طرح اسلام نے شخصی ملکیت کے اقرار کے ذریعہ فرد کو مقابلہ و مسابقہ کے فطری محرکات فراہم کر دیے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فرد کو اجتماع سے الگ کر کے دیکھنے اور سوچنے کا قائل نہیں ۔ یہاں پر فرد کا وجود صرف ربط ملت سے ہے ۔ گویا اسلام شخصی آزادی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ایک متوازن سیاسی اور معاشی ڈھانچہ وجود میں لاتا ہے جو انسانیت کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دیتا اور جو طبقاتی کش مکش اور لونی یا لسانی تفریق کا خاتمہ کرتا ہے ۔ یہاں پر حقوق و فرائض میں کسی قسم کا ٹکراؤ، تصادم اور کھچاؤ نہیں ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ حق کی اصطلاح چونکہ ایک اسم ربانی بھی ہے ۔ اس لیے اس کی عظمت و اہمیت ایک تقدس کا پہلو لیے ہوئے ہے اور اس حیثیت سے اس کی ادائیگی ایک سیاسی ضرورت ہی نہیں ایک دینی فریضہ ہے ۔

اسلام کا تصور شخصی آزادی ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تصور ہے ۔ ترقی یافتہ اور عقل سے آراستہ انسان کے تخلیق کردہ تصورات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی نظر اس کے اپنے پاؤں سے آگے نہیں دیکھ سکی ۔ اسلام نے اس سے کئی قدم آگے بڑھ کر حقوق کے تحفظ کا ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی نظام وضع کیا جس میں انسانوں کے متعلق حیوانات اور نباتات تک کے شخصی حقوق متعین کر دیے گئے ۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جانوروں کو بلا وجہ نہ مارا جائے، ان پر ان کی قوت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے حتیٰ کہ سبز درختوں تک کو نقصان نہ

پہنچایا جائے۔ کیا کوئی اور تصور سیاسی شخصی حقوق کا اتنا ہمہ گیر تصور دے سکتا ہے جس میں کل جاندار وں کے شخصی حقوق کی ضمانت دی گئی ہو۔

انسان کے شخصی حقوق کے تحفظ کے لیے اسلام نے مملکت کے ادارے کو محض ایک تادیبی ادارے کی حیثیت سے قائم نہیں کیا۔ اسے محض چند قوانین کا نفاذ چند حدود کے اجراء اور چند قوانین کے عائد کرنے کی ذمہ داری ہی نہیں سونپتی بلکہ مملکت کو ایک تعلیمی ادارہ بنایا ہے۔ ذمہ داران مملکت کی حیثیت مصلحین کی ہے۔ اور وہ انبیاء کرام کے جانشین ہیں۔ حکومت کو ایک استاد کی طرح ہمدرد، شفیق اور معاون و مددگار ہونا چاہیے۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ عام معاشروں میں پہلے حقوق پامال ہوتے ہیں اور پھر ان کی پامالی سے ان کے تحفظ کے لیے قانون، معاشرہ یا مملکت وجود میں آتے ہیں لیکن اسلام مملکت کو پہلے قائم کرتا ہے۔ وہ پہلا فرد جو دنیا میں آتا ہے اور ایک سیاسی اختیار کے ساتھ اتارا جاتا ہے۔ یہاں پر ارتقاء کا رخ بالکل مختلف ہے۔ اپنے بنیادی تصورات کے بارے میں اسلام روز اول سے کامل ہے۔ یہ دوسرے نظریات کی طرح غلطی، گمراہی، ٹھوکریں کھانے اور تجربات کرنے کے راستوں سے گزر کر تکمیل کو نہیں پہنچا ہے بلکہ ایک الٰہی ضابطہ ہونے کی بنا پر روز اول سے ہی اپنے اندر انسانی فطرت سے مطابقت، انسانی احتیاجات کی تکمیل کی صلاحیت اور شخصی و اجتماعی حقوق کے تحفظ کی ضمانت لیے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ بدلتے ہوئے زمانے کی ضروریات پوری کرنے اور معاشرے کو ارتقا کی اعلیٰ ترین منازل تک پہنچنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ (المعارف۔ لاہور)

اہم سوالات ۔ واضح جوابات

سوالات پاکستان کے طلبہ نے کیے ہیں اور جوابات مولانا سید ابوالاعلیٰ نے دیے ہیں ہم یہ سوال و جواب معاصر آئین لاہور کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں ۔ (ادارہ)

س ۔ P.D.M. میں شامل جماعتوں کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ ان میں سے کوئی سوشلزم کی حامی ہے، کوئی اسلام کے اقتصادی نظام کی علمبردار ہے —— اگر P.D.M اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوگئی تو وہ کس جماعت کے نظریات کو P.D.M. کا فیصلہ قرار دے گی ۔

ج ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تحریک جمہوریت پاکستان جمہوریت کو بحال کرنے کے لیے بنائی گئی ہے وہ کسی پارٹی کے معاشی پروگرام پالیسی اور پروگرام کو نافذ کرنے کے لیے نہیں بنائی گئی ۔ ضروری ہے کہ تحریک جمہوریت کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے ۔

ان تمام جماعتوں نے جو تحریک جمہوریت میں شریک ہیں بنیادی طور پر یہ طے کیا ہے کہ ہمارے منشور، پروگرام اور نظریات خواہ ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوں تب بھی ہم سب مل کر پہلے اس بات کی کوشش کریں کہ اس ملک میں فیصلہ کرنے کے اختیارات آمریت کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے ہاتھ میں آجائیں ۔ ملک کے باشندے یہ فیصلہ کریں کہ کیا ہم چاہتے ہیں اور کیا نہیں چاہتے ۔ گویا ہم جمہوریت کی بحالی کے لیے ملک کے باشندوں کے بنیادی حقوق منوانے کی بنیاد پر متحد ہوئے ہیں ۔ چناں چہ سب سے پہلے دستور کو تبدیل کیا جائے گا اور ۱۹۵۶ء کے دستور کو جسے کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا، بحال کیا جائے گا، پھر انتخابات کرائے جائیں گے ۔ (مارشل لا کے نفاذ کے وقت اس دستور کے تحت صرف چار پانچ ماہ بعد انتخابات ہونے والے تھے) ان انتخابات میں ہر جماعت آزاد ہوگی کہ وہ اپنا جو بھی منشور رکھتی

ہے اسے عوام کے سامنے لائے۔ جس پروگرام کو بھی وہ بہتر سمجھتی ہے اسے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ ملک کے باشندے جس جماعت کے منشور اور پروگرام کو پسند کریں گے اور جس پر زیادہ اعتماد کریں گے اسی جماعت کو حکومت حاصل ہو جائے گی اور وہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرے گی۔

ظاہر ہے کہ تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل جماعتوں میں سے ہر ایک کے الگ الگ خیالات ہیں اگر ہمارے نظریات الگ نہ ہوتے تو الگ الگ پارٹیاں کیوں ہوتیں۔ چناں چہ نظریات اور پروگرام تو ہم اپنے الگ الگ رکھتے ہیں لیکن اس بات پر ہم پوری طرح متفق ہیں کہ پہلے جمہوریت بحال ہونی چاہیے اس کے بعد پھر آزاد جمہوری فضا میں ہر جماعت اپنے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرے گی۔

س۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت ہمارے ملک میں ناکام ہو گئی ہے تو ہم اس کی بحالی کے لیے کیوں کام کریں۔ جب کہ یہ بھارت میں بھی خاص طور سے ناکام ہو رہی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:۔ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ جمہوریت ہمارے ملک میں ناکام ہو گئی ہے —— پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ جمہوریت نام کس چیز کا ہے؟

جمہوریت اس چیز کا نام ہے کہ ایک ملک کے باشندے خود اپنے معاملات طے کرنے کے مختار ہوں اور ملک کے باشندوں کی جو رائے ہو ملک کا انتظام اس کے مطابق چلایا جائے۔ یہ ہے جمہوریت کا مفہوم۔ کیا یہ چیز اس ملک کے باشندوں کو حاصل ہوئی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان کا نظام حکومت ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر چل رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ اس تصور پر قائم تھا کہ یہ برطانوی پارلیمنٹ ہے۔ جو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ گویا ہندوستان پر اقتدارِ اعلیٰ برطانوی عوام کا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اس ملک کے اندر برطانوی پارلیمنٹ کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ جو تھوڑی بہت خود مختاری یہاں دی گئی تھی وہ اس قسم کی تھی جس سے اصل فیصلے کے اختیارات کسی ایسی اسمبلی کو حاصل نہیں تھے جو اس ملک کے اندر انتخابات سے بنی ہو' بلکہ اس فیصلے کے اختیارات وائسرائے کے ہاتھ میں تھے اور وائسرائے برطانوی پارلیمنٹ کا ماتحت تھا۔ اسی طرح صوبوں میں اصل فیصلے کے اختیارات گورنروں کے ہاتھ میں تھے اور گورنر وائسرائے کے ماتحت تھے اور وائسرائے برطانوی پارلیمنٹ کا۔ اس تصور اور نظریے پر

کا ایکٹ بنی تھا۔ جب پاکستان آزاد ہوا تو اس ایکٹ ہی کو عمل دستور کی حیثیت سے اختیار [illegible] کر لیا گیا اور جو اختیارات برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے پاکستان کے عوام کو منتقل ہوئے تھے۔ ان اختیارات کی امین دستور ساز اسمبلی بنی۔ یعنی برطانوی پارلیمنٹ کی جگہ اس دستور ساز اسمبلی نے لے لی تھی۔ باشندوں کی طرف ابھی اختیارات منتقل نہیں ہوئے تھے۔ دستور ساز اسمبلی جب تک دستور نہ بنا دیتی اس وقت تک اختیارات ملک کے باشندوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے تھے۔

دستور ساز اسمبلی نے دستور بنانے کے فرض کی تکمیل میں مسلسل کوتاہی کی۔ ۱۹۵۶ء تک دستور نہیں بنا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک جس طرح آپ پہلے برطانوی پارلیمنٹ کی رعایا تھے اسی طرح اب اس دستور ساز اسمبلی کی رعایا بنے ہوئے تھے۔ کیونکہ جو اختیارات برطانوی پارلیمنٹ کو حاصل تھے وہی اختیارات اس دستور ساز اسمبلی کو حاصل تھے اور اس نے یہ اختیارات سالہا سال تک اپنے ملک کے باشندوں کو منتقل نہیں کیے۔ انتقال اختیارات کا یہ پہلا مرحلہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے ساتھ مکمل ہوا لیکن ۱۹۵۶ء کے دستور کی حد تک بھی صرف نظری طور پر اختیارات آپ کی طرف منتقل ہوئے تھے، علاوہ اس وقت تک منتقل نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ ملک میں عام انتخابات نہ ہو جائیں۔ ان عام انتخابات کا مرحلہ آتا تو آپ اپنے ان اختیارات کو عملاً استعمال کرتے یعنی ملک پر خود حکومت کرنے کے قابل ہوتے۔ لیکن قبل اس کے کہ عام انتخابات ہوتے اور ملک کے باشندے ان اختیارات کو استعمال کرتے جو ان کی طرف منتقل کیے گئے تھے۔ ملک پر فوجی آمریت ہو گئی اور مارشل لا کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح انتخابات روک دیے گئے اور وہ ساری طاقت جو برطانوی پارلیمنٹ سے دستور ساز اسمبلی کی طرف منتقل ہوئی تھی اس آمریت کے ہاتھ میں چلی گئی یعنی جس طرح پہلے آپ برطانوی پارلیمنٹ کے غلام تھے اسی طرح اس فوجی آمریت کے غلام بن گئے۔

۱۹۶۲ء تک کوئی آئین نہیں بنایا گیا اور ملک مارشل لا کے تحت رہا۔ ۱۹۶۲ء میں جو دستور بنا اس میں تمام اختیارات صدر کے ہاتھوں میں دیے گئے عوام کی طرف منتقل نہیں کیے گئے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک یہ پورے ۲۰ سال جو گزرے ہیں ان میں ایک دن بھی یہاں پر جمہوریت بحال نہیں کی گئی اب سوال یہ ہے کہ جب یہاں عملاً جمہوریت کا آغاز ہی نہیں ہونے دیا گیا تو اس کی ناکامی کا پروپیگنڈا کرنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اسے یہاں کام کرنے کب دیا گیا ہے؟ یہاں جمہوریت قائم کب ہوئی ہے؟ اور کب اختیارات لوگوں کی طرف منتقل کیے گئے ہیں؟

جمہوریت کے ناکام ہونے کا جو ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے ذرا اس کو بھی دیکھ لیں
جمہوریت اس چیز کا نام ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنے اختیارات سے اپنے ملک کے معاملات
کو چلائیں۔ اب ایک آدمی یہ دعوے کرتا ہے کہ ملک کے باشندے اپنے معاملات کو چلانے کے قابل نہیں ہیں
اور اس لیے میں سارے ملک کے معاملات کو خود چلاؤں گا یعنی لوگوں نے اسے یہ نہیں کہا ہے کہ تم ہماری
طرف سے معاملات چلاؤ بلکہ اس نے خود ہی یہ دعوے کر دیا اور خود ہی سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں
لے لیے۔ اس معاملے کو آپ ایک مثال سے سمجھیں۔ مثلاً پندرہ سولہ برس کا ایک لڑکا ہے جسے اپنے
باپ کی طرف سے ایک بڑی میراث اور جائداد ملی ہے اس کے باپ کے ملازموں میں ایک منشی جی ہیں
جو اس کے معاملات چلایا کرتے تھے۔ یہ منشی جی دعوے کرتے ہیں کہ یہ لڑکا اپنی جائداد سنبھالنے کے قابل
نہیں ہے اس لیے میں اس کے سارے معاملات کو چلاؤں گا۔ چنانچہ منشی جی تمام اختیارات کو اپنے
ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ وہ اسے اس کی جائداد میں کوئی کام نہیں کرنے دیتے، کسی قسم کا اختیار اس
کے ہاتھ میں نہیں چھوڑتے اور عملاً اس کی ساری جائداد کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ
اگر یہ منشی جی اپنے جیتے جی سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھیں تو کیا یہ نوجوان کبھی اپنے معاملات چلانے
کے قابل ہوسکتا ہے؟ ــــــــ وہ تو اس وقت اس قابل ہوگا جب کہ اس کی جائداد اس کے
ہاتھ میں ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی معاملے میں غلطی کرے، نقصان اٹھائے، یا تکلیفیں جھیلے، لیکن اسی طرح
وہ حالات کو سمجھے گا اسی طرح وہ بہت کچھ سیکھے گا، اور اپنے معاملات کو چلانے کے قابل ہو جائے گا۔
جمہوریت بھی اسی طرح اپنے معاملات کو خود سمجھنے اور تجربات سے سیکھنے کا نام ہے LEARNING
(BY EXPERNCE) ایک قوم آہستہ آہستہ اپنے تجربات سے یہ بات سیکھ جاتی ہے کہ وہ اپنے
معاملات کو کس طرح چلائے ــــــــ لیکن اگر منشی جی عمر بھر جائداد پر قابض رہیں تو وہ لڑکا بوڑھا
ہو جائے گا مگر اپنے معاملات کو چلانے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ اور اس کے بعد، قبل اس کے کہ منشی جی کا انتقال
ہو وہ اپنے بیٹے کو بٹھائیں گے کہ اب یہ معاملات کو سنبھالے گا، یا ممکن ہے کہ اپنے کسی بھائی بند کے
حوالے کر دیں، یا ان کے دفتر میں کوئی اور کلرک صاحب منتظر ہوں اور وہ قابض ہو جائیں اور سب کا استدلال
یہ ہو کہ یہ لڑکا کوئی تجربہ نہیں رکھتا اس لیے ہم جائداد کو سنبھالیں گے تو اس طرح وہ لڑکا ہی نہیں بلکہ اس کی
اولاد بھی کبھی اس قابل نہ ہو سکے گی کہ اپنی جائداد کو سنبھال سکے۔ اسے کبھی تجربہ ہی حاصل نہیں ہوگا کیونکہ

اس کے ہاتھ میں بھی کوئی اختیارات ہی نہیں تھے۔

چناں چہ جمہوریت کی ناکامی کا دعوے فقط ایک مکاری ہے جو ایک ملک کے باشندوں کے حقوق پر ڈاکہ مارنے کے لیے کی جاتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم بھی جب آزاد ہوتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ پہلے دن سے اپنے معاملات کو چلانے میں ماہر ہو جائے وہ قوم اپنے اختیارات کو انتخابات کے ذریعہ استعمال (EXERCISE) کرتی ہے۔ انتخابات میں وہ دھوکا کھا سکتی ہے، غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اپنے معاملات دے سکتی ہے۔ چار یا پانچ سال تک غلط قسم کے لوگ معاملات کو چلاتے رہتے ہیں قوم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہتی ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے چنا تھا وہ ہمارے ساتھ کیا زیادتیاں کر رہے ہیں۔ دوسرے انتخاب کی نوبت آتی ہے تو قوم انہیں اٹھا کر پھینک دیتی ہے اور دوسرے لوگوں کو آگے لاتی ہے۔ وہ بھی اگر قوم کی امنگوں کا ساتھ نہیں دیتے تو قوم تیسرے انتخابات میں جا کر زیادہ بہتر لوگوں کو آزماتی ہے۔ اس طرح اسے جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ قوم کو آزادی حاصل رہے اس کے بنیادی حقوق محفوظ رہیں، حالات لوگوں کے سامنے آتے رہیں۔ اخبارات آزاد ہوں، پبلک پلیٹ فارم آزاد ہو اور لوگ اپنے ملک کے حالات سے باخبر ہوتے رہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ اس بات کو سیکھتے جاتے ہیں کہ کن لوگوں پر وہ اعتماد کریں اور کیسے لوگوں کے ہاتھ میں اپنے معاملات دیں ——
یہ ہے ایک قوم کی زندگی میں جمہوریت کی کامیابی کا راستہ۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آزاد ہوتے ہی پہلے دن وہ جمہوریت کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلانے لگے جس طرح قومی خوش حالی کے لیے دو یا تین پنج سالہ منصوبوں کی تکمیل شرط ہوتی ہے اسی طرح اگر جمہوریت کی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک قوم کو دو یا تین آزادانہ انتخابات کے مراحل سے گزرنا پڑے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اور اگر فرض کیجیے کہ اس دوران میں ملک کے حالات خراب بھی ہو جائیں تو ملک کے کسی لازم کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ یکایک ملک پر قابض ہو جائے۔ نوکر ہے تو نوکری کرے۔ ملک کا مالک بننے کا اسے کیا حق حاصل ہے۔

. . . .

تحریک جمہوریت پاکستان ہی

مغربی اور مشرقی پاکستان کی عدمِ مساوات کو ختم کرسکتی ہے

س

کوئی سیاسی تنظیم پاکستان کے دونوں بازووں کے درمیان عدم مساوات (DIS PARTY) کے مسئلے کو کس طرح ختم کرسکتی ہے؟

ج

ہمارے نزدیک اس کی جو بہترین شکل تھی وہ تحریک جمہوریت پاکستان کے ۸ نکاتی پروگرام میں موجود ہے۔ اسے آپ دیکھیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے رہنماؤں نے خوب اچھی طرح غور و فکر کے بعد ایک پروگرام بنایا ہے، یہ تحریک جمہوریت کا ۸ نکاتی پروگرام ہے۔ انہی ۸ نکات میں اس عدم مساوات (DIS PARTY) کے بارے میں بھی نکات موجود ہیں کہ اسے اس طرح دور کرنا ہے اور اتنی مدت میں دور کرنا ہے۔ یہاں مجھے آپ سے اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ انہی آٹھ نکات کو پڑھ لینا کافی ہے۔

رسائل ومسائل

ہندوستان میں مسلمانوں پر عشر نکالنا واجب ہے

سوال

امسال چند متوسلین جماعت کے ذہن میں یہ تذبذب پیدا ہو گیا ہے کہ موجودہ زمینیں وہ نہیں ہیں جن کی پیداوار کا عشر نکالنا واجب ہے اس کا ردعمل غلط نکل رہا ہے۔ ان حضرات نے اپنی بات کے ثبوت میں مولانا اشرف علی صاحب کی کتاب بہشتی زیور اور مولانا نذیر الحق صاحب کی کتاب الاسلام کا حوالہ دیا کہ ان کتابوں میں درج ہے کہ یہ وہ زمینیں ہی نہیں جو عشری زمین کہلاتی ہیں لہٰذا ہم پر عشر واجب نہیں ہوتا۔ یہی ذہن ہمارے علاقے کے مسلم کاشتکاروں میں پایا جاتا ہے اور وہ اس فرض کی ادائیگی سے اپنے آپ کو بری تصور کرتے ہیں۔ اس لیے گزارش ہے کہ مسئلہ کی نوعیت سے تھوڑی تفصیل کے ساتھ مطلع فرمائیں اور زندگی میں بھی شائع کریں۔ سوالات یہ ہیں:-

(۱) شرعاً عشری زمین کس کو کہا جاتا ہے؟ (۲) موجودہ حکومت نے مسلمان کاشتکاروں کے قبضہ میں جو زمین دے رکھی ہے اس کا عشر نکالنا واجب ہے یا نہیں۔؟ ...... اس زمین کا عشر نہ نکالنے والا گناہ گار ہوگا یا نہیں —؟ (۳) موجودہ علماء کے درمیان کیا یہ مسئلہ اختلافی ہے؟ (۴) اختلاف کرنے والے عشری زمین کی کیا تعریف کرتے ہیں؟

جواب

آپ کے سوالات کا نمبر وار جواب دینے سے پہلے میں چند اصولی قسم کے نکات پیش کرتا ہوں۔ ان کی روشنی میں جواب کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ان نکات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے

(۱) کتاب و سنت اور اجماع سے مسلمانوں پر عشر بھی ٹھیک اسی طرح فرض ہے جس طرح سونا، چاندی اور دوسرے اموال پر زکوٰۃ فرض ہے۔ پیداوار کی زکوٰۃ ہی کو عشر کہتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں پر زکوٰۃ و عشر ہر ملک میں واجب ہے وہ دارالحرب ہو یا دارالاسلام۔ اس لحاظ سے دارالحرب اور دارالاسلام میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح دارالحرب یا دارالکفر میں مسلمانوں پر نماز روزہ اور حج فرض ہے اسی طرح زکوٰۃ و عشر بھی فرض ہے۔ قرآن کی جن آیتوں سے نماز، روزہ، زکوٰۃ و عشر اور حج کی فرضیت ثابت ہوتی ہے اس کے مخاطب تمام مسلمان ہیں وہ جہاں کہیں بھی مقیم ہوں کسی اسلامی مملکت کے باشندے ہوں یا کسی غیر اسلامی حکومت کے شہری ہوں۔

(۳) امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور جمہور ائمہ دین کے نزدیک مسلمانوں کی مملوکہ ہر زمین کی پیداوار پر عشر فرض ہے وہ زمین عشری ہو یا خراجی۔ ان سب اماموں کے نزدیک کسی مسلمان کی مملوکہ زمین کے خراجی ہونے کی وجہ سے عشر ساقط نہیں ہوتا۔

(۴) کسی حکومت کے لگائے ہوئے ٹیکس کی ادائیگی سے نہ زکوٰۃ ساقط ہوتی ہے، نہ عشر ساقط ہوتا ہے اس لیے کہ عشر و زکوٰۃ ایک عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہے یہ کسی انسان کا لگایا ہوا ٹیکس نہیں ہے

(۵) فقہائے احناف کی مخصوص رائے یہ ہے کہ ان کے نزدیک عشر اور زکوٰۃ جمع نہیں ہو سکتے، جو زمین عشری ہوگی اس پر عشر واجب ہوگا اور جو خراجی ہوگی اس پر خراج واجب ہوگا۔ اگر کسی مسلمان کے پاس خراجی زمین ہے تو صرف خراج واجب ہوگا۔ اس پر عشر واجب نہ ہوگا۔

(۶) فقہ حنفی میں کسی زمین کے عشری ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی شہر یا ملک کے باشندے اسلام قبول کر لیں جیسے مدینہ منورہ یا یمن یا پورے جزیرۃ العرب کے باشندے مسلمان ہو گئے تو ان سب کی زمینیں عشری قرار دی گئیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی غیر مسلم ملک کو فتح کر لیں اور امام المسلمین اس ملک کی فتح کی ہوئی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دے تو اس تقسیم کے بعد مسلمانوں کی مملوکہ زمینیں عشری ہوں گی۔ انہیں دو صورتوں سے یہ تیسری صورت بھی نکلی کہ عشری زمین وراثت میں ملی ہو یا کسی مسلمان نے

دوسرے مسلمان سے عشری زمین خریدی ہو تو وہ زمین بھی عشری ہوگی۔

(۷) فقہ حنفی میں کسی زمین کے خراجی ہونے کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان کسی غیر مسلم ملک کو لڑ کر فتح کریں لیکن امام المسلمین اس کی زمینیں غیر مسلم باشندوں ہی کے ہاتھوں میں رہنے دے ان کو مسلمانوں میں تقسیم نہ کرے تو ایسی تمام زمینیں خراجی ہوں گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم ملک لڑے بغیر مسلمانوں سے صلح کرے اور اس ملک کے باشندے اپنی خوشی سے ذمی بن جائیں تو ان کی زمینیں بھی خراجی ہوں گی اس لیے کہ ان دونوں صورتوں میں امام المسلمین ان زمینوں پر خراج مقرر کرے گا۔ اسی سے تیسری صورت یہ نکلے گی کہ خراجی زمین جو وراثت میں غیر مسلم کو ملی ہو یا کسی مسلمان نے کسی غیر مسلم سے خراجی زمین خریدی ہو تو وہ زمین بھی خراجی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرعاً کسی زمین کے خراجی ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے امام یا امیر یا بادشاہ نے اس پر خراج مقرر کیا ہو۔ غیر مسلم حکومت کے ٹیکس عائد کرنے سے کوئی زمین خراجی نہیں ہوتی اور نہ اس ٹیکس کو شرعی خراج کہنا صحیح ہے۔

ان سات نکتوں میں سے ہر نکتہ ثابت شدہ ہے۔ کتابوں کے حوالے اور عبارتیں پیش کرنا موجب طوالت ہے۔ اس لیے انہیں ترک کرتا ہوں۔ ان اصولی نکات کی روشنی میں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مملوکہ زمینوں کی حیثیت و نوعیت کیا ہے؟ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا تھا اور مسلمان بادشاہوں نے ان کو اس ملک کی زمینیں دی تھیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے اس ملک کی بے شمار غیر مزروعہ زمینوں کو خود آباد کیا تھا۔ تیسری بات یہ کہ مسلمانوں کے حملے کے وقت بہت سی بستیوں اور شہروں کے باشندوں نے بخوشی اسلام قبول کیا ہوگا اور ان صورتوں میں وہ زمینیں عشری ہوں گی اس لیے اگر کوئی شخص اس کا قائل ہے کہ ہندوستان کی کوئی زمین عشری نہیں ہے تو وہ فقہ حنفی کے لحاظ سے بھی ایک غلط بات کہتا ہے۔ کتاب العشر والزکوٰۃ میں مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت صوبہ بہار نے دس صورتیں ایسی شمار کرائی ہیں جن میں زمین عشری ہوتی ہے اور مسلمانوں پر عشر واجب ہوتا ہے۔ ہم ذیل میں انہیں نقل کر رہے ہیں۔

(۱) بادشاہان اسلام کے وقت سے موروثی ہیں۔ (۲) بادشاہان اسلام کے وقت سے موقوفہ ہیں۔ (۳) موروثی زمینیں ہیں گو شاہی وقت سے نہیں لیکن یہ بھی معلوم نہیں کہ کس طرح قبضہ میں آگئی ہیں۔ (۴) جو زمینیں مسلمانوں نے خریدی تھیں یا بطریق ہبہ یا بذریعہ وصیت اس کے مالک ہوئے یا جس نے فروخت کیا یا ہبہ کیا

یا وصیت کی اس نے بھی کسی مسلمان ہی سے حاصل کی تھی اسی طرح برابر سلسلہ جاری ہے۔ (۵) جو زمین مسلمانوں کے قبضہ میں مسلمانوں سے خرید و فروخت کے ذریعہ سے آئی ہیں اور اوپر جا کر یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ اسلام نے دی تھی۔ (۶) مسلمانوں کے قبضے میں وراثۃً یا خرید و فروخت کے ذریعہ سے ہے لیکن اوپر کا حال معلوم نہیں کہ پہلے لوگوں نے کس طرح حاصل کیا تھا۔ (۷) انگریزی حکومت نے بطور معافی اس زمین کو دیا جو پہلے سے مسلمان کی ملکیت تھی۔ (۸) انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو بطریق معافی زمین دی مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ زمین پہلے کس کی تھی۔ (۹) مسلمانوں نے غیر مزروعہ زمین جو کسی کے قبضہ میں نہ تھی آباد کیا ہے اور وہ عشری زمین کے قریب ہے یا آسمانی و دریائی پانی یا اپنے کنوئیں سے سیراب ہوتی ہے۔ (۱۰) مسلمانوں نے اپنے سکونتی مکانات کو مزروعہ بنایا ___ ان دسوں صورتوں میں زمین عشری ہوگی (ص ۱۴۲ طبع اول)

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مسلمانوں کی مملوکہ و مقبوضہ زمینیں جو شرعاً عشری قرار پائی ہیں وہ جب تک ان کے قبضہ میں ہیں عشری ہی رہیں گی ان میں حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا اس لیے کہ عشر کسی انسانی حکومت کا نہیں بلکہ اللہ و رسول کا مقرر کردہ حق ہے۔

یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہاں مسلمان کی جس زمین کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ پہلے وہ عشری تھی یا خراجی اس کو عشری کیوں قرار دیا جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فقہ حنفی میں بھی مسلمانوں کی مملوکہ زمین کا اصل حکم عشری ہونا ہی ہے الا یہ کہ اس کے خراجی ہونے کا کوئی ثبوت موجود ہو کیونکہ مسلمان اصلاً عشر و زکوٰۃ کا اہل ہے نہ کہ خراج کا۔ اسلامی شریعت میں خراج تو غیر مسلموں کی زمین پر لگایا جاتا ہے کیونکہ وہ عشر و زکوٰۃ کے اہل نہیں ہیں اس لیے جب تک خراجی ہونے کا ثبوت نہ ملے مسلمانوں کی مملوکہ تمام زمینیں عشری ہی سمجھی جائیں گی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہندوستان میں خراجی زمینوں کا وجود ہے؟ ہم نے ساتویں نکتے میں جو تفصیل اوپر لکھی ہے اس کے تحت اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہی ہندوستان کے کسی گوشے میں کسی خراجی زمین کا وجود باقی رہ گیا ہو کیونکہ مسلمان بادشاہوں کے وقت کا عائد کردہ خراج اب کہیں باقی نہیں ہے۔ اور یہ معلوم ہو چکا کہ موجودہ حکومت جو مال گزاری لے رہی ہے اس کو شرعی خراج نہیں کہا جا سکتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی زمینیں عشری نہیں ہیں وہ الٹی بات کہتے ہیں اس لیے کہ یہاں عشری زمینیں تو یقیناً موجود ہیں البتہ خراجی زمینوں کا وجود اب شاذ و نادر ہی کہیں ہوگا۔

مولانا نذیر الحق کی کتاب تو ہمارے پاس موجود نہیں [illegible]

زمینیں عشری نہیں ہیں۔ علماً غلطی سے اس کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے بہشتی زیور میں عشری زمین کی وہی تعریف کی گئی ہے جو میں نے اوپر چھٹے نکتہ میں لکھی ہے۔

اس ضروری تفصیل کے بعد آپ کے سوالات کے نمبروار جوابات یہ ہیں۔

۱۔ اوپر میں نے جو سات نکات لکھے ہیں اس کے چھٹے نکتہ میں اس کا جواب آگیا۔ اس کو پڑھ لیجیے۔(۲) اس کا جواب بھی پہلے دوسرے اور چوتھے نکتہ میں آچکا۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسلمان غیر اسلامی حکومت کا باشندہ بھی ہو تو اس کی اپنی مملوکہ زمین یا حکومت سے لگان (مال گزاری) پر لی ہوئی زمین کی پیداوار پر عشر واجب ہے مال گزاری دینے سے عشر ساقط نہیں ہوتا اور چونکہ عشر نکالنا فرض ہے اس لیے اس کے ادا نہ کرنے سے وہ گنہگار ہوگا۔ (۳) مجھے اس کی واقفیت نہیں ہے کہ کون سے علماء اس سے اختلاف کرتے ہیں اور ان کے دلائل کیا ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مذکورہ بالا سات نکتوں میں سے کسی ایک نکتے سے بھی کسی عالم دین کو اختلاف ہو۔ میں نے عشری اور خراجی زمین کی جو تعریف لکھی ہے وہ فقہ حنفی کی تمام اونچی اور مستند کتابوں میں موجود ہے۔ اگر کوئی حنفی عالم اس تعریف کے خلاف کوئی تعریف کرتا ہے تو وہ اس کی اپنی تعریف ہوگی۔ فقہ حنفی کی تعریف نہ ہوگی۔

(۴) مجھے نہیں معلوم کہ اختلاف کون کرتا ہے اور وہ عشری زمین کی کیا تعریف کرتا ہے۔ فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں وہی تعریف لکھی ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عشر و زکوٰۃ سے بچنے کے لیے کسی عالم کے اختلاف کا سہارا لینا مسلمان کو زیب نہیں دیتا اس کو یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن، احادیث اور فقہ کی مستند کتابوں سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ عشر و زکوٰۃ اللہ کی فرض کی ہوئی عبادت ہے اس سے پہلوتہی کرنا آخرت میں تو نقصان دہ ہے ہی، دنیا میں بھی مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

(سید احمد قادری)

تشدد کی کالی گھٹا خوں چکاں ہے

۵ رجون ۶۸ء کو ہندوستانی وقت سے تقریباً ایک بجے دن کو لاس انجلس میں سینٹر رابرٹ ایف کینیڈی پر مہلک گولیاں چلائی گئیں اور چند گھنٹوں میں خبر تمام دنیا میں پھیل گئی اور ۲۵ گھنٹوں کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کو بچانے کی ہر سعی ناکام ہو گئی۔ دو ایک دن تک دنیا کے ریڈیو اسی خبر اور اس کی تفصیلات سے گونجتے رہے اور بڑے بڑے اخبارات بھرے رہے۔ وہ امریکہ کی صدارت کے امیدوار تھے اور کیلی فورنیا کے ابتدائی الکشن میں انھوں نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ ایمبیسڈر ہوٹل میں جشن مسرت منایا جا رہا تھا لیکن چند لمحوں میں جہاں جشن منایا جا رہا تھا وہاں صف ماتم بچھ گئی اور اس ماتم میں دنیا بھر کے لوگ شریک ہو گئے۔ اس لیے کہ ان کی موت مظلومانہ تھی۔ ایک ظالم نے اپنی گولیوں سے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ ان کی عمر ۴۲ سال تھی اور ان پر شاعر کا یہ مصرع چسپاں ہوتا ہے

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد

اور اس "جواں مُرد" کے ساتھ ہی یہ بھی ملا لیجیے کہ وہ جواں مَرد بھی تھے۔ امریکہ کے موجودہ حالات میں اپنے آپ کو صدارت کے لیے پیش کرنا رابرٹ کینیڈی کی جواں مردی اور بہادری کی دلیل ہے۔ تقریباً ساڑھے چار سال پہلے ان کے بڑے بھائی جان ایف کینیڈی (سابق صدر امریکہ) ڈیلاس میں گولیوں کا شکار بنائے گئے تھے اور چند ماہ پہلے مارٹن لوتھر کنگ کو ممفس میں گولی ماری گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس خونریزی کے محرکات کیا ہیں اور اس کے پیچھے کس ذہن کے لوگ ہیں۔ اخبارات میں یہ بات بھی آئی ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بھی تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ کسی وقت بھی ان پر حملہ ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ان کا اپنے خیالات پر نہ صرف جمے رہنا بلکہ ان خیالات کو بروئے کار لانے اور امریکی سماج کو اپنے پسندیدہ رخ پر لے جانے کے لیے صدارت کا امیدوار بننا اور اس کے لیے سرگرم اور پرجوش مہم چلانا ایک جواں مردی اور بہادری کا ثبوت

نہیں ہے۔ انہیں جو اندیشہ تھا وہ پیش آ ہی گیا۔ مجرموں نے انہیں اپنے راستے سے ہٹا دیا لیکن امریکہ کی تاریخ انہیں بھلا نہیں سکے گی۔ ایسے ہی جواں مرد افراد اپنے وطن اور اپنے معاشرے کے جوہر اور محسن ہوتے ہیں۔ انہیں کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ قوم و وطن کی اصلاح کے لیے قدم بڑھائیں۔ ایسے افراد کی موت، موت نہیں ہوتی بلکہ ایک تازہ زندگی کی علامت بن جاتی ہے۔

امریکہ میں سیاسی تشدد اور سیاسی قتل و خون کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس ملک کے چار صدر اب تک قتل کیے جا چکے ہیں اور صدر روزویلٹ بھی قاتل کی گولی سے بال بال بچے تھے اس کا نشانہ چوک گیا تھا اور ان کی جگہ شکاگو کے میئر کی جان گئی تھی۔ وہاں کے نمایاں اور ممتاز افراد بھی قتل کیے جاتے رہے ہیں۔ البتہ وہاں کی تاریخ کا شاید یہ نیا حادثہ ہے کہ صدارت کے محض ایک امیدوار کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ عجیب اتفاق ہے کہ موجودہ صدر امریکہ نے اپنی صدارت کا دور جان ایف کینیڈی کے قتل کے بعد شروع کیا تھا اور ان کے دورِ صدارت کا خاتمہ رابرٹ ایف کینیڈی کے قتل کے بعد ہو رہا ہے۔ سال سے پہلے کے صدر کینیڈی کا قتل آج تک معمہ بنا ہے اور شاید رابرٹ کینیڈی کا قتل بھی ایک معمہ بن جائے۔ چنانچہ اس کو معمہ بنانے کی کارروائی قتل کے ساتھ ساتھ شروع بھی ہو چکی ہے۔ ۶ رجون کو لاس اینجلیس کے میئر مسٹر سام یورٹی نے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا ہے کہ قاتل سرحان کے گھر سے ایک نوٹ بک ملی ہے جس میں بظاہر قاتل ہی نے یہ لکھا ہے کہ رابرٹ کینیڈی کو ۵ رجون سے پہلے قتل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ نوٹ بک میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہیں۔ اس میں آرتھر گولڈبرگ کا نام بھی درج ہے۔ اس میں مقتول کینیڈی کے بہت سے جملے نقل کیے گئے ہیں سب سے زیادہ صاف بات جو اس میں ملتی ہے وہ یہی ہے کہ ۵ رجون سے پہلے سینیٹر کینیڈی کو قتل کرنا ضروری ہے۔ — کہا جا رہا ہے کہ قاتل اردن کا ایک عیسائی باشندہ ہے جو چند سال پہلے امریکہ کا شہری بن گیا تھا اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ قاتل کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ میں نے یہ قتل اپنے اصلی وطن کی خاطر کیا ہے۔ اس کو یہودیوں کے مقابلہ میں عربوں کا حامی قرار دیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ مقتول نے الکشن کی مہم میں اسرائیل کی حمایت میں جو تقریریں کی تھیں ان کی وجہ سے قاتل بہت غضب ناک تھا اور جب انھوں نے اسرائیل کے ہاتھ پچاس فینٹم جیٹ فروخت کرنے کی تائید کر دی تو اس کا غصہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ — یہ پوری کہانی شاید اعلیٰ درجہ کے دانشوروں کی سمجھ میں آ جائے مجھ جیسے کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

یہ جنون کی کون سی قسم ہوئی کہ اسرائیل کے ہاتھ مذکورہ جٹ فروخت کرنے کی پالیسی بنانے والے اور اس کو منظور کرنے والے تو اس کی گولیوں سے محفوظ رہیں اور انہیں اس پالیسی کی تائید کرنے والے کے لیے بچا رکھا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عربوں کی شکست کو ایک سال گزر گیا اور اس شکست کے امریکی ذمہ دار دندناتے رہے لیکن عربوں کا حمایتی سرحان خاموش اور غیر متحرک رہا اور جیسے ہی اس کا اندیشہ محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں سینیٹر رابرٹ کینیڈی صدارتی انتخاب میں کامیاب نہ ہو جائیں، عربوں کی حمایت کا جذبہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ اخبار میں شائع شدہ اس لطیفے کو بھی ملا لیجیے کہ قاتلانہ حملے کے بعد فوراً ۵ رجون ہی کو امریکہ کے وزیر انصاف مسٹر ریمزے کلارک نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ موجودہ معلومات کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سینیٹر کینیڈی کو قتل کرنے کی کوئی سازش نہ تھی اور یہ ایک انفرادی فعل تھا۔ (قومی آواز ۷ رجون ۶۸ء)

اب وزیر انصاف سے کون پوچھے کہ جناب کو اس اعلان کی اتنی جلدی کیوں تھی اور یہ انصاف کی کون سی قسم ہے کہ ابھی مجرم پر فرد جرم عائد بھی نہیں کی گئی اور آپ نے اس کو ایک انفرادی فعل قرار دے دیا۔ یہ تمام باتیں اس قتل کو معمہ بنانے اور لوگوں کے ذہن کو غلط رخ پر موڑنے کی کوشش ہی معلوم ہوتی ہیں۔

امریکہ کی موجودہ حکومت نے اپنے ملک کے روایتی سیاسی تشدد کو اس حد پر پہنچا دیا ہے اور اس کی خوں چکانی اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہاں کے باشندے سنبھل کر اس کا کوئی عملی علاج ڈھونڈیں گے یا وہاں کا معاشرہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔ توقع یہی کرنی چاہیے کہ کینیڈی خاندان کے ان دو ممتاز ترین افراد اور مارٹن لوتھر کنگ کا خون رائگاں نہ ہوگا اور وہاں کے باشندے اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوں گے۔

تشدد کے سیاہ ابر کی یہ خوں چکانی و آتش فشانی امریکہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں بھی یہی آگ برس رہی ہے۔ وہاں اس کا اصل نشانہ نیگرو ہیں اور یہاں مسلمان ہیں اور اب اس کا سلسلہ ہریجنوں تک دراز ہو چکا ہے۔ فرق یہ ہے کہ امریکہ میں گوری نسل کے ممتاز افراد کا ایک طبقہ نسل پرستی اور رنگ و دشمنی کی پالیسی کے خلاف میدان میں اتر آیا ہے، اس لیے گوری نسل کے افراد بھی نسل پرستوں کی گولیوں کا نشانہ بننے لگے ہیں اور ہندوستان میں ابھی اونچی ذات کا کوئی ایک ممتاز شخص بھی یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوا ہے۔ گاندھی جی کے بعد یہ جگہ اب تک خالی پڑی ہے اس لیے ابھی اس تشدد کا نشانہ صرف مسلمان اور ہریجن ہیں۔ اگر اونچی ذات کے کچھ ذی اثر اور طاقت ور افراد اس کے خلاف میدان میں آ گئے تو

تنقید و تبصرہ

تفسیر تقریب القرآن مولانا عبدالوہاب خاں رام پوری صفحات ۴۰۰ کاغذ، کتابت، طباعت
اَلْفَاتِحَۃُ وَالْبَقَرَۃ عمدہ، قیمت مجلد دسٹ کور کے ساتھ پانچ روپیہ ملنے کا پتہ مجاہد الملک
دو محلہ روڈ۔ رام پور۔ یو۔ پی۔

محترم و مکرم مولانا عبدالوہاب خاں صاحب ادام اللہ بقائہ، اس وقت رام پور کے متبحر اور متقی علما میں بہت اونچے مقام پر فائز ہیں اور یہاں کی چند گنی چنی شخصیتوں میں سے ایک اہم شخصیت ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی محترم مولانا عبدالسلام صاحب پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور اپنی ذہانت اور علم و فضل میں بہت نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں وہ قابل استفادہ حد تک انگریزی زبان سے بھی واقف ہیں۔ زیر تبصرہ تفسیر مولانا عبدالوہاب صاحب کے نام سے شائع ہوئی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ در اصل اس کے مرتب مولانا عبدالسلام صاحب ہیں، پیش لفظ میں انہوں نے اس کتاب کو اپنی اور مولانا عبدالوہاب صاحب کی مشترکہ کوشش قرار دیا ہے لیکن اس میں مولانا موصوف کا اشتراک صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو تفسیری معلومات اور مواد اکٹھا کیا تھا مولانا عبدالسلام نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا عبدالوہاب صاحب کی لکھی ہوئی تفسیر کے بعض حصے راقم الحروف نے بھی پڑھے تھے وہ ایک ایسی تفسیر تھی جس سے عوام و خواص دونوں استفادہ کر سکتے تھے اور اب ترتیب جدید کے بعد عصر حاضر کے ہم پلہ ہو گئی ہے۔ اس تفسیر میں مولانا عبدالسلام صاحب نے اپنی ذہانت، فلسفہ، اپنی ادبیت کا سرمایہ بالخصوص ان کے لکھے ہوئے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بنیادی تصورات پر نہایت [illegible] [illegible]

فلسفیانہ افکار سے واقف اہلِ علم اس کو پڑھ کر یقیناً فاضل مرتب کی اونچی صلاحیت کا اعتراف کریں گے البتہ بہت سے ذہنوں میں یہ سوال ضرور اٹھے گا کہ ان کے متعدد آراء و افکار قرآنی افکار سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں؟ راقم الحروف نے مدرسہ میں فلسفہ اور منطق کی متعدد کتابیں سبقاً سبقاً پڑھی ہیں لیکن طبیعت کو اس سے مناسبت کبھی پیدا نہیں ہوئی اور نہ آج تک اس خیال میں فرق آیا کہ فلسفے سے کانٹے تو ملتے ہیں لیکن اس سے ایمان و یقین کے پھول دستیاب نہیں ہوتے۔ اس تفسیر میں یہ مناسب اور اچھا طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ فاضل مرتب نے جہاں جہاں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا ہے ان میں سے اکثر مقامات پر وجوہِ اختلاف بھی لکھے ہیں اور جمہور کی رائیں بھی نقل کر دی ہیں۔ اس طرح ان کی رائے قابلِ غور و فکر انگیز بن گئی ہے۔ قلتِ فرصت کی وجہ سے پوری کتاب نہیں پڑھی جا سکی ہے لیکن جو مباحث پڑھے ہیں ان میں متعدد ایسے بھی ہیں جن سے تبصرہ نگار اتفاق نہیں کر سکا اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مرتب کو ان کی طرف متوجہ کیا جائے۔ (۱) فاضل مرتب نے اپنے ایک اہم ذیلی حاشیہ کا عنوان "ہدایت کے اقسام اور نبوت کا ذریعۂ علم" مقرر کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت صفحہ ۲۲ پر انہوں نے "ہدایتِ نبوت" یا "ہدایتِ وحی" کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر طبیعت میں توحش پیدا ہوتا ہے، اس کو پڑھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ فاضل مرتب کے نزدیک نبوت اور وحی، انسان کے "خلقی وجدان" "داخلی شعور" اور "باطنی فعالیت" کی ایک قوی اور ترقی یافتہ صنف ہے جو مختلف قوموں کے برگزیدہ افراد میں پائی جاتی رہی ہے اور اسی قوی صنف سے پھوٹنے والے احساسات اور اس سے نکلنے والی تعلیمات، ہدایت کی وہ تعبیری صورت ہے جس کو ہدایتِ نبوت یا ہدایتِ وحی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر فاضل مرتب کی تحریر سمجھنے میں، مَیں نے غلطی نہیں کی ہے تو اس سے ہر راسخ العقیدہ مسلمان متوحش ہوگا، سوال یہ ہے کہ قرآن جس کی تفسیر وہ لکھ رہے ہیں اپنے الفاظ کے ساتھ، جبریل امین کے ذریعہ سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، یا نہیں اور یہ اللہ کا کلام ہے، یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ہدایتِ نبوت یا ہدایتِ وحی کو صرف انسان کی قوی اور ترقی یافتہ باطنی قوت کا ثمرہ قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح، تورات، انجیل، زبور اور چند دوسری کتابوں کو ہم اللہ کی کتابیں اس لئے کہتے ہیں کہ انھیں اللہ نے نازل کیا تھا وہ کسی انسان کے داخلی شعور کا نتیجہ نہ تھیں، اور جہاں تک وحی خفی یا وحی غیر متلو کا تعلق ہے تو وہ بھی اللہ ہی کی القا کردہ ہدایت تھی، نبی کے اپنے داخلی شعور اور خلقی وجدان کا اس میں بھی دخل نہ تھا، فرق صرف یہ تھا وحی جلی یا کتابیں الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھیں، اور وحی خفی میں معانی نازل ہوتے تھے

جس کو نبی نے اپنی زبان میں اور اپنے الفاظ میں ادا کر دیا تھا کتاب و سنت سے یہیں وحی انبیاء کی حقیقت بھی بتائی اور سکھائی ہے۔ فاضل مرتب نے جو توجیہ کی ہے وہ فلسفہ اور اشراق کی توجیہ ہے، کتاب و سنت کی توجیہ نہیں ہے میں نے فاضل مرتب سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا، ان کا بیان یہی تھا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نبوت و وحی کی محض فلسفیانہ توجیہ ہے ان کا اپنا خیال اور عقیدہ نہیں ہے اور اس کا اشارہ ان کے حاشیے میں بھی موجود ہے۔ انہوں نے اس بحث کو ختم کرتے ہوئے اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ کی آیت کا حوالہ دیا ہے میں نے ان سے عرض کیا ہے کہ طبع ثانی میں اس کی صراحت کر دینی چاہیے کہ یہ نبوت و وحی کی محض فلسفیانہ توجیہ ہے تاکہ پڑھنے والے کو یہ شبہ نہ ہو کہ نبوت اور وحی کے بارے میں یہ خود ان کا اپنا خیال اور عقیدہ ہے۔ (۲) ص ۱۹ پر "بے شرک عبادت" کے تحت متن میں جو تشریح کی گئی ہے اور "عبادت" پر جو حاشیہ لکھا گیا ہے ان دونوں میں پوری ہم آہنگی محسوس نہیں ہوئی، متن میں اللہ کی پرستش اور اس کی ہدایتوں کی تعمیل دونوں کو عبادت میں داخل مانا گیا ہے اور حاشیہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ عبادت کے معنی صرف پرستش کے ہیں حالانکہ قرآن میں اللہ کی اطاعت کے علی الرغم غیر اللہ کی اطاعت کو بھی عبادت کہا گیا ہے اس کے علاوہ صفحہ ۲ کے حاشیے میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ غیر اللہ کے لیے کبھی کسی شریعت میں سجدہ کا جواز تھا نہیں نہ تعظیمی نہ غیر تعظیمی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبادت اور پرستاری اس نیاز مندی کا نام ہے جو کسی کو فوق الادراک اور ماوراء الحواس اقتدار کا مالک سمجھکر اختیار کی جائے تو پھر فرشتوں کا حضرت آدم کو سجدہ کرنا، یا برادران یوسف کا حضرت یوسف کو سجدہ کرنا کیوں ناجائز سمجھا جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ فرشتے حضرت آدم کو فوق الادراک اقتدار کا مالک سمجھتے تھے اور نہ برادران یوسف اپنے بھائی کو۔ (۳) تفسیر سورہ بقرہ کی تمہید میں لکھا گیا ہے کہ :-

"مکہ معظمہ میں دعوت و تبلیغ اور قبول کرنے والوں کی تربیت تک محدود تھی لیکن مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے ساتھ ہی ایک اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑ گئی اور نئے مسائل سامنے آنے لگے اس لئے وہاں اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کے اصول بھی نازل فرمائے پھر ہجرت کے بعد اسلام و کفر کی آویزش نے ایک نئی صورت اختیار کر لی، اس نئی صورت حال کی رعایت سے ہدایات اور احکام کا انداز بھی بدل گیا"

صحیح بات یہ ہے کہ سیاست، تمدن، معاشرت اور معیشت کے اصول مکہ ہی میں نازل ہوئے تھے، مدینہ

میں ان اصول کی تفصیلات نازل کی گئیں۔ موجودہ دور کے علم سیاست میں بھی، حتیٰ کہ اس کی بحث ایک بنیادی بحث ہے، مجھے [illegible]
ہے اور سیاست کی گاڑی اس وقت تک آگے نہیں بڑھتی جب تک متعین نہ ہو جائے کہ حاکم اعلیٰ کون ہے۔ اسلامی
سیاست میں حاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے وہی تکوینی حاکم بھی ہے اور تشریعی حاکم بھی اور اسلامی سیاست کا یہ بنیادی اصول
کی سورتوں میں اتنی دفعہ نازل کیا گیا ہے کہ ان کو شمار کرنے کے لئے بھی وقت چاہیے۔ میں نے فاضل مرتب سے زبانی عرض
کیا تو انہوں نے کہا کہ میری مراد بھی یہی ہے کہ سیاست، تمدن، معاشرت اور معیشت کے اصولوں کی تفصیلات مدینہ میں
نازل ہوئیں لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ ان کی عبارت پڑھیں گے اور اس سے یہ مراد واضح نہیں ہوتی اور جو لوگ قرآن
سمجھ کر نہیں پڑھتے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے۔

(۴۵) صفحہ ۱۷۱ پر "جہاد" کے سلسلے میں جو لمبا حاشیہ تین صفحات تک چلا گیا ہے وہ بحیثیت مجموعی صحیح نہیں ہے
اس کے تمام اجزاء پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں، فاضل حاشیہ نگار کی خدمت میں محض اشارۃً چند باتیں عرض ہیں۔
جہاد و قتال پر مستشرقین اور پادریوں کے جاہلانہ اعتراضات کے جواب میں "دفاعی جہاد" کے معذرت خواہانہ چٹکلے کو اب
اس زمانے میں دہرانے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے ـــ امارت و حکومت کا حصول بلاشبہ اللہ کا فضل اور اس کا
انعام ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ انعام کسی سعی تحصیل کے بغیر مل جاتا ہے یا اس کے لئے جد و جہد بھی کرنی پڑتی ہے؟ جنت کا حصول
بھی اللہ کا فضل اور اس کا انعام ہی ہے تو کیا اس کے حصول کے لئے جد و جہد ضروری نہیں ہے؟ کیا وہ کوشش کے
بغیر ہی حاصل ہو جائے گی؟ امارت و حکومت کو اللہ کا انعام سمجھنے والا کوئی شخص اس سوال کا جواب نہیں دیتا ـــ
تمام اصولیین اور علمائے امت حکومت کو اسلام کے تمام احکام پر عمل کرنے اور قرآن کے تمام قوانین کی تنفیذ کے لئے
موقوف علیہ قرار دیتے ہیں اور کسی موقوف علیہ کو حاصل کرنے کی کوشش، موٹی عقل کے نزدیک بھی ایک ضروری چیز ہے
ـــ بے شک حکومت مقصود بالذات نہیں ہے لیکن وہ مقصود بالذات کی موقوف علیہ ہے اور اسی حیثیت سے اس کے
حصول کی جد و جہد ضروری قرار دی گئی ہے اور اسی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں سلطان نصیر کی دعا
مانگی تھی بلکہ خود اللہ نے ان سے یہ دعا کرائی تھی۔ حکومت کی مقصودیت کی نفی کے ساتھ اس کے موقوف علیہ ہونے کا
اثبات بھی ضروری ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے کہ اس کی مقصودیت کی پورے زور سے نفی کی جائے لیکن اس کے
موقوف علیہ ہونے کی طرف اشارہ بھی نہ کیا جائے ـــ اب قیامت تک دنیا بھر کے مسلمان قرآن کے شخصی و
اجتماعی تمام احکام و قوانین کے مخاطب ہیں، جہاں ان کی حکومت قائم ہے وہاں ان تمام قوانین کی عملاً تنفیذ
ان پر واجب ہے اور جہاں ان کی حکومت قائم نہیں ہے وہاں ان پر اس موقوف علیہ کے حصول کی جد و جہد

تاکہ قرآن کے تمام قوانین نافذ ہو سکیں۔ مکی زندگی اس معنے میں تو واپس آ سکتی ہے کہ کسی ملک میں مسلمان آباد ہوں اور وہاں اسلامی حکومت موجود نہ ہو لیکن اس معنے میں کبھی واپس نہیں آسکتی کہ مسلمان صرف انہیں احکام کے مخاطب رہ جائیں جو مکہ میں نازل ہوئے تھے۔ مکہ میں تو ارکان اربعہ میں سے بھی صرف نماز فرض ہوئی تھی وہاں نہ متعین زکوٰۃ فرض ہوئی تھی نہ رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے اور نہ حج۔ کیا قرآن پر ایمان رکھنے والا کوئی مسلمان یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ جہاں اسلامی حکومت قائم نہ ہو وہاں کے مسلمانوں سے زکوٰۃ، حج اور روزے ساقط ہو جائیں گے؟ اب اس زمانے میں مکی زندگی کا حوالہ دینے والے حضرات معلوم نہیں کس دلیل شرعی کی بنا پر قرآنی احکام کے درمیان یہ فرق کرتے ہیں کہ بعض احکام کا مکی زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کو مخاطب اور پابند قرار دیتے ہیں اور بعض احکام سے انہیں ایسی مکمل آزادی عطا فرماتے ہیں کہ وہ ان احکام کے مخاطب ہی باقی نہیں رہتے۔ ہم اس تفریق کو بالکل من گھڑت اور انتہائی غلط سمجھتے ہیں اس کے علاوہ قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ اقامت دین کا حکم مکہ ہی میں نازل ہوا تھا اس لیے مکی زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں سے اقامت دین کی جد وجہد ساقط کرنے کا قول مجرد دعوے کے سوا اور کیا ہے؟ ——— یہ محض فرضی ہی نہیں بلکہ عملاً ناممکن ہے کہ کسی ملک میں اسلامی حکومت تو نافذ نہ ہو مگر وہاں ایمان و عمل آزاد اور قرآن کے قوانین معدلت نافذ ہوں۔

(۵) ص۵۳ پر حاشیے میں نسخ احکام پر فاضل مرتب نے جس سرسری انداز میں گفتگو کی ہے یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں ہے۔ تمام اہل سنت وقوع نسخ کے قائل ہیں نہ کہ صرف جواز نسخ کے۔ اس کا انکار ابو مسلم اصفہانی معتزلی نے کیا ہے اور ان کے انکار کو ابن کثیر نے مردود و مرذول قرار دیا ہے۔ راقم الحروف نے مولانا عبدالصمد حقانی کی کتاب "قرآن محکم" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مقالہ ماہنامہ زندگی دسمبر ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔ فاضل مرتب سے عرض ہے کہ وہ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں اس مسئلے پر میں اس سے زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔

(۶) حضرت آدمؑ کی خلافت اور تعلیم اسماء والی آیتوں کی تفسیر میں ص۵۸ پر ایک مختصر حاشیہ ہے۔ اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ فرشتوں کو حضرت آدمؑ کی خلافت کی خبر دینے کا واقعہ ان کی تخلیق و تعلیم کے بہت بعد کا ہے۔ یہ بات چونکہ میرے لیے نئی تھی اس لیے میں نے فاضل مرتب سے اس کا ماخذ دریافت کیا۔ انھوں نے مسودہ دیکھنے کے بعد یہ جواب دیا کہ عبارت میں سہو کتابت ہے۔ "بہت قبل" کے بجائے "بہت بعد" چھپ گیا ہے۔ اس تصحیح کے بعد بھی اس مختصر حاشیے کا مقصد واضح نہیں ہوا۔ طبع ثانی میں اس حاشیے کو واضح کر دینا چاہیے۔

(۷) آیت صوم میں "أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" کے ٹکڑے کی تفسیر پر ایک حاشیہ صلا پر لکھا گیا ہے کہ "متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنتی کے کچھ روزے جو فرض کیے گئے تھے رمضان کے روزوں کے فرض ہونے سے پہلے کی بات ہے"۔ ان متعدد روایتوں کے لیے کتاب کا حوالہ ضرور دینا چاہیے تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے اب تک کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں گزری جس میں یہ کہا گیا ہو کہ "أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" سے مراد گنتی کے وہ چند روزے ہیں جو رمضان کے روزوں سے پہلے فرض کیے گئے تھے۔ اس کے برعکس روایتوں میں یہ ہے کہ حضور جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے یوم عاشوراء اور ایام بیض کے روزوں کا حکم دیا اور جب آیت صوم يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ سے إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ تک آیتیں نازل ہوئیں تو عاشوراء اور ایام بیض کے روزے ضروری نہ رہے۔

(۸) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کی تفسیر پر ایک حاشیہ ہے۔ اس میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے حوالے سے یہ توجیہ کی گئی ہے کہ "ایام معدودات" سے ایام بیض اور عاشوراء کے روزے مراد لیے جائیں۔ میرے سوال پر فاضل مرتب نے کہا کہ حضرت شاہ انور کشمیریؒ کی یہی رائے ہے اور عنایت فرما کر انھوں نے مجھے شاہ صاحب کی شرح بخاری دکھائی۔ کتاب الصوم میں شاہ صاحب نے اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ ادب کے ساتھ عرض ہے کہ علامہ شاہ انور کشمیریؒ کا استدلال راقم الحروف کے نزدیک صحیح نہیں لیکن تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ روح المعانی وغیرہ سے بھی معلوم ہوا کہ پہلے بھی کچھ لوگ ایام معدودات سے ایام بیض اور عاشوراء کے روزے مراد لیتے رہے ہیں۔ اس لیے یہ رائے بالکل منفرد نہیں ہے مگر اس مسئلے میں وہی رائے صحیح ہے جو اکثر محققین کی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ راقم الحروف یہ کتاب بالاستیعاب نہیں پڑھ سکا ہے جو حصے مطالعہ میں آئے تھے ان کی چند قابل توجہ باتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ باقی رہی تفسیر آیات میں فاضل مرتب کے تفردات کی بات، یعنی کسی آیت کی ایسی تفسیر و تاویل جو عام طور پر مفسرین نے نہیں کی ہے تو اس کے بارے میں صحیح روش یہ ہے کہ اگر وہ تفسیر و تاویل، قواعد زبان، ترکیب کلام، محاورات، صحیح احادیث اور اسلام کے کسی ثابت شدہ عقیدہ و عمل کے خلاف نہیں ہے تو اسے قابل اعتراض نہیں قرار دینا چاہیے۔ میں نے تقریب القرآن میں جو تفردات کو پڑھا ہے وہ مجھے قابل اعتراض نظر نہیں آئے —— جو مباحث نظر ثانی کے لائق ہیں ان کو چھوڑ کر مجھے اس تفسیر میں بہت سے مباحث نہایت عالمانہ، ادیبانہ، بلند اور تسلی بخش نظر آئے اور انہیں پڑھ کر مسرت حاصل ہوئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک اعلیٰ درجہ کی تفسیر اور خواص اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵۶)

کون کہہ سکتا ہے کہ اس تشدد کا سلسلہ ان تک دراز نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے گاندھی جی کو نہ بخشا وہ دوسروں کو کیوں بخشیں گے۔ سنگھ اس اس جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا کی تشدد پسندی پر روک نہ لگائی گئی تو ہندوستانی معاشرہ بھی پارہ پارہ ہو کر رہے گا اور اس کے اثر بد سے اونچی ذات کے ہندو بھی نہ بچ سکیں گے۔ اب اس زمانے میں تو یہ تصور کامیاب ہو سکتا ہے کہ شودر غلامی ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور نہ مسلمانوں کو ملیچھ قرار دے کر انہیں تو برہمنوں کے ماتحت رکھنے کی اسکیم سپھل ہو سکتی ہے اس لیے اس حقیقت کو مان لینا چاہیے کہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور کسی نسل کو دوسری نسل پر حاکمانہ برتری حاصل نہیں ہے۔ اس حقیقت کو مانے بغیر ہندوستان کو زوال سے بچایا نہیں جا سکے گا۔ ہم سب ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں حقیقت یہی ہے اس کے علاوہ ہر تصور محض وہم ہے۔

مدیر ۹ جون ۶۸ء

(بقیہ اشارات)

لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ (اس فیصلے کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے۔ کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے۔ جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا؟ وہ جواب دیں گے "ہاں آئے تھے مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔ کہا جائے گا داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں۔ یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لیے ـــــ اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے" اور وہ کہیں گے۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ وعدہ سچا کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ـــــ اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے

درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب العالمین کے لیے

(الزمر آیت ۶۹ تا ۷۵)

توحید رسالت اور آخرت کی جو انتہائی مختصر تشریح پیش کی گئی ہے وہ بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ اسلام صحیح معنی میں کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک جامع دستور اور مکمل نظام ہے۔ یہ ایک انقلابی تحریک ہے جو حیات انسانی کو اس نقشے پر تعمیر کرتی ہے جو اللہ تعالے نے عطا فرمایا ہے اور اس نظام کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظام سرمایہ داری اور نظام اشتراکیت کی افراط و تفریط نہیں پائی جاتی بلکہ یہ ایک نہایت مکمل اور معتدل اجتماعی نظام ہے۔ یہ فرد اور اجتماع دونوں ہی کا حق پہچانتا ہے اور دونوں کو اپنی حد کے اندر رکھتا ہے۔ یہ جسم اور روح دونوں ہی کے مطالبات کا تسلی بخش جواب ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آخرت کی کامیابی اور سرخ روئی تمام تر صرف اسی دین سے وابستہ ہے۔ کوئی دوسرا دین آخرت میں انسان کو کامیاب نہیں کر سکتا۔ کوئی مانے یا نہ مانے قیامت آکر رہے گی اور آخرت کا دور شروع ہو کر رہے گا۔ وہاں کی کامیابی بھی ابدی ہے اور ناکامی بھی ابدی۔ آخرت کی نجات اور فلاح ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے وہاں ہر شخص سے الگ الگ سوال اور محاسبہ کیا جائے گا اور فیصلہ بھی ہر ایک کا الگ الگ ہی ہو گا۔ دین اسلام کو سمجھنے اس پر عمل کرنے اس کو پھیلانے اور قائم کرنے کی جدوجہد کا محرک اور مقصد اصلی یہی ہے کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی سرخ روئی حاصل ہو۔

خوش قسمت ہیں وہ افراد جو اپنی نوجوانی کی عمر میں اس کی توفیق پائیں اور احیائے دین کی جدوجہد میں لگ جائیں۔ امت مسلمہ کا مستقبل خوش اطوار و نیک کردار نوجوانوں ہی سے وابستہ ہے۔

اگست ۶۸ء

اقامتِ دین کا داعی

ماہنامہ

رامپور

سالانہ آٹھ روپیے

فی پرچہ ۸۰ پیسے

... English Literature

Glorious Quran
(An explanatory Translation by Pick thall 7-50)

Islam the Misunderstood religion.
By Mohammed Qutub 6/-

3. The Meaning of the Quran By Abulala Maududi 6-

4. Spirit & Matter Reconciled
By Late Saiyed Amin Ahmed 2-00

5. Towards understanding Islam By Syed Abulala 3-50

6. Presidential Address „ „ „ 0-[illegible]

7. Nationalism and India „ „ „ 0-75

8. Political theory of Islam „ „ „ 0-75

9. Process of Islamic Revolution „ „ „ 0-75

10. Economic Problem of Men and
Its Islamie Salution „ „ „ 0-75

11. Ethical View Point of Islam „ „ „ 0-75

12. Convocation Address „ „ „ 0-31

Sick Nations of Modern Age „ „ „ 0-3[illegible]

Marxism or Islam By Mazharuddin Siddiqi 5

After Secularism What „ „ „ 0-7[illegible]

What Is Islam „ „ „ 1-50

...:

MAKTABA 'ZINDGI' 'KANTI'
RAMPUR (U.P.)

سالانہ چندہ
بیرونی ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۱۴ شلنگ

زندگی

مدیر: سید احمد قادری

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ... ۸/
پاکستان سے — ۸/
ششماہی
ہندوستان سے ۴/
پاکستان ۴/
فی پرچہ ستر پیسے

جلد: ۴۱ | جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ مطابق اگست ۱۹۶۸ء | شمارہ: ۲

اس دائرے میں ○ سُرخ نشان کا مطلب یہ ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگئی ہے براہ کرم آیندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے اس مہینے میں چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو ان شاء اللہ اگلا پرچہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر ماہنامہ زندگی رام پور یوپی

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر: سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احمد حسن۔ مطبع۔ روہیلا پرنٹرس خاص روڈ۔ رامپور۔ یوپی
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی۔ رام پور۔ یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

۲۰/۲۱/۲۲ جون ۶۸ء کو سری نگر کشمیر میں قومی یک جہتی کونسل کی سہ روزہ کانفرنس نے جو "اعلان" شائع کیا ہے اس کے متن کا اردو ترجمہ یہ ہے

"ہماری قومی زندگی کی بنیاد عام شہریت، ہمہ رنگی میں یک رنگی، مذہبی آزادی، سیکولرزم، مساوات سماجی، سیاسی اور معاشی انصاف اور تمام فرقوں کے درمیان اخوت و برادری پر ہے۔ قومی یک جہتی کونسل ایک مرتبہ پھر اظہار کرتی ہے اور اس کے حصول کا عہد کرتی ہے۔

بہرحال قومی یک جہتی کونسل کو اس بات پر تشویش ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں فرقہ وارانہ واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ کونسل اس بات پر زور دیتی ہے کہ فرقہ وارانہ یا انتشاری تصادمات کے باوجود عوام کی بھاری اکثریت خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، امن و آشتی سے رہتی ہے اور اس کو تشدد و ہنگامہ آرائی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

قومی یک جہتی کونسل ان تمام رجحانات کی مذمت کرتی ہے جو قومی اتحاد کی جڑ کاٹیں اور تمام سیاسی پارٹیوں، رضاکارانہ تنظیموں، دوسرے شہری گروپوں، اخبارات، صاحب الرائے حضرات، غرض کہ تمام نیک خواہ افراد سے اپیل کرتی ہے کہ وہ (ا) فرقہ وارانہ نفرت اور علاقائی دشمنیوں کی ہمت افزائی نہ کرکے اور سماج کے بے راہ عناصر کو تشدد کے راستے سے ہٹا کر (ب) سرگرمی سے ان اصولوں خصوصاً مروت و رواداری اور ہم آہنگی کے اصول کی جو قوم کا مقصد ہے، تبلیغ کرکے (س) قومی اتحاد کے لیے سماج کی تعمیری قوتوں کو بروئے کار لا کر، ان کو لیڈرشپ، حوصلہ اور آواز دے کر اور (د) برادرانہ جذبات پیدا کرنے والی سرگرمیاں اور پروگرام شروع کرکے، مشترک شہریت کے حقوق پر زور دے کر اور عام طور

سے قومی زندگی کا معیار بلند کرکے ان رجحانات کو روکیں

کونسل اس بات پر زور دینا چاہتی ہے کہ یہ کام صرف حکومت کا نہیں ہے ۔ اگرچہ حکومت کو اتحاد کی قوتیں مضبوط کرنے اور کونسل کی سفارشات پر جلد از جلد اور موثر طور پر عمل درآمد کرنے میں بڑا کام انجام دینا ہے ۔ یہ کام تمام شہریوں، سیاست دانوں، معلموں، دانشوروں، تاجروں اور ٹریڈ یونین لیڈروں کی مشترکہ ذمہ داری ہے ۔

کونسل بہت خلوص سے تمام شہریوں کو خواہ ان کا مذہب، زبان، نسل یا ثقافت کچھ بھی ہو دعوت دیتی ہے کہ وہ قومی اتحاد و سالمیت کو مضبوط کرنے کے اس عظیم و اہم کام میں حصہ لیں ۔"

یہ اقرار نامہ یا اعلامیہ سری نگر کی سہ روزہ کانفرنس کا حاصل ہے ۔ ہم اس کو ہندوستان کے دستور پر ایک جدید مہر تصدیق کہہ سکتے ہیں ۔ مرکزی سرکار کے نمائندے اور اس کے اہل کار اس کو اندرا گورنمنٹ کا ایک کارنامہ قرار دے رہے ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس پر جن سنگھ کے "صدر عالی مقام" مسٹر باجپئی کے دستخط بھی ثبت ہیں ۔ نیز بعض ایسے افراد نے بھی اس سے اتفاق کرلیا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آر ۔ ایس ۔ ایس سے ان کا قریبی تعلق رہا ہے ۔ ممکن ہے کہ انہیں لوگوں کو خوش کرنے اور ان کا اتفاق حاصل کرنے کے لیے اس کانفرنس میں مسلمانوں کی کسی بھی جماعت کا کوئی نمائندہ شریک نہیں کیا گیا ۔ یہاں تک کہ جمعیۃ علماء ہند کو بھی اس کی شرکت سے محروم رکھا گیا ۔

آل انڈیا ریڈیو کے ایک تبصرے میں اس "اعلان" کی کامیابی کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ بات کہی گئی تھی ۔ مبصر صاحب نے جو کچھ کہا تھا اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس اعلان سے اتفاق کے بعد اگر اس میں شریک رہنے والی کسی پارٹی نے اس کے خلاف کوئی بات کہی تو کم از کم اس سے یہ تو کہا جاسکے گا کہ بھائی تم نے سری نگر کانفرنس میں کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔ یہ ہے وہ کارنامہ جو سری نگر کانفرنس میں انجام پایا ہے

اس کانفرنس میں غور کے لیے مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات نے جو تحریر بھیجی تھی اس میں فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کی ایک تجویز یہ پیش کی گئی تھی کہ :۔

"ہندوؤں کے مذہبی لیڈر مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کی اپیل شائع کریں اور مسلمان اپنے پرسنل لا میں ترمیم و اصلاح پر راضی ہو جائیں ......۔ اس سے یہ خوف دور ہو جائے گا کہ کہیں کسی دن مسلم اقلیت اکثریت نہ بن جائے ۔"

اس تجویز کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے بجا طور پر نادر اور دلچسپ رشوت کہا ہے۔ دراصل برادران وطن کی یہی ذہنیت ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے بلائے عظیم بنی ہوئی ہے اور یہی ذہنیت مسلمانوں پر جارحانہ حملوں کو روکنے کی کسی تدبیر اور کسی قانون کو کامیاب نہیں ہونے دیتی۔

ان سطور کی تحریر تک کانفرنس کی سفارشات پر جو کارروائیاں ہو چکی ہیں ان سب پر اظہار خیال نہ مقصود ہے نہ مفید ہے۔ حکومت اور حکومتی عملہ کے عمل کی زبان خود توضیح کر دے گی۔ کئی صوبوں میں ودھان سبھا کی مدت کے الکشن کا زمانہ قریب ہے۔ یہ دور گزر جائے گا تو اس کارنامے کی عملی افادیت کھل کر سامنے آجائے گی۔ مسلمان اس اعلان سے جو فائدہ اٹھا سکتے ہوں انہیں ضرور اٹھانا چاہیے لیکن اس اعلان اور حکومت کے کاغذی اقدامات سے کوئی آس لگانا غلط ہوگا۔ ہندوستان کی کوئی بھی نیشنل انٹگریشن کونسل ان کے مسائل حل نہیں کر سکتی۔ ہمارے مسائل خود ہماری اپنی ہی یک جہتی سے حل ہوں گے اور یہ یک جہتی اس وقت پیدا ہوگی جب ہمارے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ جائے گی۔ غور یہ کرنا ہے کہ ہمیں روحانی، معنوی اور جماعتی حیات نو کہاں سے اور کیسے ملے گی؟

اللہ رب العلمین کی آخری کتاب ہم سے کہتی ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا	اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول
لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ	کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز
(الانفال ر ۳، آیت ۲۴)	کی طرف بلاتے ہوں جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہو

قرآن کے اس فرمان میں ہمارے دونوں سوالوں کا جواب موجود ہے اس کا بھی کہ ہمیں حیات نو کہاں سے ملے گی اور اس کا بھی کہ کیسے ملے گی۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں حیات نو اللہ تعالٰی کے منبع فیض سے ملے گی اور دوسرے کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہنے اور اس پر عمل کرنے سے ملے گی۔

حیاتِ انسانی کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حیوانی اور مادی زندگی جس کی وجہ سے انسان چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور اولاد پیدا کرتا ہے۔ دوسری روحانی، علمی، معنوی، جماعتی اور قومی زندگی جس کی وجہ سے وہ دنیا کی قوموں کے درمیان سربلندی وعزت کا مقام پاتا ہے اور آخرت میں اللہ کی رضا اور جنت کا مستحق ہوگا اس آیت میں زندگی کی اسی دوسری قسم کا ذکر ہے اور ہم اس وقت اسی دوسری زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حیات بخش چیز کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی ہے وہ یہی قرآن اور یہی دین حق اسلام ہے جو ان کی دنیا و آخرت دونوں ہی کی فلاح و کامرانی کا ضامن ہے اور یہی وہ آب حیات ہے جس سے انہیں نئی زندگی مل سکتی ہے۔ اللہ کے رسول کی اس دعوت پر لبیک کہنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں پھیلے ہوئے ہر ازم، ہر مکتب خیال اور ہر فلسفۂ حیات سے کٹ کر صرف اسلام کی حیات بخش تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اسی کو آپس کے اتحاد اور باہمی یکجہتی کی بنیاد بنایا جائے۔

حیات انسانی کی تیسری قسم ہر انسان کی شخصی و انفرادی زندگی ہے اور یہ آیت ہر مسلمان سے شخصاً شخصاً اور فرداً فرداً مطالبہ کرتی ہے کہ وہ پورے عزم، حوصلہ، ہمت، توجہ اور یکسوئی کے ساتھ اللہ و رسول کی اطاعت کرے۔

اس آیت کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم جب مسلمانوں کے موجودہ مسائل اور ان کو حل کرنے کی ان تدابیر کا جائزہ لیتے ہیں جنہیں وہ اختیار کر رہے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چشمۂ حیواں خود ان کے پاس موجود ہے اور وہ زندگی کی بھیک دوسروں سے مانگ رہے ہیں ——— اس آیت کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے :۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ وَاَنَّہٗٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ (الانفال، آیت ۲۴)	اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔

آیت کے اس ٹکڑے میں دو تنبیہیں ہیں۔ ایک یہ کہ رسول خدا کی دعوت پر مومنانہ و مخلصانہ لبیک کہی جائے منافقت کے ساتھ لبیک کہنا بے کار ہے۔ کیونکہ یہ لبیک زندگی بخش نہیں بلکہ ہلاکت انگیز ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ انسان مر کر فنا نہیں ہو جاتا بلکہ ایک دن اس کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہٗ اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں :۔

نفاق کی روش سے انسان کو بچانے کے لیے اگر کوئی سب سے زیادہ موثر تدبیر ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دو عقیدے انسان کے ذہن نشین ہو جائیں۔ ایک یہ کہ معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو دلوں کے حال تک جانتا ہے اور ایسا رازداں ہے کہ آدمی اپنے دل میں جو نیتیں، جو خواہشیں، جو اغراض و مقاصد اور جو خیالات چھپا کر رکھتا ہے وہ بھی اس پر عیاں ہیں۔ دوسرے یہ کہ جانا بہرحال خدا کے سامنے ہے، اس سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ یہ دو عقیدے جتنے زیادہ پختہ ہوں گے اتنا ہی انسان نفاق سے

دور رہے گا۔ اسی لیے منافقت کے خلاف وعظ و نصیحت کے سلسلے میں قرآن ان دو عقیدوں کا ذکر بار بار کرتا ہے:" (تفہیم القرآن جلد ۲)

انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہونے کے دو مطلب ہیں۔ ایک وہ جس کا ذکر ابھی مولانا مودودی کی تفہیم میں گزرا یعنی اللہ آدمی کے اپنے دل سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس مطلب کے لحاظ سے یہ آیت قرآن کی ایک دوسری آیت وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (اور ہم انسان کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں) کی ہم معنیٰ ہے۔ اس ٹکڑے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا دل الٹتا پلٹتا رہتا ہے یعنی اس کے خیالات، جذبات اور اغراض و مقاصد میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے نیک خیالات، نیک جذبات اور نیک اعمال کو بروئے کار لانے میں دیر نہیں لگانا چاہیے۔ کیا پتہ کہ دیر لگانے سے دل کسی دوسری چیز کی طرف مائل ہو جائے، یا جذبات سرد پڑ جائیں۔ اس حقیقت کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی عبادت و اطاعت پر گھمنڈ نہ کرے بلکہ ہمیشہ انتہائی خاکساری و زاری کے ساتھ یہ دعا کرتا رہے کہ اسے دین حق پر استقامت نصیب ہو، ہدایت کے بعد اس کے دل میں کجی نہ آئے، اس کا خاتمہ ایمان پر ہو اور اس کے اعمال خیر کو اللہ عزوجل محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرمالے۔ اس طرح آیت ۲۴ کا یہ پورا ٹکڑا انسان کو عقیدہ و عمل میں اخلاص، خیر کی طرف مسارعت اور آخرت کے حساب کتاب کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

حیات انسانی کی چوتھی قسم انسان کی جماعتی زندگی ہے یعنی ہر مومن اپنے انفرادی وجود کے ساتھ اپنا ایک اجتماعی وجود بھی رکھتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صرف اپنی اصلاح پر قناعت نہ کرے بلکہ پورے انسانی معاشرے کی اصلاح بھی اپنا فرض جانے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ الانفال کی آیت ۲۵ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (انفال آیت ۲۵)	اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہیں لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

اس آیت کے تحت مولانا مودودی لکھتے ہیں:-

اس سے مراد وہ اجتماعی فتنے ہیں جو وبائے عام کی طرح ایسی شامت لاتے ہیں جن میں صرف گناہ کرنے والے ہی گرفتار نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو گناہگار سوسائٹی میں رہنا گوارا کرتے رہے ہوں۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھیے کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں کہیں کہیں انفرادی طور پر چند مقامات پر رہتی ہیں۔ ان کا اثر محدود رہتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متاثر ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو لیکن جب وہاں گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی سارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے تو پھر ہوا اور زمین اور پانی ہر چیز میں سمیت پھیل جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو وبا آتی ہے اس کی لپیٹ میں گندگی پھیلانے والے اور گندہ رہنے والے اور گندہ ماحول میں زندگی بسر کرنے والے سب ہی آجاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی نجاستوں کا حال بھی ہے کہ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی کے رعب سے دبی رہیں تو ان کے نقصانات محدود رہتے ہیں۔ لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے، جب اخلاقی برائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی، جب اس کے درمیان برے اور بے حیا اور بد اخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو علانیہ اچھالنے اور پھیلانے لگتے ہیں اور جب اچھے لوگ بے عملی (PASSIVE ATTITUDE) اختیار کرکے اپنی انفرادی اچھائی پر قانع اور اجتماعی برائیوں پر ساکت و صامت ہو جاتے ہیں تو مجموعی طور پر سوسائٹی کی شامت آجاتی ہے اور وہ فتنۂ عام برپا ہوتا ہے جس میں چنے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ رسول جس اصلاح و ہدایت کے کام کے لیے اٹھا ہے اور تمہیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کے لیے بلا رہا ہے اس میں درحقیقت شخصی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تمہارے لیے زندگی ہے۔ اگر اس میں سچے دل سے مخلصانہ حصہ نہ لوگے اور ان برائیوں کو جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں برداشت کرتے رہوگے تو وہ فتنۂ عام برپا ہوگا جس کی آفت سب کو لپیٹے میں لے لے گی خواہ بہت سے افراد تمہارے درمیان ایسے موجود ہوں جو عملاً برائی کرنے اور برائی پھیلانے کے ذمہ دار نہ ہوں، بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھلائی ہی لیے ہوئے ہوں۔ یہ وہی بات ہے جس کو سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں اصحاب السبت کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے بیان کیا جا چکا ہے اور یہی وہ نقطہ نظر ہے جسے اسلام

کی اصلاحی جنگ کا بنیادی نظریہ کہا جا سکتا ہے ۔"

مفسر ابن کثیرؒ نے اس آیت کے تحت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی احادیث نقل کی ہیں۔ میں یہاں صرف ایک حدیث کا ترجمہ پیش کرتا ہوں' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :۔

نیکی کا حکم دو' برائی سے روکو اور خیر کے نشو و نما کی نگرانی کرو ورنہ اللہ کوئی عذاب بھیج کر تم سب کو مٹا دے گا یا تمہارے شریر افراد کو تم پر حاکم بنا دے گا ۔ پھر تمہارے اچھے لوگ دعا کریں گے مگر ان کی دعا قبول نہیں کی جائے گی ۔

آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اچھے لوگ دعائیں کر رہے ہیں لیکن وہ قبول نہیں ہو رہی ہیں ۔ اس آیت اور اس حدیث کی روشنی میں اگر مسلمان اپنی موجودہ بے عزتی' بے وقعتی اور محکومیت کا جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کی حیات بخش ہدایت سے من حیث المجموع منہ موڑ لیا ہے اور وہ اسی کی سزا بھگت رہے ہیں اور زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ عام طور پر اس احساس کے باوجود وہ اب بھی ادھر رخ کرنے کو تیار نہیں ہیں حالانکہ آج بھی یہ حیات بخش تعلیم انہیں حیات نو بخش سکتی ہے' مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے صرف ہمارے عزم اور عمل کی دیر ہے ۔

یہ بھی دیکھتے چلیے کہ اس حیات بخش تعلیم نے کن حالات میں ہم سے پہلے کے مسلمانوں کو سربلندی عطا کی تھی اور انہیں دنیا کا امام بنا دیا تھا ۔ سورۂ انفال کی آیت ۲۶ میں فرمایا گیا ہے :۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (آیت ۲۶)	اور یاد کرو وہ وقت کہ جب تم تھوڑے تھے' زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا ۔ تم ڈرے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں مٹا نہ دیں پھر اللہ نے تمہیں جائے پناہ مہیا کر دی ۔ اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا ۔ شاید کہ تم شکر گزار بنو

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں کی زندگی کی بے کسی اور مصیبت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ہماری موجودہ پُرآلام زندگی کے نقشے سے کس قدر مشابہ ہے ؟ ہم بہت ہونے کے باوجود کم ہیں' بے زور سمجھے جا رہے ہیں اور

(باقی صفحہ پر)

وید اور رسالت

(مولانا سید جلال الدین عمری)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مذہب دنیا کا بہت ہی قدیم مذہب ہے، بلکہ اگر خود ہندو مذہب ہی کی روایات کو مان لیا جائے تو اس کی تعلیمات اس وقت سے موجود ہیں جب سے کہ یہ دنیا موجود ہے۔ ہندو مذہب کی یہ قدامت اس کے ماننے والوں کے نزدیک اس کی عظمت کی دلیل ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسی قدامت نے اس کی تصویر اس قدر مسخ کر دی ہے کہ اس کے صحیح خدوخال کا معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہر مذہب کی کچھ فکری بنیادیں ہوتی ہیں، جن کے گرد اس کے ماننے والے جمع ہوتے ہیں اور جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں وہ اس کے منکر اور اس سے الگ سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہمیں ہندو مذہب کی کوئی فکری بنیاد ہی نہیں ملتی۔ اس میں خدا کا انکار بھی ہے اور اس کا اقرار بھی، توحید بھی ہے، شرک بھی، بت پرستی بھی ہے اور اس سے نفرت اور بے زاری بھی۔ دوسرے الفاظ میں اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہندو مذہب کسی ایک فکر پر ایمان کی دعوت نہیں دیتا بلکہ ہر فکر کو جائز قرار دیتا اور اسے قبول کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ انسان جس فکر کو چاہے اختیار کرے اور جس فکر سے چاہے اختلاف کرے، وہ کسی فکر کے اختیار کرنے پر نہ تو اس دنیا میں اس کو کسی سزا کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ اس کے بعد کسی اور دنیا میں عذاب سے ڈراتا ہے [1]

---

[1] یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ہندو مذہب کی جب کوئی فکری اساس ہی نہیں ہے تو وہ کیسے زندہ ہے اور ہندو قوم کی تعمیر کس چیز سے ہوئی ہے؟ اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا ہے کہ ہندو مذہب کسی فکر پر لوگوں کو جمع نہیں کرتا، بلکہ اپنی اجتماعیت کے لیے محض چند معاشرتی و سماجی ضوابط فراہم کرتا ہے۔ جو شخص ان ضوابط کی پابندی قبول کرلے وہ ہندو ہے، خواہ وہ کوئی بھی عقیدہ اور خیال رکھتا ہو اور کسی بھی نظریہ و مسلک سے اس کا تعلق ہو۔

بقیہ صفحہ ۱۰۴

اس انتشارِ فکر کی وجہ یہ ہے کہ ہندو مذہب کے وہ مآخذ متعین نہیں ہیں جن سے اس کے خیالات معلوم ہوں۔ یہاں نہ تو کسی کتاب کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ کسی مسئلہ میں اس کی صراحت کے بعد ہندو مذہب کے تمام ماننے والے اس کے سامنے سرِ جھکا دیں، نہ ایسی کوئی شخصیت ہے جس کے افکار و اعمال ان سب کے لیے آخری سند کا درجہ رکھتے ہوں اور نہ کسی خاص جماعت کی رسوم و روایات ہی کو ان کے نزدیک فیصلہ کن مقام حاصل ہے، بلکہ بہت سی کتابوں اور بہت سے اشخاص اور بہت سی جماعتوں کے خیالات ہندو مذہب پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ پھر یہ کہ ان خیالات میں بڑا اختلاف ہے اور بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی مسئلہ میں ہم ہندو مذہب کا نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہیں تو بڑی زحمت پیش آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بعض کتابوں کی ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ یہی اہمیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ رسالت کے بارے میں ہندو مذہب کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے ہم ان کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی ایسی صورت نہیں ہے جس سے ہم زیرِ بحث مسئلہ میں اس کی رائے معلوم کر سکیں۔

ہندو قوم میں ویدوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی بھی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اس کی اکثریت ان کو بہت ہی مقدس سمجھتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ یہ کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے ملے ہیں۔ خدا نے جب یہ دنیا پیدا کی تو ویدوں کے ذریعہ اس نے نوعِ انسانی کو وہ تمام دینی و دنیاوی علوم بتا دیے جن کی کبھی اس کو ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ یہ تعداد میں چار ہیں۔ رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید۔ ان کے ظہور کے بارے میں ہندو مذہب کے سب سے بڑے فرقے سناتن دھرم کا خیال ہے کہ برہما کے چار منہ تھے، جن سے اس نے یہ چاروں وید چار رشیوں کو سنائے۔ لیکن آریہ سماجیوں کا خیال ہے کہ پرماتما نے کائنات کی پیدائش کے شروع میں چار رشیوں کے دلوں میں چار وید ظاہر کیے اور پھر برہما نے ان

(بقیہ حاشیہ) ہندو مذہب کے یہ معاشرتی و سماجی ضوابط ایک لمبے عرصے میں وجود میں آئے ہیں اور ان کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں اختلافات بھی رہے ہیں، لیکن جب تک کوئی شخص یا گروہ ان کو بالکل توڑ نہ دے وہ ہندو ہی سمجھا جائے گا۔ ہمارے خیال میں یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے گروہ بھی ہندو قوم کا جزء سمجھے جاتے ہیں جو ان ضوابط کو بالکلیہ رد کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو ہندو قوم سے خارج نہیں کیا گیا، جیسے بدھ مت اور جین مت کے ماننے والے۔ شاید ان کو ہندو قرار دینے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہندوستان میں یا ہندو قوم کے اندر پیدا ہوئے۔

رشیوں سے یہ چاروں وید حاصل کیے۔ اس طرح گویا پہلے گروہ کے نزدیک یہ براہ راست خدا سے سنے گئے اور دوسرے گروہ کے نزدیک الہام کے ذریعے حاصل ہوئے۔

ویدوں کے ظہور سے متعلق اس اختلاف سے قطع نظر اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ہندو مذہب کے یہ دونوں فرقے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان خدا کی ہدایت اور راہنمائی کا محتاج ہے اور خدا نے فی الواقع اس کی راہنمائی کی بھی ہے۔ چنانچہ سوامی دیانند سرسوتی کہتے ہیں:۔

"وہ پرماتما جو سب کو پیدا کر کے ضبط میں لائے ہوئے ہے، جو خود بخود موجود، ہر جگہ موجود، پاک ازلی بے جسم و شکل پرمیشور ہے وہ اپنی ازلی رعایا جیووں کی بہبودگی کی خاطر تمام علوم کا اپدیش بذریعہ ویدوں کے ٹھیک ٹھیک طریقے پر کرتا ہے۔"

رسالت کو ماننے پر انسان اس لیے مجبور ہوتا ہے کہ اسی ذریعہ سے اس کو خدا کی ہدایت ملتی ہے۔ اگر ویدوں سے یہ ہدایت مل چکی ہے تو ظاہر ہے رسالت کو ماننے کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن اس فیصلہ سے پہلے ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ وید اپنی موجودہ حالت میں کیا اس قابل ہیں کہ ہم اطمینان کے ساتھ اس کو خدا کی ہدایت کی حیثیت سے قبول کریں۔ اس کے لیے ہمیں چند سوالات پر غور کرنا ہوگا۔

۱۔ ویدوں سے خدا کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟

۲۔ خدا اور انسان کے تعلق کی وہ کیا نوعیت متعین کرتے ہیں اور اس کی مرضی معلوم کرنے اور اس کو پورا کرنے کا کیا طریقہ بتلاتے ہیں؟

۳۔ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟

۴۔ کیا وہ اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں؟

آیئے اب ایک ترتیب سے ان سوالات پر غور کیا جائے۔

۱۔ ویدوں کو تمام علوم کا سرچشمہ کہا جاتا ہے اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسی سے تمام مادی و روحانی علوم پھیلے۔ جہاں تک مادی علوم کا تعلق ہے اس بات کو ماننے کے لیے خوش گمانی کی بہت بڑی مقدار چاہیے کہ دنیا ویدوں ہی کے ذریعے ان سے واقف ہوئی اور آج ان ہی کی بدولت اس نے اس قدر ترقی کی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس دعوے کو مان بھی لیا جائے تو یہ کسی آسمانی کتاب کی خصوصیت نہیں ہے کہ اس میں تمام مادی علوم کی تشریح کی گئی ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس سے خدا کی

صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے ۔کیونکہ مادی علوم کو انسانی عقل خود سے دریافت کر سکتی ہے ۔اس کے لیے کسی آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں ہے ۔البتہ عقل کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی ۔اسی کے لیے خدا کے رسول اور اس کی کتاب کی ضرورت پیش آتی ہے ۔لیکن افسوس کہ ویدوں سے یہ ضرورت پوری نہیں ہوتی ۔ کیونکہ خدا کے بارے میں ویدیں کوئی صاف اور واضح تصور نہیں دیتے ۔ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خدا کن صفات سے متصف ہے اور کن صفات سے اس کی ذات پاک ہے ۔کبھی تو اس کے اندر بہت اعلیٰ صفات دکھائی گئی ہیں اور کبھی ایسی صفات اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں جو اس کے شایان شان نہیں ہیں ایک طرف خدا کی مخصوص صفات کے اندر اس کی مخلوق کو بھی شریک کیا گیا ہے اور دوسری طرف مخلوق کی ناقص صفات بھی خدا کے لیے ثابت کی گئی ہیں ۔

پہلے یہ دیکھیے کہ خدا کے بارے میں ویدوں کے اندر کتنے بلند خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ۔

"جس نے جان دی ہے اور جو تمام کائنات کو وجود میں لانے والا ہے، جو دنیا کے سب حصوں میں موجود ہے ۔اگرچہ اس کے مختلف نام ہیں مگر وہ ایک ہے ۔تمام مخلوق اس کو جاننے کی خواہش کرتی ہے ۔"

شری سوامی دیانند سرسوتی نے ویدوں میں پرمیشور (خدا) کے جو نام آئے ہیں ان سے ستیارتھ پرکاش میں بڑی لمبی بحث کی ہے ۔میں یہاں اس کے بعض حوالے نقل کروں گا ۔

"حفاظت کرنے کے باعث 'اوم' مثل خلا محیط ہونے کے باعث 'کھم' اور سب سے بڑا ہونے کے باعث 'برہم' نام ایشور کا ہے" (یجر وید ۴۰ - ۱۷)

"اوم جس کا نام ہے اور جو کبھی فنا نہیں ہوتا اس کی عبادت کرنی واجب ہے اور کسی کی نہیں ۔" (یجر وید ۴۰ - ۱۷)

"جو اپنے آپ کو خود ظاہر کرنے والا اور سورج اور چاند وغیرہ کو پیدا کر کے قائم رکھنے والا اور جو تمام مخلوقات کا ایک ہی مالک اعلیٰ تھا، جو سب جگت کے پیدا ہونے سے پہلے موجود تھا، وہی ان روشن وغیرہ روشن کروں کو سہارا دیے ہوئے ہے ۔ہم لوگ اس سرور بالذات، پاک، حاصل کرنے کے قابل پرمیشور کی یوگ اور پریا (ریاضت محبت) سے عبادت (بھگتی) کریں ۔" (یجر وید ۱۳ - ۴)

ان حوالوں میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا ہی نے یہ کائنات پیدا کی اور ہر ایک کو زندگی عطا کی ۔ وہ ہر جگہ موجود ہے ۔سب کی حفاظت کرتا ہے، سب کو سہارا دیے ہوئے ہے، وہی سب سے بڑا ہے

سب کا مالک ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ انسان کے اندر اس کو جاننے کی خواہش ہے۔ اس کو اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت صحیح نہیں ہے۔

خدا کے بارے میں یہ وہی تصور ہے جو توحید کے قائل مذاہب نے اختیار کیا ہے۔ ہندو قوم کے بہت سے افراد اور بہت سی جماعتوں نے اس تصور کو قبول کیا ہے اور بعد میں اس کو ترقی دی اور رمز بدھکار رہے ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ویدوں کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ویدوں کو یہ حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ویدوں میں توحید کا یہ تصور نمایاں نہیں ہے۔ وہاں جو چیز پوری قوت کے ساتھ اُبھری ہوئی ہے وہ ہے شرک۔ ویدوں میں ایک نہیں بہت سے خدا ہیں اور ہر خدا مستقل اور قائم بالذات ہے۔ انسان ان سب کا اپنی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت حاجتمند ہے۔ رگ وید جو تمام ویدوں کی اصل ہے اس میں اگنی (آگ) ورن (پانی وایو (ہوا) سادیتا (سورج) ماروت (طوفان) اندر (طاقت) وغیرہ کو دیوتاؤں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اس کا ایک بڑا حصہ ان کی تعریف سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً رگ وید میں ورن کی حمد اس طرح کی گئی ہے۔

> "اے ورن! ہم کو ہمارے بزرگوں کے گناہوں سے نجات دو، جو گناہ ہم نے کیے ہیں ان کی بھی ہمیں معافی دو۔ اے شاہ زریعت! شیر گاؤں کے کھن کی طرح ہمارے اوپر مینھ کی بارش کر دو ہم کو دعا دو کہ تمام درخت ہمیں آرام دیں اور آسمان اور زمین اور دریا ہمیں راحت بخشیں"۔

سورج کی حمد اس طرح کی گئی ہے۔

> "اے آفتاب! ہمیں اپنا سفر ختم کرنے میں مدد دے اور تمام خطاؤں کو دور کر دے"

اندر، مردان جنگ جو کا محبوب دیوتا ہے۔ آفات سماوی سے بچنے اور لڑائی کے وقت دشمنوں پر غلبہ پانے کے لیے پجاری بھی اسی کو پکارتے ہیں۔

ویدوں میں چونکہ اس طرح شرک اور توحید کے متضاد خیالات پائے جاتے ہیں اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے مصنفین خدا کے بارے میں کوئی متعین تصور ہی نہیں رکھتے تھے۔ ویدوں کے مطالعہ سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ بعض مابعد الطبیعیاتی مسائل پر غور و فکر کر رہے ہیں لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کا کوئی واضح جواب بھی پا چکے ہیں۔ خدا ہے یا نہیں اگر ہے تو کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے، کیا

یہاں کسی ایک طاقت کی فرماں روائی ہے یا بہت سی طاقتیں کام کررہی ہیں ۔ انسان کو نفع پہنچانے والی قوتیں کیا ہیں اور کن قوتوں سے اس کو نقصان پہنچ سکتا ہے ؟ ان سب مسائل کی حقیقت تک بے شک وہ پہنچنا چاہتے ہیں لیکن شاید ابھی وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں ۔ اسی وجہ سے ہیں ان کے خیالات الجھے ہوئے اور ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں ۔

ویدوں میں کائنات کی مختلف قوتوں اور مختلف اشیاء کی جس طرح تعریف کی گئی ہے اس سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ یہ زمین و آسمان کے خالق کو جاننے والی قوم کے تاثرات نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسی قوم کے جذبات ہیں جو فطرت اور اس کے مظاہر سے بے حد متاثر ہے اور ان کو زبردست قوت کا مالک سمجھتی ہے وہ ان سے ڈرتی بھی ہے اور امیدیں بھی باندھتی ہے ۔ ان کو اپنا مددگار اور رحیم و شفیق بھی سمجھتی ہے اور حریف اور دشمن بھی خیال کرتی ہے ۔ ان جذبات نے اس کے اندر مظاہر فطرت سے مدد حاصل کرنے اور ان کے غضب سے بچنے کا جذبہ پیدا کیا اور پھر آہستہ آہستہ جب اس جذبے نے ترقی کی تو یہ چیزیں خدا کا مقام حاصل کرنے لگیں اور اس نے باقاعدہ ان کی پرستش شروع کردی ۔ کائنات کی ان مادی چیزوں کی پرستش کرتے کرتے بعض لوگ اس حقیقت تک بھی پہنچ گئے کہ ان کا خالق و مالک صرف ایک ہے ۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اسی سے امیدیں باندھی جائیں اور اسی کا خوف کھایا جائے باقی جتنی چیزیں ہیں سب اسی کی پیدا کردہ ہیں ۔ ان میں سے کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کی کوئی طاقت نہیں ہے ۔ گویا ویدوں کے دور میں پائے جانے والی قوم بالعموم شرک میں گرفتار تھی ۔ البتہ کہیں کہیں اس کے اندر توحید کے اثرات بھی موجود تھے ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اثرات شروع ہی سے موجود رہے ہوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ بعد میں توحید کو ماننے والی قوموں کے ساتھ میل جول اور ان کی تعلیمات سے واقفیت کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں ۔

ایک قیاس یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ویدوں میں اصل تعلیم توحید ہی کی تھی، شرک بعد میں داخل ہوا۔ ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا ایک ہے اور وہ اپنی ذات و صفات میں بے مثل و یکتا ہے ۔ وہ ہر جگہ موجود ہے، اسی کی قدرت تمام چیزوں میں کام کررہی ہے ۔ اس کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی جیسا کہ رگ وید کے ایک منتر میں کہا گیا ہے :۔

"وہ روشنی بن کر چمکتے ہوئے آسمان میں، ہوا بن کر درمیانی خلا میں، آگ بن کر قربانی کے ...

آتش کدہ پر مہمان بن کر دہ گھر میں، زندگی بن کر انسان میں اور حق کی حیثیت سے ہر جگہ رہتا ہے۔"

(رگ وید، ۴، ۴۰، ۵)

لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے اس تعلیم کو بھلا دیا اور اس حقیقت کو کہ ہر چیز میں خدا کی قدرت نمایاں ہے یہ معنے دے دیے کہ ہر چیز خدا ہے۔ بعد میں تحریف و تبدیلی اور حذف و اضافہ کا عمل ویدوں میں اتنا زیادہ ہوا کہ توحید کی روشنی مدھم پڑ گئی اور شرک کا تصور چھا گیا۔

یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ اس وقت وید خدا کا صحیح تعارف کرانے میں بالکل ناکام ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں خدا کی ذات و صفات کا کوئی واضح تصور نہیں ہے بلکہ خداؤں کا ایک ہجوم ہے جو خدا کی مخلوقات ہی میں سے نکل کر خدائی کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ حالانکہ جو کتاب خدا کی طرف سے آئی ہو اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس میں خدا کا اتنا نکھرا ہوا تصور ہو کہ خدا اور اس کی مخلوق کا فرق بالکل نمایاں ہو جائے۔ اس میں نہ تو کسی مخلوق کو خدا بنا دیا گیا ہو اور نہ خدا کو اس طرح پیش کیا گیا ہو کہ وہ مخلوق کی طرح بے بس معلوم ہونے لگے۔ کیونکہ خدا کی مخلوق بھی خدا بن جائے تو اس کی عظمت باقی نہیں رہ سکتی اور انسان اس کی ذات و صفات کا صحیح تصور نہیں کر سکتا۔

اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والی کوئی بھی کتاب کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ انسان اس تصورِ خدا کے علاوہ بھی کوئی تصور رکھے جو وہ پیش کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کے معنے صرف یہی نہیں ہوں گے کہ اس کے دیے ہوئے تصور کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہوں گے کہ وہ خدا کے بارے میں ہر غلط تصور کو صحیح تصور کی حیثیت دے رہی ہے لیکن ویدانت کے ماننے والے اسی غلطی کے مرتکب نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وید یہ نہیں کہتے کہ خدا کا جو تصور ان میں پایا جاتا ہے وہی صحیح ہے اور اس کے علاوہ تمام تصورات غلط ہیں یا اگر وہ یہ کہتے بھی ہوں تو موجودہ ہندومت کے علمبردار اس کو نہیں مانتے، بلکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہر تصورِ خدا کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، خواہ وہ ویدوں سے ہم آہنگ ہو یا اس کے مخالف۔

(۲) اب دوسرے سوال کو لیجیے۔ ویدوں میں خدا اور انسان کے تعلق کو اس رخ سے نہیں دیکھا گیا ہے کہ انسان خدا کا پیدا کردہ اور اس کا بندہ ہے، اسے اس کی مرضی معلوم ہونی چاہیے تاکہ وہ اس کی اتباع کرے اور اس کے احکام پر چلے، بلکہ وہاں خدا اور انسان کے تعلق کے بارے میں وہی وحدۃ الوجود

کا فلسفہ ملتا ہے ۔ وحدت الوجود کا مطلب ہے کہ یہاں خدا کے سوا کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے ۔ اسی کا ایک وجود ہے جو پوری کائنات میں ظاہر ہوا ہے ۔ خدا سے الگ ہو کر خود انسان کی کوئی ہستی نہیں ہے ۔ بلکہ خدا نے اس کی شکل اختیار کی ہے ۔ ویدوں میں اس فلسفہ کی طرف صرف اشارات کیے گئے ہیں البتہ اپنشد میں اس کو مرتب اور علمی شکل دی گئی ہے ۔

وحدت الوجود کا فلسفہ اتنا پرپیچ ہے کہ اس سے خدا اور انسان کے تعلق کی نوعیت بجائے واضح ہونے کے اور زیادہ الجھ جاتی ہے ۔ یہ ان حقیقتوں کا ساتھ نہیں دیتا جن کو انسان کی عقل بالکل بدیہی سمجھ کر مانتی ہے ۔ ہماری عقل صاف کہتی ہے کہ اس کائنات میں خدا کی ہستی نہیں بلکہ اس کی قدرت ظاہر ہوئی ہے ۔ کسی چیز میں خدا کی قدرت کا ظاہر ہونا یہ معنے نہیں رکھتا کہ وہ خدا بن گئی ہے یا خدا اس میں اتر آیا ہے ۔ یہ حقیقت انسان کی نفسیات سے بھی اس قدر قریب ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا تصور اس سے مطابقت نہیں رکھتا وہ اگر کسی پہلو سے خدا کو مانتا ہے تو اپنے آپ کو خدا نہیں بلکہ اس کی ایک ادنی مخلوق اور حقیر غلام سمجھتا ہے ۔

فلسفۂ وحدت الوجود سے خود بخود دو ایسے نتائج نکلتے ہیں کہ کسی طرح ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ ایک یہ کہ اس فلسفہ کو ماننے کے بعد کائنات کی ہر چیز خدا بن کر انسان کے سامنے آتی ہے اور اس کو اپنی عبادت کی دعوت دیتی ہے ۔ انسان اگر اس کو یہ حیثیت دے دے تو اس فلسفہ کی رو سے کوئی غلطی نہیں کرے گا بلکہ ایک حقیقت کا اعتراف کرے گا ۔ اس لیے کہ جب پوری کائنات میں خدا کے سوا کسی چیز کا الگ سے کوئی وجود ہی نہیں ہے تو وہ جس چیز کی بھی عبادت کرے وہ خدا ہی کی عبادت ہوگی اور جس در بھی وہ اپنی پیشانی ٹیک دے وہ خدا ہی کا در ہوگا ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وحدت الوجود کے ماننے والوں نے کھل کر مظاہر پرستی حتیٰ کہ بت پرستی تک اختیار کی اور ان کو اس میں کوئی قباحت نہیں محسوس ہوئی ۔ پھر زمانہ کی رفتار کے ساتھ خدائے واحد کی عبادت کا تصور تو غائب ہوگیا اور بے شمار چیزوں کی پرستش ہونے لگی[1] ۔ چنانچہ ویدوں میں عبادت کے جو طریقے اور جو احکام اور مراسم بیان ہوئے ہیں وہ زیادہ تر دیوتاؤں کو خوش کرنے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے لیے ہیں ۔ خدائے تعالیٰ سے ان کا تعلق یا تو بالکل نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت کم زور

---

[1] اس سے ویدوں کے بارے میں اس قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ ان میں پہلے خدا ہی کو عبادت کے لائق بتایا گیا تھا لیکن بعد میں بہت سی چیزیں مستحق عبادت سمجھ لی گئیں ۔ یہ قیاس اگر صحیح ہے تو شاید یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ اس کے لیے فلسفۂ وحدت الوجود نے بنیاد فراہم کی اور ایک خدا کی عبادت کرنے والی قوم کو بے شمار خداؤں کا پرستار بنا دیا ۔

اور غیر واضح ہے۔ ساعن فلسفہ نے انسان کو ایک طرف خدا بنایا اور دوسری اسے ایسی راہ دکھا دی کہ وہ آسانی سے ہر چیز کو خدا مان کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو سکتا ہے۔

وحدت الوجود کے فلسفہ کو ماننے کا دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کی مرضی کیا ہے؟ کیونکہ جب اس کا وجود خدا کا وجود ہے تو اس کا ہر عمل خدا کا عمل ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے حقیقت میں خدا کر رہا ہے۔ یہاں حکم دینے والا اور اس پر عمل کرنے والا دو الگ وجود نہیں ہیں بلکہ ایک ہی وجود ہے جو اپنا کام کر رہا ہے۔ لیکن اس منطقی نتیجہ کو ویدوں میں قبول نہیں کیا گیا ہے۔ ان میں وحدت الوجود کا فلسفہ بھی ہے اور ساتھ ہی خدا کے بتائے ہوئے احکام و قوانین بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر خدا خود انسان کی شخصیت میں جلوہ گر ہے تو وہ کون ہے جو اس کو کسی حکم کا پابند بنانا چاہتا ہے اور جس کی مرضی کو پورا کرنے اس کے لیے ضروری کہا جاتا ہے کہ خدا کی ذات حقیقت میں پورے عالم کی روح ہے۔ وہ باوجودیکہ ہر چیز میں موجود ہے، لیکن چیزیں مادی پیکر میں ہیں۔ انسان کو جو احکام دیے گئے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ مادی جسم سے پاک ہو کر روح عالم میں مل جائے۔

یہاں ہم یہ بحث نہیں چھیڑیں گے کہ خدا کی ذات کوئی مادی قالب اختیار کر سکتی ہے یا نہیں؟ بلکہ اپنے موضوع کی حد میں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ویدوں میں اس مقصد کے لیے جو طریقے بتائے گئے ہیں ان کے بارے میں وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے یا کم از کم ان کے ماننے والے ان کو اس حیثیت سے نہیں پیش کرتے کہ وہی صحیح اور برحق ہیں، بلکہ وہ انسان کو آزادی دیتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے چاہے وہ کسی آسمانی کتاب کی پیروی کرے، چاہے کسی رشی اور منی کے تجربات سے فائدہ اٹھائے یا چاہے اپنے ضمیر کی ہدایات پر عمل کرے، ان میں سے ہر طریقہ درست اور جائز ہے۔ ان میں سے کسی پر بھی عمل کر کے وہ روح عالم میں جذب ہو سکتا ہے اور اپنے آپ کو مادیت کی آلائشوں سے پاک کر سکتا ہے۔

یہ پورا فلسفہ رسالت کے تصور کے عین ضد ہے۔ رسالت کی ضرورت اس تصور کے تحت پیش آتی ہے کہ ہم اپنی سعی و کوشش سے نہ تو خدا کو ٹھیک ٹھیک پہچان سکتے ہیں اور نہ اس کی مرضی معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ہندو مذہب اس بات کا قائل ہے کہ انسان مختلف ذرائع سے حتیٰ کہ اپنی ذاتی ریاضت سے خدا کی معرفت بھی حاصل کر سکتا ہے اور اس تک پہنچ بھی سکتا ہے تو ظاہر ہے رسالت کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) ویدوں کو اتنی بڑی حیثیت دینے کے لیے کہ وہ کسی انسان کی کتاب نہیں بلکہ خدا کی کتاب ہیں، ہمیں بہت ہی مستند اور قابل اعتماد ذرائع سے معلوم ہونا چاہیے کہ کن اشخاص نے ان کو پیش کیا، کن حالات میں پیش کیا، وہ کس قسم کے سیرت و کردار کے حامل تھے؟ پھر یہ کہ ان کی ابتدا کیسے ہوئی، وہ اپنی آخری شکل میں کس طرح مدون و مرتب ہوئے، ان پر عمل کس طرح کیا گیا اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ ان تمام پہلوؤں پر جب تک ہمارے پاس یقینی معلومات نہ ہوں، نہ تو ویدوں کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے آئے تھے یا نہیں؟

لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور ایسی حقیقت کہ آسانی سے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ویدوں کے بارے میں بہت ہی ضروری معلومات بھی تاریخ فراہم نہیں کرتی، اور خود ہندو مذہب کے ماننے والے اتنے متضاد خیالات پیش کرتے ہیں کہ ان کی مدد سے کسی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ایشور نے تخلیق کائنات کے بعد برہما پر ویدوں کا الہام کیا اور کبھی خود برہما خالقِ کائنات کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے چار مونھ تھے جن سے انھوں نے چار رشیوں کو چار وید سنائے کبھی اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ پرماتما نے ابتدائے خلقت میں چار رشیوں کو چار وید سنائے اور برہما نے ان سے یہ وید حاصل کیے۔ گویا ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ برہما خالقِ کائنات ہیں یا ایک بڑے رشی جن کے دل میں ایشور نے ویدوں کا الہام کیا۔ یا ان رشیوں کے شاگرد جن کو چار وید حاصل ہوئے۔ پھر یہ کہ ان کے رشیوں کے متعلق ہندو مذہب میں عجیب و غریب اور متضاد داستانیں بیان ہوئی ہیں۔ جن سے یہ معلوم کرنا کسی کے بس میں نہیں کہ وہ انسان تھے یا ان میں ماورائے انسانیت کوئی طاقت تھی، ان کی تاریخی حیثیت کیا تھی اور کس دور سے ان کا تعلق تھا؟

خالص مذہبی اور قدیم خیال کے ہندو ویدوں کو اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے پہلی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے انسان کی تخلیق کے بعد اس کو ملی ہے لیکن یہ ایسی مہمل بات ہے کہ ایک تو اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ خود وید کی اندرونی شہادتوں سے اس کی تردید ہوتی ہے چنانچہ رگ وید میں ہے :۔

"تم کو دھرم ہی پر عمل کرنا چاہیے۔ ادھرم اختیار نہیں کرنا چاہیے جس طرح زمانۂ قدیم کے صاحب علم و معرفت راستی شعار، طرف داری و تعصب سے خالی عالم اور ایشور اور دھرم کے حکم کو عزیز جاننے والے

تمہارے بزرگ تمام علوم سے ماہر اور لائق و فائق گزر چکے ہیں۔ مجھ عبادت کرنے کے لائق، قادر مطلق
وغیرہ صفات سے موصوف ایشور کے حکم کی تعمیل یا میرے بتلائے ہوئے دھرم پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اسی
طرح تم بھی اسی دھرم کے پابند رہو تاکہ ویدیں بتلائے ہوئے دھرم کا تم کو بلا شک و شبہ علم ہو جائے "

موجودہ دور کے محققین جن میں بہت سے ہندو مذہب کے ماننے والے بھی شامل ہیں ویدوں کو خالص آرین لٹریچر قرار دیتے ہیں اور ان کو اس دور کے بھی بعد کی پیداوار سمجھتے ہیں جب کہ آریہ وسط ایشیا سے نکل کر درۂ خیبر کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور دریائے سندھ کے کنارے آباد ہوئے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیحؑ سے دو ہزار سال قبل کا واقعہ ہے۔

ویدوں میں رگ وید سب سے قدیم اور باقی تینوں ویدوں کی اساس ہے کیونکہ اسی میں حذف و اضافہ سے وہ مرتب ہوئے ہیں۔ اس کو دس منڈلوں یا دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زیادہ منترا اور دس ہزار سے زیادہ بند ہیں۔ یہ اس وقت وجود میں آیا جب کہ آریہ ابھی حدود پنجاب ہی میں تھے، لیکن اس کے بعض حصوں کے بارے میں خیال ہے کہ وہ شاید اس سے بھی قدیم ہیں اور اس وقت کہے گئے ہیں جب کہ آریہ ابھی اپنے ایرانی بھائیوں سے الگ نہیں ہوئے تھے۔

رگ وید کے بعد کی تصنیف یجر وید ہے۔ اس کا ایک حصہ نثر میں ہے اور ایک حصہ نظم میں۔ اس کے دور ترتیب میں معلوم ہوتا ہے کہ آریہ حدود پنجاب سے نکل کر مشرق کی طرف بڑھ گئے تھے۔ کیونکہ رگ وید کے شاعروں کے لیے تو ہندوؤں کی مقدس زمین سندھ کا میدان ہے لیکن یجر وید میں تقدس کا مقام کرکشیتر یعنی جمنا اور ستلج کے درمیان کے علاقہ کو حاصل ہو گیا ہے۔ یجر وید میں رگ وید کے بہت سے نغمات شامل ہیں بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا ایک چوتھائی حصہ رگ وید ہی سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بعد میں اس میں بہت سے اضافے بھی ہوئے ہیں۔ یجر وید میں قربانی کے طریقوں اور رسوم و آداب کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے

. . . .

۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب کے زمانہ میں رگ وید کی سیدھی سادی تعلیمات کی جگہ قربانی اور اس کی پرپیچ رسموں نے لے لی تھی۔

سام وید میں جو بھجن اور گیت ہیں وہ تقریباً سب کے سب رگ وید سے لیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سام یا سوم ایک درخت تھا جس سے نشہ آور عرق نکلتا تھا، آریہ اسے خود بھی پیتے تھے اور اپنے دیوتاؤں کو بھی

پلاتے تھے۔ اس میں اسی کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ یہ خالص مذہبی مراسم کا مجموعہ ہے اس سے زیادہ خود ہندو مذہب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اتھر وید چاروں ویدوں میں سب سے بعد کی تصنیف ہے۔ خیال یہ ہے کہ یہ حضرت مسیحؑ سے زیادہ سے زیادہ چھ سو سال قبل وجود میں آیا، لیکن شاید اس میں اضافے مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد تک ہوتے رہے۔ شروع میں اس کو ویدہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ حیثیت اس کو ایک عرصہ کے بعد حاصل ہوئی۔ اب تک جنوب کے بہت سے برہمن اس کے استناد کو تسلیم نہیں کرتے۔ شمال میں بھی بعض لوگوں کے نزدیک ویدوں کی تعداد صرف تین ہے جس میں اتھر وید شامل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض محققین نے اس کو ویدوں کا سرتاج کہا ہے۔

اتھر وید میں جادو اور ٹونے ٹکلے کا اس اہمیت کے ساتھ ذکر ہے جیسے اس کے زور سے دشمن کو ختم کیا جا سکتا ہے، کسی کا دل پھیرا جا سکتا ہے اور بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ ان خرافات کے ساتھ اس میں حکمت و دانائی کی باتیں بھی ہیں جن سے ہر دور کا انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

یہ تفصیلات خود بخود بتاتی ہیں کہ ہمارے پاس ایسا کوئی مستند تاریخی ریکارڈ نہیں ہے جس سے ہم ویدوں کے عہد کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکیں اور وہ حالات معلوم کر سکیں جن میں ان کی تخلیق ہوئی۔ ہم یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ کس ذہن و فکر سے وہ نکلے اور کس طرح پھیلے۔ ان سب پہلوؤں سے جو کچھ بھی ہم کہیں گے وہ محض ہمارا قیاس ہوگا اس کی کوئی یقینی بنیاد نہ ہوگی۔

(۴) اب یہ دیکھیے کہ وید اپنی اصل شکل میں موجود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ کسی کتاب کو خدا کی کتاب کی حیثیت سے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ محفوظ ہو اور اس بات کا پورا پورا اطمینان ہو کہ اس کا تمام حصہ اسی ... طرف سے آئی ہوئی ہیں لیکن اگر وہ محفوظ نہیں ہے تو اس کے ہر حکم کے بارے میں شبہ رہے گا کہ معلوم نہیں ... خدا ہی کا حکم ہے یا ہم جیسے کسی انسان نے اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو ویدوں کو کم از کم ان کی موجودہ حالت میں خدا کی کتاب ماننے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کسی کتاب کے محفوظ ہونے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے الفاظ کے ساتھ من و عن باقی ہے یہ حفاظت کی اعلیٰ ترین اور بہت ہی قابل اعتماد صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا مفہوم اور تعلیمات محفوظ

ہوں اور ان میں کسی قسم کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ نہ ہوا ہو۔

جہاں تک ویدوں کے اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہونے کا تعلق ہے اس کا دعوےٰ کرنا آسان نہیں ہے اور اگر دعوےٰ کیا جائے تو ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات طے شدہ سمجھنی چاہیے کہ وید جن الفاظ میں پہلی مرتبہ بنے گئے اس وقت وہ ان الفاظ میں موجود نہیں ہیں۔ ایک ہندو محقق سوامی اشروانند لکھتے ہیں

> دشنو پران کے بیان کے مطابق اصل وید ابتدا میں رشیوں پر الہام کیے گئے تھے۔ ان میں ایک لاکھ اشلوک تھے اور وہ چار حصوں میں منقسم تھے۔ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ یہ حصے گڈمڈ ہوگئے اور ویدوں کا بہت بڑا حصہ تاریکی میں غائب ہوگیا۔ دواپریگ کے آغاز میں کرشن دمے پائن نے ویدوں کے علم کو از سرِ نو زندہ کیا اور قدیم چار تقسیموں رچ، یجس، سامن اور اتھروں کے مطابق ویدوں کو از سرِ نو مرتب کیا......
> اسی لیے وہ وید ویاس یعنی ویدوں کو مرتب کرنے والے کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ روایت ہندو علماء میں بہت قوی شمار ہوتی ہے اور اسے اس حیثیت سے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اس کی کچھ نہ کچھ تاریخی بنیاد موجود ہے "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتداد زمانہ سے نہ صرف یہ کہ وید اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہے بلکہ ان کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ گڈمڈ ہونے کے بعد ویاس جی نے ان کو جمع و ترتیب کا کام کیسے کیا اور اب وہ اصل وید کس بنیاد پر کہے جا سکتے ہیں۔

اس سے آگے ہندو محققین نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وید کے الفاظ ہی نہیں ان کی تعلیمات بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن لکھتے ہیں:۔

> "ہندو مذہب نے دراوڑوں اور دیگر ہندوستانی اقوام سے اتنی چیزیں لی ہیں کہ موجودہ ہندو مت کے اندر وید کے اصل عناصر کو ان عناصر سے الگ کرنا مشکل ہے جو بعد میں شامل ہوتے ہیں "

اس کی دلیل یہ ہے کہ ویدک دھرم اپنے آغاز میں بہت سادہ تھا، اس میں ریاضت سے زیادہ قربانیوں اور چند مخصوص مذہبی اعمال پر زور تھا۔ وہاں نہ بت تھے، نہ مندر اور نہ ان کے پروہت اور پجاری۔ ہر شخص اپنے گھر میں عبادت کرتا اور دیوتاؤں سے دعا مانگتا تھا لیکن دراوڑی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے قربانیوں کی جگہ بھگتی پر زور دیا جانے لگا اور بت پرستی کو ترقی ہوئی۔ اسی طرح موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں ویدوں میں کچھ سوچ بچار کے آثار تو ملتے ہیں لیکن آواگون کا نظریہ بعد میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ ہندو مذہب میں بنیادی

اہمیت اختیار کر گیا۔

ویدوں میں اتنے بڑے پیمانہ پر حذف و اضافہ کے دو خاص سبب ہیں۔ ایک یہ کہ وید دراصل رشیوں اور منیوں کے خیالات ہیں جو ان سے سنے گئے۔ ان خیالات کی عرصہ دراز تک زبانی تعلیم ہوتی رہی۔ لوگ ان کو یاد کرتے اور دوسروں کو یاد کراتے تھے۔ بہت بعد میں ان کو قلم بند کیا گیا اور ان کی تدوین و ترتیب ہوئی۔ ظاہر ہے جن خیالات کو محض یادداشت اور حافظہ کی مدد سے ایک لمبی مدت تک باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہو ان کا تغیر اور تبدیلی سے پاک رہنا عملاً ناممکن ہے۔ یہاں کوئی ایسا نوشتہ ہی نہیں تھا جس کی روشنی میں اصل صورتِ حال معلوم ہوتی اور تغیرات کو بروقت خارج کر دیا جاتا۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہی کتاب محفوظ رہ سکتی ہے جو کثرت سے پڑھی اور سمجھی جائے، جس کے خیالات سے عام طور پر لوگ واقف ہوں اور جس کے علوم و فنون ہمیشہ اور ہر سطح پر زیر بحث رہیں لیکن ویدوں کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں تھی۔ کیونکہ ان کی تعلیم ہمیشہ ایک محدود طبقہ میں ہوتی رہی۔ یہ طبقہ ویدوں کی جو تعبیر کرتا وہ آخری تعبیر ہوتی اور اس پر نقد و تبصرہ کا حق کسی کو نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہندو عوام روز بروز ویدوں سے دور ہوتے چلے گئے اور ان کے اندر ایک نیا مذہب ابھرنے لگا جو بڑی حد تک ویدوں کی تعلیمات سے مختلف تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندو عوام ویدک دیوتاؤں تک کو بھول گئے اور ان کے پورے نظام مذہب کا ویدوں سے برائے نام تعلق رہ گیا۔

وید کے بعد اہمیت ان تشریحات کو حاصل ہے جو براہمن کے نام سے مشہور ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ تشریحات حضرت مسیحؑ سے تین صدی قبل کی گئیں۔ ویدوں میں جن عبادات اور قربانیوں کا ذکر ہے ان میں ان کے معانی بیان کیے گئے ہیں۔

براہمن ہی کا ایک حصہ اپنشد ہیں۔ یہ خالص فلسفیانہ رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی تعداد سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے لیکن ان کے قدیم ترین شارح شنکر آچاریہ نے ان میں سے صرف سولہ کو اصلی اور مستند قرار دیا ہے۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ فرد کی روح اور روحِ عالم میں کیا فرق ہے اور آدمی وجود کی معصیت سے بچ کر کس طرح روحِ عالم میں جذب ہو سکتا ہے۔ وحدت الوجود کی طرف ویدوں میں جو اشارات کیے گئے ہیں ان میں ان کو منظم اور سائنٹفک شکل دی گئی ہے

جب غیر آرین اقوام سے آریہ قوم کی جنگ عملاً ختم ہو گئی اور وہ امن کی زندگی گزارنے لگے تو ویدک عہد کا

خیالات کی طرح اس کے دیگر علوم بھی ویدانگا کے نام سے مرتب ہوئے۔ اس کے چھ حصے ہیں۔ ایک میں قوانین اور روایات کا بیان ہے۔ دوسرے میں فلکیات سے گفتگو کی گئی ہے اور بقیہ حصوں میں لسانیات اور صرف ونحو وغیرہ کی بحث ہے۔

ویدوں کے احکام کے جو مجموعے تیار ہوئے بعد میں سمرتیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ یہ ویدوں کی مخالفت یا ان سے آزاد نہیں ہیں بلکہ ان کی بنیاد ویدوں کی روایات ہی پر ہے۔ سمرتیوں کی تعداد بہت ہے۔ ان میں سب سے قدیم اور سب سے مشہور منوسمرتی ہے۔ یہ دوسری یا تیسری صدی کے قریب وجود میں آئی اور اب بھی ہندو قانون کی اساس ہے۔

ویدوں سے براہ راست ہندو عوام کا تعلق کبھی نہیں رہا لیکن ان تشریحات اور قوانین کے مجموعوں کے وجود میں آنے کے بعد خود ہندو مذہب بھی ویدوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ وید اور ان کی تعلیمات پیچھے چلے گئے اور بعد کی یہ تشریحات مذہب کی اساس بن کر سامنے آگئیں لیکن جب وید خود اپنی اصلیت کھو چکے اور قابل اعتماد نہیں رہے تو ان تشریحات پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے اور ان کو خدا کا دین کس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے

رضائے الٰہی

ڈاکٹر عبد الحق انصاری

مقصد زندگی کے اسلامی نظریہ کا پانچواں اہم لفظ رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ کسی عمل کے مقبول ہونے کی تین شرطیں ہیں، ایک یہ کہ ایمان کے ساتھ ہو، دوسرے یہ کہ احکام شریعت کے مطابق ہو۔ تیسرے یہ کہ خدا کی رضاجوئی کے لیے ہو۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ
أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ
الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

(مومن :- ۴۰)

اور جو نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا
عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو ایسے سب لوگ جنت
میں داخل ہوں گے جہاں ان کو بے حساب رزق
دیا جائے گا۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ
أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ
بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ
مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ
أَجْرًا عَظِيمًا ۝

(نساء - ۱۱۴)

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی
بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ
و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں
کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے
تو یہ البتہ بھلی بات ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی رضاجوئی
کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے

عبادت ہو، اطاعت ہو، ذمہ داری خلافت کی ادائیگی ہو، تقویٰ ہو، احسان ہو یا تزکیہ ہو کسی عمل کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ خدا کی رضاجوئی کے لیے ہو اور ریا و نمود کی ہر آمیزش سے پاک ہو۔ خدا کی مخلصانہ رضاجوئی ہر عمل صالح کی صحت و مقبولیت کے لیے ضروری ہے اور اسی پر اجر و ثواب کا مدار ہے۔ فرمان نبوی ہے:

انما الاعمال بالنیات — اعمال کا مدار نیتوں پر ہے ۔

قرآن مجید نے خدا کی مخلصانہ رضاجوئی کی تاکید بار بار کی ہے اور ہر طرح کے فعل کے سلسلے میں اس کی یاددہانی فرمائی ہے :۔

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ (زمر ـ ۱۱)

اے نبی ان سے کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کرکے اس کی بندگی کروں ۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (نساء ۱۴۶)

البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں ۔

تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا (فتح، ۲۹)

تو انھیں کبھی رکوع کرتے کبھی سجدہ کرتے اور اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی جستجو میں لگے ہوئے دیکھے گا ۔

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّھِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ (رعد ـ ۲۲)

اور جو اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں آخرت کا گھر انھی لوگوں کے لیے ہے ۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِیْنَ ۝ اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ

جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا ان میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار رہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ۔ ان سے ڈرو" ۔ تو یہ سنکر ان کا

اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ	کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا
وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ○ فَانْقَلَبُوْا	کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز
بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ	ہے۔ آخر کار وہ اللہ کی عنایت سے اس طرح پلٹ
یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ	آئے کہ ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی
اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ○	رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہوگیا اللہ بڑا
آل عمران: ۱۷۲-۱۷۴	فضل فرمانے والا ہے۔
وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ	اور سلیمان نے کہا اے میرے رب! مجھے
نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی	قابو میں رکھ کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کرتا رہوں
وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا	جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا
تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ	عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے
عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ○ (النمل: ۱۹)	مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر

ان آیات سے واضح ہے کہ خدا کی رضا جوئی حقیقت میں ارادہ اور نیت کی چیز ہے جسے اسلام زندگی کے ہر نیک عمل کا محرک دیکھنا چاہتا ہے۔ عبادت، اطاعت، جہاد، انفاق، صبر و شکر، توبہ و توکل، اصلاح بین الناس، امر بالمعروف، اعتصام بحبل اللہ، جہاد غرضیکہ زندگی کا کوئی کام ہو مطلوب یہ ہے کہ لوجہ اللہ ہو اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہو اور یہ نا جائز محرک اور غلط جذبہ سے پاک ہو۔

رضائے الٰہی کوئی علیحدہ اور مستقل مقصد نہیں ہے جس طرح کہ عبادت، اصلاح بین الناس، امر بالمعروف اعتصام بحبل اللہ، صبر و توکل اور دوسرے مقاصد ہیں۔ یہ مقاصد ایک دوسرے سے علیحدہ اور مستقل ہیں۔ ایک کی طلب دوسرے کی طلب سے جدا ہے اور ایک کا حصول دوسرے کے حصول کو مستلزم نہیں ہے۔ مگر رضائے الٰہی کا مقصد ان مقاصد یا ان جیسے دوسرے مقاصد سے الگ کوئی نیا مقصد نہیں ہے۔ نہ اس کے حصول کی کوشش ان مقاصد کے حصول کی کوشش سے علیحدہ ہے۔

رضائے الٰہی کے مقصد کی حیثیت غایت الغایات کی ہے۔ وہ سارے ہی دوسرے مقاصد اور اعمال کی آخری غایت ہے۔ مگر اس غایت الغایات کا تعلق دوسری غایتوں سے مقصد اور ذریعہ کا تعلق نہیں ہے، کیونکہ اس غایت الغایات کا وجود تمام غایتوں سے علیحدہ اور مستقل وجود نہیں ہے۔ دراصل خدا کی رضا جوئی ہر غایت

ہر مقصد اور ہر عمل کا ایک مخصوص جزء ایک مشترک صفت ہے جو ان مقاصد اور اعمال کی فرداً فرداً صحت اور مقبولیت کے لیے ناگزیر ہے۔ اگرچہ مقاصد و اعمال کی صحت اور مقبولیت کا تمام تر انحصار اس پر نہیں ہے کیونکہ کسی عمل کی مقبولیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالصۃً لوجہ اللہ ہونے کے ساتھ احکام شریعت کے مطابق بھی ہو۔

زیادہ بہتر تعبیر ہوگی کہ خدا کی رضا جوئی کسی مخصوص عمل کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک مخصوص محرک کا نام ہے جو ہر مقبول عمل کا تنہا لازمی محرک ہے یا اس کے محرکات کا لازمی جزء ہے۔ خدا کی رضا جوئی کی کوشش ہر اس مقصد کے لیے کوشش سے عبارت ہے جس کے لیے کوشش کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہو یا جس کے لیے سعی اس کو پسند اور مطلوب ہو اور یہ کوشش برضا و رغبت انجام دی جائے اور اس شعور کے ساتھ انجام دی جائے کہ یہی تقاضائے بندگی ہے۔

اعمال کے محرکات مختلف ہوتے ہیں کسی عمل کو خدا کی رضا کے لیے انجام دینے کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ دوسرے محرکات کی نفی کر دی جائے، بلکہ صرف ان محرکات کی نفی کرنی ضروری ہے جو غلط اور ناجائز ہوں یا جن سے نمود و نمائش مقصود ہو۔ جائز اور صحیح محرکات رضائے الٰہی کی طلب کے منافی نہیں ہیں۔ مثلاً حج میں خدا کے ذکر کے ساتھ کسب رزق کی نیت خدا کی خوشنودی میں قادح نہیں ہے اور انفاق مال میں خدا کی رضا جوئی کے ساتھ اطمینان قلب اور خود اعتمادی کا جذبہ بھی شامل ہو سکتا ہے۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ	اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دو
رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ	کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے
كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ	پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے
لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ	دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور
مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ	چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام
بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ (حج - ۲۸)	لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں۔
مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ	کے لیے اور اپنے اندر پختگی اور ثابت قدمی پیدا
اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا	کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال

وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (بقرہ۔ ۲۶۵)	ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

قرآن مجید نے مختلف احکامات کی غرض و غایت بتائی ہے اور ان کے پیش نظر مقاصد واضح کیے ہیں ان احکامات کو خدا کی رضا جوئی کے جذبے سے بجالانے اور ان کے مقاصد کے شعور اور ان کے حصول کے جذبے کے ساتھ بجالانے میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ بلکہ ان مقاصد کے ذکر سے قرآن کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان کا شعور مطلوبہ احکامات کے بحسن و خوبی انجام دینے میں معاون ثابت ہوگا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (انفال: ۲۴)	اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے
وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝	اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ دراصل ان کا قتل ایک بڑی غلطی ہے۔
وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ...... وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (اسراء: ۳۱-۳۵)	زنا کے قریب نہ پھٹکو وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ ...... پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔
وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ (بقرہ: ۱۷۹)	عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

نکاح کو لیجیے۔ اس حکم کے پیش نظر مختلف مقاصد ہیں بعض کا تذکرہ قرآن و سنت میں صراحتاً آیا ہے، بعض کا علم دوسرے ذرائع سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک مقصد نسل کی بقا و افزائش ہے۔ دوسرا فحش کاری، بری نظر اور غلط افکار سے تحفظ ہے۔ تیسرا مقصد جنسی خواہش اور جمالیاتی ذوق کی تسکین ہے۔ چوتھا مقصد نفسیاتی اور روحانی

سکون ہے۔ پانچواں مقصد اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی ہے۔ مثلاً عورتوں کی عصمت کی حفاظت، ان کی غریبانہ زندگی کی کفالت، بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ، خدا کی خوشنودی کے لیے حکم نکاح کی تعمیل، نہ صرف یہ کہ مذکورہ مقاصد کی تحصیل کے منافی نہیں، ان کی شعوری تحصیل کو مستلزم ہے۔

ان مقاصد کے شعور اور ان کی تحصیل کے جذبے کے بغیر خدا کی رضا جوئی کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

بسا اوقات خدا کی خوشنودی دوسروں کی خوشنودی پر موقوف ہوتی ہے۔ مثلاً عام حالات میں خدا کی رضا اس میں ہوتی ہے کہ والدین کو خوش کیا جائے اور ان کی مرضی پوری کی جائے۔ کبھی کسی دوست کی، کبھی کسی اجنبی کی، کبھی کسی غریب و مسکین کی، کبھی بیوی کی، کبھی اولاد کی خوشی میں خدا کی خوشنودی ہوتی ہے۔ ان ساری رضا جوئیوں پر خدا کی رضا جوئی موقوف ہوتی ہے۔ اور یہ ساری رضا طلبیاں عین خدا کی رضا طلبی ہوں گی۔ اگر اس شعور کے ساتھ ہوں کہ یہی خدا کو مطلوب ہیں۔

خدا کی رضا جوئی کا اصول نہ تو احکامات کے مدارج متعین کرتا ہے اور نہ ہی مقاصد دین کی باہمی اہمیت اور اضافی قدر و قیمت — کون سا حکم فرض و واجب ہے، کون مستحب اور کون صرف مباح، کون سا مقصد اعلیٰ ہے اور کون ادنیٰ —؟ ان چیزوں کے تعین کے اصول و معیار الگ ہیں اور ان کے جاننے کے طریقے جدا ہیں۔ رضائے الٰہی سارے اعمال صالحہ کا ایک مشترک محرک اور ایک مشترکہ غایت ہے۔ اس کی بنیاد پر اعمال کے درمیان درجہ اور مرتبہ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

خدا کی رضا جوئی کے معنے کبھی کبھی خدا کی ان مرضیات کی طلب کے لیے جاتے ہیں جو فرض و واجب نہیں ہیں۔ اس مخصوص معنے میں اس لفظ کا استعمال غلط نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں محدود نہیں ہے۔ مگر اس ضمن میں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ سنن اور مستحبات کے حدود اتنے ہی وسیع ہیں جتنے کہ فرائض و واجبات کے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اعمال کا ایک دائرہ فرض و واجب کا ہے اور دوسرا سنت و مستحب کا۔ خدا کی رضا صرف ایک شعبۂ زندگی کے فرائض اور اس کی سنتوں اور مستحبات کی ادائیگی سے حاصل نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ اس میں محدود ہو۔ خدا کی رضا جوئی کا تقاضا ہے کہ زندگی کے سارے فرائض اور واجبات ادا کیے جائیں۔ سارے محرّمات سے بچا جائے اور سنتوں اور مستحبات میں دین نے جو درجہ بندی کر دی ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شعبۂ زندگی میں ان کے حصول کی کوشش کی جائے۔

خدا کی رضا جوئی میں اخلاص کا جذبہ بعض لوگوں کو ایک غلط انتہا پر لے جاتا ہے۔ وہ غلط اور ناجائز

محرکات اور ریا و نمود کے جذبات کی نفی پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ دوسرے ہر جائز، مستحسن اور مطلوب محرک کی نفی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال جنت کی طلب ہے۔ ان حضرات کے خیال میں جنت کی نیت اور اس کی طلب اخلاص و للّٰہیت کے لیے ایک ایسا داغ ہے جسے دھوئے بغیر احسان و کمال کی منزل تک پہنچا نہیں جاسکتا۔ ان میں سے کچھ تو وہ لوگ ہیں جو صرف خدا کی محبت کو واحد صحیح محرک سمجھتے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جو اطاعت برائے اطاعت کے اصول کے قائل ہیں اور ہر جذبہ اور ہر دوسرے غرض اور مقصد کی آمیزش کو اطاعت میں نقص تصور کرتے ہیں۔

یہ دونوں تصورات غیر قرآنی ہیں۔ قرآن مجید نے بار بار جنت کی طلب پر ابھارا ہے۔ بار بار اس کی تمنا کرنے اس کے لیے دعا کرنے، اس کے لیے مسابقت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ مختلف جگہوں پر انبیاء کرام، صدیقوں اور شہداء کو جنت کی طلب کرتے، اس کے لیے تضرع کے ساتھ دعا کرتے اور غیر معمولی شوق کا اظہار کرتے دکھایا گیا ہے۔ جنت کی طلب کو خلوص نیت میں آمیزش قرار دینے والے حضرات جنت کا ایک ناقص تصور رکھتے ہیں جو قرآن کے تصور جنت سے مختلف ہے اور دوسری طرف انسان کا ایک ایسا مجرد تصور رکھتے ہیں جس کے اعتبار سے انسان محض ایک روحانی اور عقلی وجود رہ جاتا ہے اور جسم و مادہ کی حیثیت صرف ایک غیر ضروری اور مکروہ آلائش کی ہو جاتی ہے۔ انسان کا یہ مابعد الطبیعاتی تصور سراسر غیر قرآنی ہے۔

علامہ ابن قیمؒ نے ان حضرات کے ناقص تصور جنت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

التحقیق الجنۃ لیست اسما مجرداً للاشجار والفواکہ والطعام والشراب والحور العین والانہار والقصور واکثر الناس یغلطون فی مسمی الجنۃ فان الجنۃ اسم لدار النعیم المطلق الکامل ومن اعظم نعیم الجنۃ التمتع بالنظر الی وجہ اللہ العزیز وسماع کلامہ وقرۃ العین بما تقرب منہ وبرضوانہ (مدارج السالکین ۱: ۴۳)	درحقیقت جنت محض درختوں، پھلوں، کھانے پینے کی چیزوں، بڑی بڑی آنکھوں والی عورتوں، نہروں اور محلات کا نام نہیں ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ جنت سے کیا مراد ہے۔ جنت تو مکمل اور غیر محدود نعمت کا گھر ہے۔ جنت کی سب سے بڑی نعمت خدا کا دیدار، اس کی باتیں سننا، اس کی رضامندی اور قربت سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنا ہے۔

اسلامی معاشیات کے چند رہنما اصول

(سید احمد قادری)

آج جب انسانوں کی عظیم اکثریت تمام دوسرے راستوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے صرف ایک راستے مادی ترقی کے راستے پر سرپٹ دوڑ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کرکے اسے پکاروں ــــ " اے خدا کی اشرف ترین مخلوق! تو کدھر جا رہی ہے ذرا رک جا۔ اے انسانوں کے تیز رفتار قافلو! تم بھیڑوں کے ریوڑ بن گئے ہو، ذرا تھم جاؤ۔ تم جس راستے پر دوڑ رہے ہو اس کے آگے ایک بے انتہا لمبی چوڑی کھائی ہے، سانپوں اور بچھوؤں سے بھری ہوئی، آگ کے شعلوں سے بھری ہوئی جو تمہیں نگل جائے گی، تم سب کو نگل جائے گی، رک جاؤ، رک جاؤ، برے انجام سے بچنے کا ابھی وقت ہے رک جاؤ"

واقعہ یہ ہے کہ انسان جب تک اپنی موجودہ زندگی، اس کے کاروبار اور اس کی سرگرمیوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہ کرے اور اس پر غور و فکر کے لیے وقت نہ نکالے کوئی آواز اس کے کانوں سے اتر کر اس کے دل میں نہیں سما سکتی۔ اس وقت کا حال تو یہ ہے کہ مادی دنیا سے ماوراء کسی اخلاقی و روحانی دنیا کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کچھ سن لینے پر بھی بہت کم لوگ آمادہ ہیں۔

دین اسلام اگرچہ ایک ایسا مکمل ترین نظام ہے جس کے دائرے سے زندگی کا کوئی شعبہ باہر نہیں ہے اور جو اس دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے بہترین اصول عطا کرتا ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ وہ اس دنیا کی مادی ترقی و خوش حالی کو انسانی زندگی کا مقصد و مطمح قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک یہ دنیا فانی ہے اور یہاں انسانوں کا قیام دائمی نہیں عارضی ہے۔ یہ ایک عارضی امتحان گاہ ہے جس کا نتیجہ ایک دوسری دنیا میں نکلنے والا ہے اور اسی دنیا کی کامیابی انسانی زندگی کا اصل مقصد و مطمحِ نظر ہے۔ زندگی کے اس نقطۂ نظر کو

تسلیم کیے بغیر اسلام کے کسی نظام کو چاہے وہ سیاسی ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا معاشی نہ سمجھنا آسان ہے اور نہ اُسے ماننا مفید ہے۔

اسلامی نظامِ حیات کے مختلف شعبوں کو سمجھنے میں اصل دشواری یہ پیش آرہی ہے کہ لوگوں نے زندگی کے اس نقطۂ نظر کو سمجھے اور ماننے بغیر اس کے مختلف شعبوں کو سمجھنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ اس الٹی ترتیب سے وہ اسلامی نظامِ حیات کو سمجھ نہیں پاتے۔

اسلامی نظامِ معیشت کے اصول اور اس کی تفصیلات بھی اس وقت تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک زندگی کے اس نقطۂ نظر کو مان نہ لیا جائے۔ ایک جگہ قرآن نے (جو اسلام کو جاننے کا مستند ترین ذریعہ ہے) بڑے خوبصورت اور جامع الفاظ میں اس نقطۂ نظر کو یوں واضح کیا ہے۔

"لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں، بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو۔ میں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔" (۳: ۱۴-۱۵)

ان آیتوں نے نہ صرف یہ کہ زندگی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کر دیا ہے بلکہ ان چیزوں کی جن پر معاشیات کی اساس قائم ہے، اصل حیثیت متعین کردی ہے۔ یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ یہ جملہ متعدد مقامات پر قرآن میں آیا ہے اور ہر جگہ اس نے پوری وضاحت سے معاشیات کی حیثیت متعین کردی ہے ظاہر ہے کہ جو چیزیں اپنی عارضی اور چند روزہ دنیوی زندگی میں برتنے اور استعمال کرنے کو دی گئی ہوں وہ ہماری زندگیوں کا مقصد و مطمحِ نظر نہیں بن سکتیں۔ مقصدِ زندگی یقیناً کوئی دوسری ہی چیز ہو سکتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسری چیز کیا ہے۔ اس اہم ترین اور بنیادی سوال کا جواب بھی ان آیتوں میں موجود ہے۔ رضائے الٰہی کا حصول وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کا مقصد و مطمحِ نظر بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔ جنت کا حصول رضائے الٰہی کے حصول کی دوسری تعبیر ہے۔

یہ ہے وہ نقطۂ نظر جس پر ایمان لائے بغیر اسلامی معیشت کے نظام کو سمجھنا اور اسے کسی مملکت کے چوکھٹے

میں فٹ کرنا بہت دشوار ہے ـــــ مقصد زندگی اور معاشیات کی اس اصل حیثیت کو جان لینے اور مان لینے کے بعد اس مسئلے پر سوچنے کا انداز ان لوگوں کے مقابلے میں یکسر تبدیل ہو جاتا ہے جو اس دنیا کے بعد کسی دوسری دنیا اور وہاں کے حساب و کتاب پر یقین نہیں رکھتے اور جو موت کو انسانی زندگی کا آخری ڈراپ سین سمجھتے ہیں جس کے بعد کسی دوسری زندگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

زندگی کے مقصد و مطمح نظر اور معاشیات کی حیثیت کا تعین، اسلام کے معاشی نظام میں وہ اساسی پتھر ہے جس کے بغیر اسلام کی معاشی عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی۔ آئندہ جو اصول بیان کیے جا رہے ہیں انھیں اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

(۱) معاشی نامساوات دنیا میں قدیم زمانے سے آج تک انسانوں کے درمیان جو معاشی عدم مساوات پائی جاتی ہے وہ فطری اور قدرتی ہے۔ انسانوں کے درمیان بہ لحاظِ رزق یہ تفاوت اللہ نے پیدا کیا ہے اور اسی نے بعض انسانوں کو بعض دوسرے انسانوں پر جو فوقیت عطا کی ہے وہ بعض کو عطا کرتا رہتا ہے۔ اس زمانے میں جب معاشی مساوات کے صور انقلاب سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس اصول کو اتنے سادہ اور دو ٹوک انداز میں پیش کرنا شاید بہت لوگوں کے نزدیک حکمت کے خلاف اور بہتوں کے نزدیک رجعت پسندی کی انتہا سمجھا جائے۔ لیکن میں مجبور ہوں کہ اسے اسی دو ٹوک انداز میں پیش کروں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ اسلامی معاشیات کا اہم اصول ہے۔

دنیا کی تاریخ، تجربہ، عقل اور مشاہدہ سب اس پر گواہ ہیں کہ انسانوں کے درمیان جو معاشی نامساوات پائی جارہی ہے وہ انسان کی پیدا کردہ نہیں ہوسکتی۔ اسے خدا نے پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں بھی اللہ کے نیک اور عادل بندوں نے اسے قابلِ اعتراض نہیں سمجھا اور نہ انھوں نے مصنوعی طور پر معاشی مساوات پیدا کرنے کی کوئی سعی کی۔ اس ناقابلِ انکار دلیل کے علاوہ دوسری ناقابلِ انکار دلیل اس دنیا کی سب سے سچی کتاب قرآن مجید ہے۔ متعدد آیتوں میں یہ بات اشارۃً اور صراحتۃً کہی گئی ہے کہ انسان کے درمیان رزق کے لحاظ سے تفاوت اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ میں ترتیب وار ان کو یہاں نقل کرتا ہوں

(الف) وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ (۶ : ۱۶۵)

قرآن مجید کے اس ٹکڑے میں ایک حقیقت تو یہ ظاہر کی گئی کہ انسان جو دنیا میں خدا کا نائب اور اس کا خلیفہ ہے۔ دوسری بات یہ بتائی گئی کہ خدا کے نائبوں کے درمیان درجات کا فرق ہے۔ یہ آیت انسانوں

کے درمیان بہت ساری چیزوں کے لحاظ سے عدم مساوات پر دلیل ہے۔ مثلاً انسانوں کے درمیان عقل و تمیز اور سیاسی و معاشی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے عظیم تفاوت ہے۔ اسی طرح ان کے درمیان مال و دولت، رزق اور جاہ و منصب کے اعتبار سے بھی بہت فرق ہے اور یہ فرق اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اس میں اشارۃً معاشی نامساوات کا ایک سبب بھی بیان کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عقل و تمیز اور سوجھ کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان یقیناً فرق ہے اور یہی فرق معاشی نامساوات کا ایک بڑا سبب ہے ـــــ اور تیسری بات اس آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے آزمائش اور امتحان کے لیے دیا گیا ہو

(ب) اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔ (۱۶: ۷۱)

سورۂ انعام کی آیت میں انسانوں کے درمیان عدم مساوات کے مجموعے میں معاشی نامساوات بھی چھپی ہوئی تھی۔ سورۂ نحل کی اس آیت میں اس کو الگ سے ظاہر کر دیا گیا ہے اور یہ بات کھول دی گئی ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کے درمیان رزق کے اعتبار سے تفاوت رکھا ہے۔

(ج) دنیا کی زندگی میں ہم نے ان کے درمیان وسائل معیشت کی تقسیم کی ہے اور ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بدرجہا فوقیت عطا کی ہے تاکہ ان میں سے بعض بعض دوسرے سے خدمت لے سکیں۔ (۴۳: ۳۲)

سورۂ زخرف کی اس آیت نے اس بات میں کوئی شبہہ باقی نہ چھوڑا کہ انسانوں کے درمیان معیشت اور وسائل معیشت کے لحاظ سے نامساوات تو دباری تعالیٰ نے پیدا کی ہے کسی انسان کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے اس آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ مال دار لوگ غریبوں کو بے گاریں پکڑیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دوسرے کے تعاون سے دنیا کا کاروبار درست ہو۔

معاشی نامساوات کیوں؟ اس زمانے میں بہت سے وہ لوگ بھی جو مسلمان ہیں اس اصول کی حکمت سمجھ نہیں پاتے اور ان کے دلوں میں یا تو اس کی طرف سے شک و تردد کا کانٹا کھٹکنے لگتا ہے یا وہ اسے اسلامی اصول ماننے ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کا پہلا اور اصلی سبب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ پورے اسلام کا بحیثیت ایک نظام کے گہرا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اس دین کا مزاج سمجھے بغیر اس اصول یا دیگر معاشی اصولوں کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ زمانے کی ہوا اور اس کی چلتی ہوئی رو سے متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں اور ہر ایسی چیز کھٹکنے لگتی ہے جو اس رو کے خلاف ہو

اوپر زندگی کے بارے میں اسلام کا جو نقطۂ نظر، اس کا جو مقصد اور معاشیات کی جو حیثیت بیان کی گئی ہے اگر کوئی شخص اسے بغور پڑھے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ انسانوں کے درمیان معاشی نامساوات ہی ہونی چاہیے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن فی الواقع اس میں تعجب کی کوئی چیز نہیں۔ بلکہ یہ تقاضائے عقل کے مطابق ہے۔

اسلام نے زندگی کا جو نقطۂ نظر ہمیں دیا ہے وہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے اس دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے، اُس نے انسانوں کو زندگی بخشی۔ بہترین جسمانی ساخت و ہیکل عطا کیا۔ اعلیٰ ترین دماغی و ذہنی صلاحیتیں مرحمت فرمائیں۔ اچھے اور برے صفات کا حامل بنایا۔ بے شمار نعمتیں اور وسائل دیے، اور ان پر تصرف کا اختیار عطا کیا۔ یہ سب کچھ دے کر اس نے اپنے پیغمبروں اور اپنی کتابوں کے ذریعے یہ بات واضح کر دی کہ مقصدِ تخلیقِ انسان کی آزمائش ہے۔ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسان زندگی کے مختلف مراحل اور مختلف حالات و کوائف میں کس طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے۔

صبر، شکر، فیاضی، ہمدردی، شرافت، مرحمت و مواسات، ایثار و مروت اور رفاہِ عامہ نیز دیگر امورِ خیر و صلاح میں امداد و تعاون ہمیشہ سے انسانیت کے اعلیٰ اور پسندیدہ اخلاق و صفات شمار کیے گئے ہیں اور اللہ نے بھی انھیں پسندیدہ اور اچھے اخلاق و صفات قرار دیا ہے۔ اسی طرح بے صبری، ناشکری، بخل، سنگ دلی، خود غرضی، بے مروتی اور رفاہِ عامہ نیز دیگر امورِ خیر و صلاح میں خلل اندازی اور عدم تعاون ہمیشہ سے انسانیت کے ادنیٰ اور ناپسندیدہ اخلاق و صفات شمار کیے گئے ہیں اور خدا نے بھی انھیں ناپسندیدہ اور برے اخلاق و صفات قرار دیا ہے۔

اس کے بعد دیکھیے کہ اللہ نے انسان کو جو کچھ دیا ہے وہ اصلاً صرف دو بڑی قسموں میں منقسم ہے۔ جان اور مال۔ اب غور کیجیے کہ انسانیت کے اعلیٰ اور پسندیدہ اور ادنیٰ و ناپسندیدہ اخلاق و صفات میں انسانوں کی آزمائش کے لیے مالی و معاشی مساوات مناسب ہے یا نامساوات؟

اسی طرح معیشت و وسائلِ معیشت کے اعتبار سے زندگی کے حالات و کوائف کا اختلاف مناسب ہے یا ان کی یکسانی؟

جو شخص بھی زندگی کے آزمائشی نقطۂ نظر پر ایمان رکھتا ہے اس کی عقل کبھی بھی معاشی و مالی مساوات اور حالات کی یکسانی کو مناسب قرار نہیں دے سکتی کیونکہ اس طرح انسان کی آزمائش ادھوری اور ناقص رہ جاتی ہے۔

مثال کے طور پر مفلسی اور فقر و احتیاج کی حالت میں انسان کے صبر اور ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ خدا یہ دیکھتا ہے کہ اس حالت میں میرا بندہ زندگی کی مشکلات برداشت کرکے حصول رزق کے ان ذرائع پر جما رہتا ہے جو میں نے اس کے لیے حلال قرار دیے ہیں یا حالات سے گھبرا کر وہ ان ذرائع کی طرف قدم بڑھا دیتا ہے جو میں نے اس کے لیے حرام قرار دیے ہیں۔ نیز یہ کہ اس حالت میں میرا بندہ مجھ سے راضی رہتا ہے یا ناراض ہو جاتا ہے اسی طرح دولت مندی و فارغ البالی کی حالت میں انسان کے شکر اور استقامت کا امتحان ہوتا ہے خدا یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے مال سے مفلسوں اور محتاجوں اور غریبوں کا حق نکالتا ہے یا خود غرضی اختیار کرکے اسے صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کے آرام پر صرف کر دیتا ہے۔ نیز یہ کہ دولت کی ریل پیل میں میرا بندہ انہیں لذائذ پر اکتفا کرتا ہے۔ جو میں نے اس کے لیے حلال کیے ہیں یا ان لذائذ کے حصول کی طرف لپکتا ہے جو میں نے اس کے لیے حرام کر دیے ہیں۔

اگر سب کے سب مالدار ہوں تو صبر و ایمان کی جانچ کیسے ہو اور اگر سب کے سب محتاج و تنگ دست ہوں تو شکر و استقامت کا امتحان کیونکر ہو۔ اللہ رب العزت اپنے وسیع علم و حکمت کے ماتحت یہ جانتا ہے کہ کس بندے کا امتحان کس چیز میں لیا جائے۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی جب تک محتاج و غنی دونوں موجود نہ ہوں امتحان ناقص ہوگا۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام نے انسانی زندگی کا جو اعلیٰ مقصد و مطمح نظر "رضائے الٰہی کا حصول" قرار دیا ہے وہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب انسان ہمہ جہتی آزمائش میں کھرا ثابت ہو اور یہ ہمہ جہتی آزمائش معاشی مساوات کی صورت میں ممکن نہیں ہے۔

اب اگر بہ فرض محال تمام انسانوں کے درمیان مصنوعی طور پر معاشی مساوات قائم کر دی جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ انسان اپنے مقصد زندگی کے حصول میں ناکام ہو جائے —— بہ فرض محال کا لفظ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ خدا نے یہ دنیا انسانوں کی آزمائش کے مقصد سے بسائی ہے۔ اور یہ مقصد پورا ہو کر رہے گا کسی انسانی طاقت کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ تمام انسانوں کے درمیان معاشی مساوات پیدا کرکے انسان کی ہمہ جہتی آزمائش کو روک دے۔

معاشی نامساوات حکمت و مصلحت پر مبنی ہے

اوپر کی بحث تو اس پہلو سے تھی کہ آزمائش کے نقطۂ نظر سے معاشی نامساوات ہی مناسب ہے۔

اب ایک اور پہلو سے اس مسئلہ پر غور کر لینا چاہیے۔ چونکہ رزق انسان کی بنیادی ضرورت ہے جس پر اس

کی زندگی کی بقا منحصر ہے ۔ اس لیے اس مسئلہ پر قرآن نے مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے تاکہ مومن پوری طرح مطمئن ہو جائے ۔

قرآن کہتا ہے کہ رزق کی تنگی و فراخی اور معاشی و اقتصادی عدم مساوات بندوں کی مصلحت کلی اور متعدد حکمتوں پر مبنی ہے ۔ اس حقیقت کو اس نے مجملاً متعدد مقامات پر بیان کیا ہے ۔ میں چند آیتیں یہاں درج کرتا ہوں :۔

(۱) تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے ۔ (۱۷ - ۳۰)

" وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے " یہ ٹکڑا اس مصلحت کلی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان تقسیم رزق میں کمی بیشی کی ہے وہ خالق ہے اور مخلوق کا علم اس سے بہتر کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا ۔ وہ ہر ہر بندے کے بارے میں الگ الگ یہ جانتا ہے کہ کس کے لیے رزق کی کشادگی مناسب ہے اور کس کے لیے رزق کی تنگی ۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں ادا کیا گیا ہے :۔

(۲) آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو پھیلا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناپ کر دیتا ہے بلاشبہ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے ۔ (۴۲ : ۱۲)

پہلی بات تو یہ کہی گئی کہ تقسیم رزق کی کنجی صرف اسی کے ہاتھوں میں ہے اس معاملے میں اس کا کوئی شریک سہیم نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ بلاشبہ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے یعنی رزق کی تقسیم الل ٹپ نہیں کہ جس کو جتنا چاہا دے دیا بلکہ یہ تقسیم اس کے وسیع علم پر مبنی ہے ۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنے والا انسان تنگدستی کو محتاج ہو کر بھی اپنے رب سے ناراض نہیں ہوتا ۔

(۳) کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے ۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں " (۳۹ - ۵۲)

اس آیت کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے یہ ہمیں بتاتا ہے کہ رزق کی کمی بیشی میں متعدد نشانیاں ہیں اور بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں لیکن ان حکمتوں تک انھیں کی رسائی ہوتی ہے جو ایمان دار ہیں ۔ دنیا کا کتنا ان حکمتوں اور

نشانیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ مثال کے طور پر جو لوگ معاشیات کی حیثیت کو جاننے اور دنیوی نعمتوں کی حقیقت سے واقف ہیں وہ کبھی بھی مال کی کمی اور زیادتی کو خدا کی بارگاہ میں مقبول و نامقبول ہونے کا معیار نہیں سمجھتے لیکن جو لوگ اس سے ناواقف ہیں وہ دولت کی فراوانی سے سخت دھوکا کھاتے ہیں۔

اسلامی معاشیات کا دوسرا اہم اصول انفرادی ملکیت ہے۔ اسلام کے معاشی

(۲) انفرادی ملکیت قوانین پر ایک سرسری نظر بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ اس کا پورا ڈھانچہ انفرادی ملکیت پر قائم ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم نہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے معاشی قوانین بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔ بلکہ دین اسلام کا ایک رکن زکوٰۃ بھی عملاً غیر ضروری قرار پائے گا۔ اسی طرح اس کا دوسرا رکن حج بھی کروروں افراد کے لیے عملاً ختم ہو کر رہے گا۔ اس کے علاوہ معاشی قوانین کا عظیم الشان قانونِ میراث بھی باقی نہ رہ سکے گا یہی نہیں بلکہ بہت سے معاشی قوانین انفرادی ملکیت کی اساس پر قائم ہیں۔ اس لیے اس اصول پر الگ سے کسی دلیل کی انطباقاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور میراث کی آیتیں، انفاق فی سبیل اللہ کی آیتیں قرض اور بیع و فروخت کی آیتیں، خلع اور مسئلۂ رضاعت کی آیتیں، نیز ان مسائل اور دیگر مسائل سے متعلق کثیر التعداد احادیث سب کی سب انفرادی ملکیت کے دلائل و براہین ہیں۔ اسی طرح کم ناپنے تولنے کی ممانعت، چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا، غصب اور رہزنی کی سزا، کسی کا مال تلف کر دینے پر تاوان ادا کرنے کی سزا اور اس طرح کے بیسیوں مسائل پر جو آیات اور احادیث موجود ہیں وہ بھی انفرادی ملکیت کے دلائل و براہین ہیں۔ اب اگر ان سب آیات و احادیث کو پیش کیا جائے تو اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا اور اپنی کتابوں کے واسطے سے اپنے ہر ہر بندے پر جو حقوق و فرائض عائد کیے ہیں، جن اخلاقی اقدار کو تسلیم کرنے اور ان کی نگہداشت کرنے کا پابند کیا ہے اور جس نوع کی زندگی بسر کرنے کا مطالبہ کیا ہے وہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک اس کی حاصل کی ہوئی چیزوں پر اس کے مالکانہ حقوق تسلیم نہ کیے جائیں۔

فی الواقع انفرادی ملکیت کے حق کی نفی اس نقطۂ نظر کی نفی ہے جو اسلام نے زندگی کے بارے میں عطا کیا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اس نقطۂ نظر کو ماننے سے انکار کر دے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے صحیح تسلیم کرے۔ اس پر ایمان کا مدعی ہو اور پھر انفرادی ملکیت کے حق سے انکار کرے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی اس طرح ضد ہیں جیسے سیاہی اور سفیدی ایک دوسرے کی

خدہیں ۔

اسلامی معاشیات کا تیسرا رہنما اصول یہ ہے۔

(۳) اللہ تمام جانداروں کے رزق کا کفیل ہے

(۱) "زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔" (۱۱-۶)

اس آیت میں تمام محتاجِ رزق جانداروں کی کفالت اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمے لے لی ہے۔ اس دنیا میں جو جاندار بھی پیدا ہوتا ہے اپنی روزی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کی روزی کا سامان یہاں مہیا کر دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان یا جانور پیدا تو ہو جائے، لیکن اس کے رزق کا حصہ یہاں موجود نہ ہو۔

(۲) اور کتنے ہی جاندار ہیں جو اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ انہیں روزی دیتا ہے اور تمہیں بھی اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (۲۹-۵۸)

اس آیت میں جانوروں کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر انسانوں کو مطمئن کیا جا رہا ہے کہ اصل روزی رساں اور حقیقی رازق اللہ ہے۔ اس لیے تمہیں اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے رزق کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کہا گیا۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو، کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھوں پر لادے نہیں پھرتے، لیکن وہ جہاں جاتے ہیں اللہ انہیں روزی وہیں پہنچا دیتا ہے۔ پھر تم اپنے بارے میں اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے یہ بدگمانی کیوں کرتے ہو کہ خدا تمہیں روزی نہیں دے گا۔ کیا تمہارا روزی رساں کوئی اور ہے؟ قتل اولاد سے منع کرتے ہوئے بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ روزی رساں اللہ ہے۔ اس لیے تم فقر و افلاس سے ڈر کر اپنے بچوں کو قتل نہ کرو۔ تمہیں بھی وہی رزق دیتا ہے، انہیں بھی رزق وہی دے گا۔ پھر تم اس گناہِ عظیم کا ارتکاب کیوں کرتے ہو؟

اس معاشی اصول سے چند فائدے بلا تامل معلوم ہو جاتے ہیں۔

(۱) اس حقیقت پر ایمان لانے والا طلب رزق میں اپنے آپ کو کسی کے سامنے ذلیل نہیں کرتا۔ اپنی خودی و خودداری کی حفاظت کرتا ہے۔

(۲) وہ حصول معاش کے ایسے ذرائع اختیار نہیں کرتا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ یہ یقین کرنا کہ اللہ تمام جانداروں کے رزق کا کفیل ہے اسے حرام ذرائع اختیار کرنے سے روک دیتا ہے۔

(۳) وہ فقر سے ڈر کر دوسروں کے حقوق تلف نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ ہر شخص کے رزق کا الگ الگ کفیل ہے۔ یہ معاشی اصول وہ ہے کہ اگر آج دنیا اسے تسلیم کرے تو ضبط ولادت کی تحریک اپنی موت آپ مرجائے۔

(۴) اللہ و رسول کی اطاعت اسلامی معاشیات کا چوتھا رہنما اصول یہ ہے کہ تمام معاشی معاملات میں بھی اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت کی جائے اور کوئی ایسا معاملہ نہ کیا جائے جو قانون اسلامی کے خلاف ہو۔ یہ ہمہ گیر اصول اسلامی معاشیات کو وہ اعتدال بخشتا ہے جو دنیا کے کسی نظام معیشت کو حاصل نہیں ہے۔ معاشی قوانین میں اللہ و رسول کی اطاعت کس درجہ ضروری ہے اس کا اندازہ سود کو بالکلیہ حرام کرنے والی آیت سے ہوتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر واقعی تم ایمان لائے ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ (۲ - ۲۷۸ - ۲۷۹)

اس جرم کی برائی اور خطرناکی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جس کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کو اعلان جنگ کی ضرورت محسوس ہو۔

یہ آیت جب نازل ہوئی تو سودی کاروبار مملکت اسلامیہ کی حدود میں فوجداری جرم بن گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت میں ہر جگہ اعلان کرا دیا کہ جو قبیلہ سودی کاروبار کرے گا اس سے جنگ کی جائے گی۔ اس کے علاوہ اب جس قبیلہ یا جس قوم نے بھی اسلامی حکومت سے صلح کرنی چاہی تو صلح نامے کی ایک دفعہ یہ قرار پائی کہ سودی کاروبار نہیں کرنا ہوگا۔ اگر کسی نے اس دفعہ کی خلاف ورزی کی تو صلح ختم ہو جائے گی اور اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے گا۔ اس شدت کی وجہ یہ ہے کہ کسی قوم یا کسی ملک کی معاشیات کو غارت کرنے والی لعنتوں میں سب سے بڑی لعنت سود ہے اور اللہ کی عادلانہ حکومت، مخلوق پر اس ہولناک ظلم کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔

ان چار رہنما اصولوں پر اسلامی معاشیات کی جو عمارت تیار ہوتی ہے وہ صاف ستھری، مضبوط و مستحکم اور سادہ و پُرکار ہوتی ہے۔ اس کے سایے میں امیر و غریب، قوی و ضعیف، تاجر و خریدار، زمیندار و کاشتکار اور آجر و مستاجر سبھی امن و چین کی زندگی بسر کرتے اور اپنے مقصدِ زندگی (باقی صفحہ ۸۱ پر)

اہم سوالات — واضح جوابات

(سید ابوالاعلیٰ مودودی)

بیروزگاری کا مسئلہ حل کرنے کیلیے سرمایہ داری، سوشلزم اور اسلام کا طریقِ کار

س

صنعتی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ بے روزگاری کا جو مسئلہ پیدا ہوتا ہے، کیا اس کا حل برتھ کنٹرول اور سوشلسٹ معاشی نظام کے بغیر ممکن ہے ؟

جواب

پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ یہ جو موجودہ صنعتی تہذیب ہے اس میں بیروزگاری کس طرح آئی ہے۔ آپ ایک جامع اور صحیح منصوبہ بندی کے بغیر جتنا زیادہ مشینری کو استعمال کرتے جائیں گے اتنا انسانوں کو استعمال کرنے کے مواقع کم ہوتے جائیں گے۔ مشینیں آگے بڑھتی جائیں گی انسان پیچھے ہٹتے جائیں گے۔ ایک مشین لگنے کے معنے یہ ہیں کہ ایک یا دو آدمی جو اس مشین پر کام کر رہے ہیں وہ اس مشین کی مدد سے اتنا کام کریں جتنا پہلے پچاس یا سو آدمی کرتے تھے ——— تو اس صنعتی تہذیب میں یہ چیز موروثی ہے کہ بے روزگاری پیدا ہو۔ اب اگر اس بے روزگاری کا علاج یہ تجویز کیا جائے کہ مزید آدمیوں کو پیدا نہ ہونے دیا جائے، بلکہ صرف اتنے آدمیوں کو پیدا ہونے کی اجازت دی جائے جتنے آدمی مشینوں کو چلانے کے لیے مددگار ہیں اور باقی انسانوں کو وجود میں آنے سے روکا جاتا رہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک وقت میں یہ صنعتی تہذیب ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے کہ ایک آدمی پورے ایک ملک کا کام مشین کی مدد سے انجام دے دیا کرے تو صرف ایک صاحب کی ضرورت باقی رہ جائے گی۔ باقی سارے انسان غیر ضروری اور بے کار قرار دیے جائیں گے اور انہیں رخصت

کرنے اور آئندہ کے لیے پیدائش کو مکمل طور پر روک دینے کی خاندانی منصوبہ بندی پر کام شروع ہو جائے گا۔ بے روزگاری کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ برتھ کنٹرول کے ذریعے آبادی کو گھٹانا شروع کر دیں۔ اس کا علاج ایک دوسرا اقتصادی نظام ہے جو کہ بیروزگاری کی خرابیوں کو دور کر سکتا ہے اور اس کے لیے ایک او رانداز کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اس وقت یہ سمجھ لیجیے کہ برتھ کنٹرول صرف ایک معاشی پہلو نہیں رکھتا۔ اس کے بعض اور بھی پہلو ہیں۔

درحقیقت برتھ کنٹرول کے کچھ اخلاقی نتائج ہیں اور کچھ نفسیاتی نتائج ہیں۔ اگر ان ساری چیزوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس کے تمام نقصانات سامنے آجاتے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سوشلزم بے روزگاری کا علاج کر دے گا تو وہ بھی نہ صرف غلطی پر ہیں بلکہ ناقص معلومات رکھتے ہیں۔ سوشلزم اس کا علاج نہیں کرے گا بلکہ ایک زیادہ بڑی بیماری لے آئے گا۔ اس وقت تو یہ نقشہ ہے کہ کچھ لوگ برسر روزگار ہیں اور کچھ لوگ بے روزگار لیکن بہرحال اس ملک کے عام باشندے آزاد تو رہتے ہیں۔ اس بات کا امکان تو رہتا ہے کہ ایک آدمی جو آج بے روزگار ہے کل کسی جگہ اسے ملازمت مل جائے وہ آزادی سے پھرے گا اور جہاں بھی اسے موقع ملے گا روزگار حاصل کرے گا۔ لیکن سوشلزم ایک پوری کی پوری کمیونٹی کو باندھ لیتا ہے۔ ملک کا انتظام چند ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور ملک کی پوری آبادی غلام بنکر رہ جاتی ہے۔ ساری صنعت اور زراعت ایک اقلیت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ زمین، مشین، تجارت یہ سب چیزیں وہ ایک چھوٹا سا گروہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ انسانی آزادیوں کو یوں سلب کر لینے کے بعد بھی یہ نظام بیروزگاری کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس وقت بھی روس میں بے روزگاری (UNEMPLOYMENT) موجود ہے۔ لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ سوشلزم بے روزگاری کو ختم کر سکتا ہے۔ روس میں سوشلزم بھی ہے اور بے روزگاری بھی فرق یہ ہے کہ یہاں کی بے روزگاری کی دنیا بھر میں تشہیر ہوتی ہے لیکن وہاں کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ وہاں کوئی مخالف جماعت اور اس کا اخبار نہیں ہے۔ کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں ہے جو ان خبروں کو دنیا کے سامنے لائے۔ کوئی ہڑتال یا احتجاجی جلسہ نہیں ہو سکتا۔ حالت یہ ہے کہ دو آدمی بیٹھ کر یہ بات کرتے ہیں کہ اس دور کو بدلنے کی ضرورت ہے لیکن قبل اس کے کہ یہ بات تیسرے آدمی تک پہنچے وہ جیل میں پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ نہ برتھ کنٹرول اور خاندانی منصوبہ بندی بے روزگاری کا کوئی حل ہے اور نہ سوشلزم اور اشتراکیت سے انسانی زندگی کے ان مسائل کا آبرومندانہ حل ممکن ہے۔

اس سب کچھ کا علاج اگر کوئی ہے تو وہ اسلام کے اقتصادی نظام کے پاس ہے۔ یہ نظام کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص بے روزگار ہو تو بیت المال فوراً اس کی کفالت کی ذمہ داری لے لے گا اور اس کی ضروریات فراہم کرنا شروع کر دے گا۔ جب بیت المال پر اس کا بار پڑے گا تو حکومت کو اس بات کا انتظام کرنا پڑے گا کہ اسے روزگار دلائے۔ یہ ہے اسلامی نظام میں بے روزگاری کے مسئلے کا حل۔

یہی نہیں بلکہ جہاں تک بے روزگاری کے آغاز اور اس کے پھیلنے کا تعلق ہے، اسلامی نظام اپنی ایک منصوبہ بندی اختیار کرے گا، جس میں انسان کی بھلائی نقطۂ آغاز ہوگی۔ مثلاً اس منصوبہ بندی کا تقاضا یہ ہو کہ کوئی کارخانہ بھی قائم کیا جا رہا ہو تو پہلے اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ مشینیں لگیں گی تو کتنے آدمیوں کو کام ملے گا اور کتنے آدمی بے کار ہو جائیں گے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ یہ کارخانہ کام شروع کرے سب سے پہلے ان آدمیوں کے لیے متبادل روزگار کا انتظام سوچا جائے گا۔ ہمارے زمانے کے منصوبہ بندوں کے دماغ میں اس طرح کی منصوبہ بندی نہیں آتی۔ وہ اس طرح سوچتے ہی نہیں۔ سوچنے کا یہ انداز صرف ایک اسلامی حکومت اپنا سکتی ہے جو مملکت کے ایک ایک فرد کے معاملے میں خدا کے حضور جواب دہی کا احساس رکھتی ہو۔

غیر سودی معاشی سوسائٹی اور ترقی

س

پاکستان ایک غیر سودی معاشی سوسائٹی برپا کرنے میں کیسے کامیاب ہوگا جب کہ اس کے پیش نظر ترقی بھی ہو؟

جواب

یہ سوال بہت تفصیل طلب ہے، تاہم میں مختصر طور پر اس کا جواب بتا دیتا ہوں۔ میری کتاب "سود" کا انگریزی ترجمہ نہیں ہوا، البتہ بنگلہ ترجمہ ہو چکا ہے آپ اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ غیر سودی معاشی سوسائٹی زیادہ پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی ہے بہ نسبت اس سوسائٹی کے جس میں سودی نظام کارفرما ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بچے کے پیدا ہونے کے وقت سے ہی اس کا خون نکالنا شروع کر دیا جائے تو اس کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سے فرض کیجیے کہ اگر سود کا روپیہ قرض لے کر کوئی صنعت قائم کی جائے یا تجارت شروع کی جائے تو وہ صنعت یا کاروبار منافع دینے کے قابل تو ـــــ ممکن ہے کہ ـــــ سال دو سال

ہیں ہوتی لیکن سود تو اسی روز سے اس پر بڑھنا شروع ہو جائے گا جس روز سے وہ قرض لیا گیا ہو، بلکہ ابھی کاروبار کا آغاز بھی نہیں ہوتا کہ سود لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کاروبار صنعت کے پھلنے پھولنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ جو لوگ یہ سرمایہ لے کر کام شروع کریں انہیں چاہے کچھ ملے یا نہ ملے، سرمایہ دینے والے کو پہلے روز سے سود ملنا شروع ہو جائے۔

پھر آپ دیکھیں کہ یہ سود آخر کن کی جیبوں سے ادا کیا جائے گا۔ جب ایک کارخانہ یا کاروبار اپنی اشیاء کی قیمتیں مقرر کرے گا تو اس میں دوسرے اخراجات کے علاوہ اس سود کی رقم بھی شمار کرے گا جو اسے ماہانہ یا سالانہ بنیادوں پر ادا کرنا ہوتا ہے۔ گویا سود کی یہ رقم ان اشیاء کے خریدنے والوں سے وصول کی جاتی ہے ———— یعنی نفع کارخانہ دار کا اور سود روپیہ دینے والوں کا اور سود ادا کرنے والے معاشرے کے عام انسان۔ کیا اس چیز سے ایک معاشرہ ترقی کر سکتا ہے؟ اسلام دراصل اسی لیے سود کو ختم کرنے کا حکم دیتا ہے کہ یہ ایک معاشرے کو پروان نہیں چڑھاتا بلکہ اس کا خون چوستا چلا جاتا ہے۔

جدید طبی سائنس اور مسلمان

س

کیا ماڈرن میڈیکل (جدید طبی) سائنس میں مسلمانوں کا بھی کوئی حصہ ہے؟

جواب

ماڈرن میڈیکل سائنس دراصل مسلمانوں ہی کی تحقیقات کے نتائج کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ اٹھارہویں صدی تک مغربی ممالک کے ہاں مسلمانوں ہی کی میڈیکل سائنس پڑھائی جاتی تھی۔ اس وقت تک اس سائنس میں جتنی ترقی ہوئی ہے اس سب کی بنا مسلمانوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ جدید آلات جراحی سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے تھے انہیں کو ترقی دے کر رفتہ رفتہ موجودہ شکل اختیار کی گئی ہے۔ مختلف قسم کی دوائیں بھی اس وقت [illegible] استعمال ہو رہی ہیں [illegible] پہلے مسلمانوں کی میڈیکل سائنس میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس میں [illegible] زمانے میں [illegible] بیسویں صدی میں میڈیکل سائنس میں جو ترقی ہوئی ہے اس میں مسلمانوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس لیے کہ مسلمان پچھلی کتابیں ہی پڑھتے پڑھاتے رہے آگے انھوں نے تحقیقی کام نہیں کیا

لیکن یہ مغربی عالموں کی بد دیانتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے (CONTRIBUTION) کو چھپانے کی کوشش کی ہے اور اسے اس طرح سے پیش کرتے ہیں گویا یہ سب کچھ ان کا کیا ہوا ہے۔ دوسروں نے کچھ نہیں کیا اس سلسلے میں مفصل معلومات کے لیے انگریزی، اردو اور بنگلہ زبانوں میں متعدد کتب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے بہت سے لوگوں نے اس کے متعلق لکھا ہے ۔

زاویہ نگاہ کی تبدیلی کیا فرق پیدا کردیتی ہے ؟

س

آپ نے اپنی گزشتہ روز کی تقریر میں فرمایا تھا کہ جب بھی مسلمانوں نے غیر مسلموں کے کسی علم اور ثقافت کو اختیار کیا ہے تو انھوں نے ان علوم اور ثقافت کو مسلمانوں کے علوم اور ثقافت میں تبدیل کردیا کر براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیے

جواب

دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں ان میں ایک چیز ہوتی ہے فطرت کے حقائق (FACTS OF THE NATURE) جو امر واقعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ایک چیز ہے انسان کا دماغ، جو ان چیزوں کو ترتیب دیتا ہے اور ترتیب دے کر ایک نظریہ بناتا اور ایک تصور (CONCEPT) اختیار کرتا ہے ۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے وہ عالمگیر ہیں۔ حقائق ہندوستانی یا پاکستانی، روسی یا جاپانی نہیں ہوسکتے، وہ تو محض حقائق ہیں لیکن روسی دماغ (اور اس سے مراد میری موجودہ کمیونسٹ نظام ہی) ان حقائق کو مارکسی ذہن کے ساتھ جمع کرتا ہے ۔آپ روسی سائنس اور اشتراکی فلسفہ وغیرہ کی اصطلاحیں سنتے ہیں یہ سب اس بات کی مثالیں ہیں ۔کیمونزم نے کائنات اور انسان کے متعلق ایک خاص تصور اختیار کر رکھا ہے ۔ اس کا اپنا ایک نظریہ تاریخ بھی ہے ۔ اب جتنے حقائق بھی کمیونسٹوں کے سامنے آتے ہیں خواہ وہ حیاتیات کے حقائق ہوں یا علم الابدان کے یا کسی اور علم کے، وہ ان سب کو ترتیب دے کر ایک اشتراکی نظریے کے مطابق ایک سائنسی نظام بناتے ہیں تاکہ اشتراکی معاشرے کا ہر بچہ سائنس کی وہ تعلیم حاصل کرے جو اشتراکی نظریے کے مطابق ہو۔ ایسا ہی دوسرے لوگوں کا معاملہ ہے ۔مثلاً مغربی سائنس داں ہیں ۔انھوں نے اپنے ذہن میں کائنات، خدا اور انسان

کا ایک تصور قائم کر رکھا ہے ۔ وہ اپنے اس تصور کے مطابق اس کائنات کے نظام کو بغیر خدا کے چلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک اس کائنات کے نظام میں خدا کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ وہ اپنی جگہ اپنے گھر میں خدا کی ہستی کو مانتے بھی ہیں، لیکن سائنس اور تاریخ اور فلسفہ کی دنیا میں وہ خدا کو غیر موجود فرض کرکے سارے حقائق کی توضیح و تشریح کرتے ہیں۔ اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ ایک خاص نقطہ نگاہ رکھنے والے کس طرح مختلف علوم اور سائنس کو اس خاص تصور کے مطابق مرتب کرتے ہیں ۔

مسلمانوں نے جب مختلف علوم و فنون سیکھے تو ان سب کو انھوں نے ان معنوں میں مسلمان بنا دیا کہ مسلمان کے دماغ سے سوچا اور جتنے حقائق بھی ان کے سامنے آئے ان کے بارے میں انھوں نے وہ بنیادی تصور اپنے سامنے رکھا جو اسلام نے انہیں عطا کیا ۔ اسی کے مطابق انھوں نے اس کی تشریح و توضیح کی ۔

اس بات کو آپ ایک مثال کے ذریعے دیکھیں ۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ پانی جب ایک خاص درجے تک ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ سکڑتا ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب وہ برف بننے کے قریب ہوتا ہے تو پھیل جاتا ہے ۔ برف ہلکی ہوتی ہے اس لیے پانی کے اوپر آجاتی ہے یہ ایک عجیب مظہر فطرت (PHENOMINA) ہے کہ جو چیز جتنی ٹھنڈی ہوتی چلی جائے گی اسی قدر سکڑتی جائے گی لیکن پانی ایک خاص درجے پر پہنچ کر سکڑنے کے بجائے پھیل جاتا ہے اور جب برف کی شکل اختیار کرتا ہے تو اپنے سے کم ٹھنڈے کے مقابلہ میں ہلکا ہوجاتا ہے ۔ موجودہ زمانے کا سائنس داں جب اس حقیقت کو بیان کرے گا تو وہ یہ کہے گا کہ ایسا ہوتا ہے کیونکہ یہ پانی کے سکڑنے اور پھیلنے کا قانون ہے ۔ مسلمان جب اس امر واقعہ کو بیان کرے گا تو کہے گا کہ خدا نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھی ہے اس لیے ایسا ہوتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص مصلحت کار فرما ہے ۔ اگر پانی برف کی صورت میں ہلکا ہو کر اوپر آنے کے بجائے بھاری ہو کر نیچے جاتا رہتا تو پورے سمندر برف بن جاتے، آبی زندگی ختم ہوجاتی اور پانی کے تمام جانور ختم ہوجاتے یہ خاصیت اللہ تعالیٰ نے پانی کے اندر رکھی ہے تاکہ یہ جانور محفوظ رہیں ۔ موجودہ سائنس داں بھی اس فائدے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ محض ایک فطری قانون ہے جب کہ مسلمان اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی حکمت دیکھتا ہے ۔ یہ فرق ہے ایک مسلمان سائنس داں کے بیان کرنے میں اور ایک ملحد اور کافر سائنس داں کے نقطۂ نگاہ میں ۔ مسلمان خدا کو اس کائنات کا خالق و مالک و فرماں روا سمجھتے ہوئے ہر چیز کی تشریح و توضیح کرے گا ۔

اخلاقی و روحانی ارتقاء اور مادی ترقی

س

مادی ترقی اور اخلاقی و روحانی ارتقاء میں توازن کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے؟

جواب

اس دنیا میں یہی تو انسان کی ساری آزمائش ہے کہ وہ اس دنیا کو برتے بھی۔ اس میں اپنی روزی، اپنی خوشحالی اور آسائش و آرام کے لیے کوشش بھی کرے لیکن ہر کام میں اپنے خدا کی خوشنودی اور رضا کو بھی پیش نظر رکھے اور اپنے اخلاق کو بھی ٹھیک رکھے۔ یہی انسان کی آزمائش ہے اور اسی توازن پر دنیا میں انسان کی کامیابی کا انحصار ہے۔ اسی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے قرآن مجید میں یہ بات بار بار ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اس دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرو کہ ہمیں خدا کو حساب دینا ہے۔ جب آدمی یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرے گا تو وہ اپنی خوش حالی کے لیے وہ کام تو کرے گا جس کے متعلق اسے یہ اطمینان ہو گا کہ یہ میرے رب کے احکامات کے مطابق ہیں لیکن جس جگہ اسے یہ محسوس ہو گا کہ یہ کام اگر میں نے کیا تو اس کا میں اپنے خدا کو جواب نہیں دے سکتا۔ اس جگہ وہ رک جائے گا۔ جو آدمی اس بات سے غافل ہو کہ اسے کبھی خدا کے حضور جواب دہی بھی کرنی ہے اور جا کر اپنا حساب بھی پیش کرنا ہے وہ بگٹٹ چلتا رہے گا جدھر بھی اس کے نفس کی خواہش اور اغراض چاہیں گی اسی طرف چلتا جائے گا لیکن جو آدمی یہ احساس رکھتا ہو کہ مجھے جا کر اپنے خدا کو حساب دینا ہے وہ ہر لفظ زبان سے نکالتے وقت، ہر کام کرتے وقت اور دنیا میں ہر جدوجہد کرتے وقت برابر یہ دیکھتا جائے گا کہ میں کس فعل اور کس بات کا جواب دے سکتا ہوں اور کس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ بس یہ توازن قائم کرنے کا نسخہ ہے جو قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے۔

اسلامی تحریک اور عالم اسلام

س

کیا عالم اسلامی میں اسلامی تحریک اور بھی ہے اور اگر ہے تو کس مرحلے پر ہے؟ کیا پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جماعت اسلامی ہے؟

جواب

تمام مسلمان ملکوں میں اسلام کے لیے کام ہو رہا ہے۔ کہیں منظم صورت میں اور کہیں اپنے اپنے طور پر۔ کوئی مسلمان ملک ایسا نہیں ہے کہ جہاں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اسلام کی سربلندی کے لیے کام نہ کر رہے ہوں انڈونیشیا، ترکی، ایران اور مختلف عرب ممالک میں، غرضیکہ کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس طرح کی تحریکیں یا افراد موجود نہ ہوں۔ جن ممالک میں حکومتوں نے ایسی رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں کہ وہاں منظم صورت میں تحریک نہیں چلائی جا سکتی وہاں غیر منظم صورت میں کام ہو رہا ہے۔ درحقیقت اس کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ آئینی طور پر مواقع کتنے ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے رکاوٹیں ہر جگہ موجود ہیں کہیں زیادہ ہیں اور کہیں کم۔ جہاں رکاوٹیں زیادہ ہیں وہاں تحریکیں ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ جہاں رکاوٹیں کم ہیں وہاں تحریکیں کافی آگے بڑھ چکی ہیں۔

جماعت اسلامی کے نام سے اس وقت ہندوستان میں جماعت موجود ہے۔ اور اب میں نے سنا ہے کہ نیپال میں بھی جماعت اسلامی قائم ہو گئی ہے۔ اسی طرح لبنان میں بھی اس کا قیام عمل میں آیا ہے لیکن ان میں سے کسی کا تعلق پاکستان کی جماعت اسلامی سے تنظیمی نوعیت کا نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر سے ہر جگہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے لیکن ہر جگہ ہر ملک میں اسی ملک کی جماعت منظم کی گئی ہے۔ کسی بین الاقوامی پیمانے پر کوئی تنظیمی تعلق نہیں ہے۔

مخلوط نظام تعلیم اور مسلمان طالب علم

س

ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عورتوں کے ساتھ مل کر تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن ہمارے دل اسے ناگوار سمجھتے ہیں۔ کیا ہم ایسی حالت میں ان سے مل جل کر تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں؟

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اس مخلوط تعلیم کے خلاف مسلسل آواز اٹھاتے رہیں اور آئینی حدود میں یہ مطالبہ کرتے رہیں کہ اس غلط تعلیمی نظام کو ختم کیا جائے اور لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے تعلیم کا الگ الگ انتظام کیا جائے لیکن جب تک آپ کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی اور یہ لوگ مخلوط تعلیم کو درس گاہوں میں جاری رکھتے ہیں اس وقت تک آپ یہ یوں سمجھیں کہ جیسے آپ ریل میں یا کسی جہاز میں سفر کر رہے ہیں اس میں عورتیں بھی ہوتی ہیں،

اور مرد بھی ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کے لیے شریعت کا یہ حکم ہے کہ آپ نظریں بچا کر رکھیں۔ اسی طرح آپ اپنے تعلیمی اداروں میں بھی اس حکم شرعی کی تعمیل کریں۔

غضِّ بصر جس کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے ایسے ہی حالات کے لیے ہے۔ آپ حتی الامکان نظریں بچائیں غضِ بصر کے معنے نظر نیچے رکھنے کے نہیں ہیں۔ لوگ غلطی سے اس کا ترجمہ نگاہیں نیچی رکھنا کرتے ہیں۔ شریعت کا مقصود ہر وقت زمین کو دیکھتے رہنا نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ نگاہ جما کر انہیں دیکھنے کی کوشش نہ کریں۔ اپنی نظر کو انہیں دیکھنے سے بچائیں۔ اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور اگر آپ اپنے کالجوں میں یہ رویہ اختیار کریں گے تو ان شاء اللہ ہر روز آپ کو اس کا ثواب ملتا رہے گا۔

اسلامی جمعیۃ طلبہ کی دعوت اور مشکلات

س

بعض والدین جمعیت کے کام کرنے کے مخالف ہوتے ہیں اور اپنے بچوں پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ اسے چھوڑ دیں۔ ایسے طالب علموں کا کیا فرض ہے جنہیں ایسی مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑے۔

جواب

ان کا فرض ہے کہ والدین کی اطاعت بھی کریں اور جمعیۃ کا کام بھی کریں۔ میں کسی طالب علم یا طالبہ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اپنے والدین کی نافرمانی کرے یا انہیں چھوڑ دے۔ اسلام نے ہمیں اس بات کا پابند کیا ہے کہ اولاد والدین کی اطاعت کرے، انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرے اور ان کی نافرمانی نہ کرے۔ دوسری طرف جہاں تک میں نے جمعیت کے مقاصد کا مطالعہ کیا ہے، وہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو کوئی گناہ یا برائی ہو، بلکہ ایک صحیح مقصد کے لیے جو ہر مسلمان کا مقصد ہے وہ ایمان داری کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ والدین اگر کسی طالب علم کو روکتے ہیں تو کسی غلط فہمی کی بنا پر روکتے ہیں، ان کے علم میں نہیں ہوتا کہ یہ جمعیۃ کیا ہے اور کیا کام کر رہی ہے اور اس میں خود ان کے بچوں کی کیا بھلائی مضمر ہے۔ وہ یہ حقائق نہ جاننے کی وجہ سے اپنے بچوں کو روکتے اور مخالفت کرتے ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے آپ اپنے والدین کو سمجھائیں اور بتائیں کہ ہماری جمعیت کیا ہے۔ انہیں بتلایئے کہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کرتے ہیں جو آپ کی ناراضی کا سبب بنے۔ ہم خدا کا کام ایمان داری

کے ساتھ کر رہے ہیں اور دین پر عمل کر رہے ہیں ـــــ اگر بعض والدین اس کے باوجود بھی نہ سمجھیں تو جاننا چاہیے کہ کچھ انسانی تعلقات ایسے ہوتے ہیں جنہیں قانون کنٹرول کرتا ہے اور کچھ انسانی تعلقات وہ ہوا کرتے ہیں جو قانون سے بالاتر ہوا کرتے ہیں۔ آخر بعض والدین ایسے بھی تو ہیں جن کی اولاد چوری کی عادت میں مبتلا ہو گئی ہے یا آوارہ ہو گئی ہے، سینماؤں میں بھٹکتی پھرتی ہے، جوئے کھیلتی ہے، آخر ان کے والدین بھی تو اپنی اولاد کو برداشت کر رہے ہیں تب آپ کو کیوں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ آپ مضبوطی کے ساتھ اپنا کام بھی جاری رکھیں اور والدین کو راضی رکھنے کی بھی کوشش کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ والدین جھڑکیں گے تو جھڑکی کھا لیجیے۔ ماریں گے تو پٹ لیجیے۔ ان شاء اللہ آپ کبھی نہ کبھی ان کا دل جیت ہی لیں گے۔ آپ کی راست روی اپنا کام ضرور کر دکھائے گی۔

مدارس عربیہ کے بعض اساتذہ اور تحریک اسلامی

س

ہمارے مدارس عربیہ کے بعض اساتذہ کرام تحریک اسلامی سے وابستگی کو برا مانتے ہیں۔ بسا اوقات ان سے تکرار ہو جاتی ہے تو وہ بددعائیں دینے لگتے ہیں اور تحریک کا کام بسا اوقات اسباق میں مخل ہو جاتا ہے تو وہ ہم پر ناراض بھی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا ہم شرعاً ان کی مخالفت سے ماخوذ ہوں گے اور کیا ہم اس سے خلاصی پانے کے لیے ان کی رضا کو تحریک پر فوقیت دینے سے عنداللہ ماخوذ ہوں گے؟

جواب

آپ اس سوال کو تین حصوں میں تقسیم کر لیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر تحریک کا کام آپ کے اسباق میں مخل ہوتا ہے تو اس صورت میں آپ کے استادوں کا آپ سے ناراض ہونا بالکل بجا ہے۔ اس لیے کہ کوئی استاد بھی یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ اس کا شاگرد تعلیم کے معاملے میں کوتاہی دکھائے۔ آپ کا فرض تو ہے کہ تحریک کا کام بھی کریں اور تعلیم کے سلسلے میں بھی اپنا فرض بحسن وخوبی پورا کریں۔ اگر آپ تحریک کے کام سے اپنی تعلیم کو نقصان پہنچائیں گے تو ظاہر بات ہے کہ استاد آپ سے ناراض ہونے میں حق بجانب ہوں گے۔

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ بات بات میں اساتذہ سے تکرار ہو جاتی ہے جس سے وہ بد دعائیں دینے لگتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ اساتذہ سے تکرار کریں ہی کیوں؟ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کے کوئی استاد آپ سے یہ سمجھنا چاہیں کہ آپ کی یہ تحریک کیا ہے تو آپ بتا دیجیے کہ آپ اور آپ کی تحریک کس مقصد کے لیے سرگرم عمل ہے، اگر وہ اس کے خلاف کچھ کہیں تو اسے خاموشی سے سن لیجیے۔ اگر ان کی بات غلط فہمی پر مبنی ہو اور وہ اسے سمجھنا چاہتے ہوں تو آپ اصل حقائق سامنے لے آئیے۔ لیکن اگر وہ سمجھنے کی کوشش نہ کریں اور خواہ مخواہ آپ سے بگڑ کر آپ کو الٹی سیدھی سنانا شروع کر دیں تو صبر کے ساتھ سن لیجیے لیکن تکرار ہرگز نہ کیجیے۔ تکرار ایک اسلامی تحریک کا طریقہ نہیں ہے۔

تیسرا حصہ یہ ہے کہ بعض اساتذہ کرام ایسے ہیں جن کو یہ تحریک سرے سے ہی ناگوار ہے اور وہ اس کام کو ہی برا سمجھتے ہیں۔ تو میں آپ سے یہ کہوں گا کہ آپ ان سے بس تعلیم حاصل کریں لیکن جو چیز آپ کے نزدیک حق ہے اور جس کے حق ہونے کو آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور جس کے حق ہونے پر آپ کا ضمیر مطمئن ہے اسے جاری رکھیں۔ آپ کو ایسے حضرات سے بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خاموشی کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہیں۔ فی الحقیقت یہ آپ کا نہیں خود اس قسم کے اساتذہ کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے اس طرزِ عمل کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب پیش کرتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۴۰) وطمح نظر کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ حکومت ان اصولِ اربعہ سے مستنبط قوانین کی نگراں ہوتی ہے، وہ اپنے تمام ذرائع و وسائل ایک طرف تو معاشی لوٹ کھسوٹ اور جبر و ستم کو مٹانے پر لگائے رکھتی ہے اور دوسری طرف زندگی کے اسلامی نقطۂ نظر پر ایمان رکھنے والوں کو ان کے مقصدِ زندگی کے حصول کی طرف متوجہ رکھتی ہے اور ان تمام چیزوں کو دور کرنے کی سعی کرتی رہتی ہے، جو انسان کو دنیا پرستی کی طرف مائل کرتی ہیں۔

۱۵ رمئی تا ۲۳ رمئی ۱۹۶۸ء

الحمد للہ کہ جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ۱۵ رمئی ۶۸ء سے شروع ہوکر ۲۳ رمئی ۶۸ء کو بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا۔

اس اجلاس میں تمام ارکان شوریٰ شریک ہوئے۔ امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب نے خطبۂ مسنونہ اور مختصر تمہیدی کلمات سے کارروائی کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد نومبر ۶۷ء اور اپریل ۶۸ء کی مجلس شوریٰ کی رودادیں پڑھ کر سنائی گئیں۔ اور ارکان نے اپنے دستخط ثبت کیے۔

میقاتی پروگرام

اس اجلاس کا خاص مسئلہ موجودہ چہار سالہ میقات کے لیے پالیسی اور پروگرام کا طے کرنا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں مختلف تنظیمی حلقوں کی مجالس مشاورت، نیز ارکان جماعت کی طرف سے جو رائیں اور مشورے موصول ہوئے تھے، ارکان شوریٰ نے اپنے اپنے طور سے بھی ان کا مطالعہ کیا اور ان کا خلاصہ بھی اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کے بعد پالیسی اور پروگرام کے مسئلہ پر تفصیلی غور وخوض کیا گیا اور نتیجے میں سابقہ پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے درج ذیل چہار سالہ (اپریل ۶۸ء تا مارچ ۷۲ء) میقاتی پروگرام طے کیا گیا۔

مسلمانوں میں دعوتی کام

۱۔ حسب سابق اس میقات میں بھی زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک جماعت کی دعوت پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ دعوت پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ کارکن کو یہ اطمینان ہو جائے کہ مخاطب نے دعوت کو ٹھیک طور سے سمجھ لیا ہے۔

۲۔ زیادہ سے زیادہ متفقین بنانے اور ان کے حلقے قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہر حلقے میں کتنے متفقین بنائے جائیں گے اس کا تعین ہر حلقہ خود کرے گا۔

۳۔ ہر وہ شخص جو فارم متفقین جماعت اسلامی ہند پر دستخط کردے متفق شمار کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ حلقہ متفقین کے لیے عملی پروگرام امیر جماعت، امیر حلقہ، ناظم ضلع یا امیر مقامی ان کے مشورے سے طے کریگا۔

۹۔ آئندہ حلقہ ہائے ہمدردان برقرار نہ رہیں گے اور ان سے متعلق افراد کو حلقہ ہائے متفقین میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔

مسلم خواتین میں دعوتی کام

۱۔ خواتین میں دعوتی کام کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دی جائے گی۔ اور ان کے حلقے منظم کیے جائیں گے۔

۲۔ کوشش کی جائے گی کہ ہر حلقے میں ایسی خواتین تیار کی جاسکیں جو خواتین میں دعوتی و تربیتی کام انجام دے سکیں۔

مسلم طلبہ میں دعوتی کام

۱۔ مسلم تعلیم یافتہ نوجوانوں اور طلبہ میں دعوتی کام کی طرف خصوصی توجہ کی جائے گی اور ان کے حلقے قائم کیے جائیں گے اور وقتاً فوقتاً ان کے لیے چند روزہ تربیتی اجتماعات منعقد کیے جائیں گے

۲۔ جہاں جہاں ممکن ہو ایسے مسلم ہوسٹل قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جہاں طلبہ کی دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کا بندوبست ہوسکے اور موجودہ مسلم ہوسٹلوں میں بھی اس کے بندوبست کی فکر کی جائے گی۔

مسلم عوام میں کام

مسلم عوام کے سلسلے میں حسب ذیل کام انجام دیے جائیں گے:۔

۱۔ اسلام کے بنیادی عقائد کی تفہیم۔

۲۔ نماز اور دیگر عبادات کا اہتمام

۳۔ اخلاقی و معاشرتی اصلاح

۴۔ معاشرتی اونچ نیچ ختم کرنا

۵۔ بے پردگی اور غیر ساتر لباس کی روک تھام

۶۔ شادی بیاہ اور دیگر مواقع سے متعلق غیر اسلامی اور مسرفانہ رسوم کا تدارک

۷۔ اخوت اسلامی کا فروغ اور کسی عمومی مصیبت کے وقت عملی ہمدردی

۸۔ باہمی تعلقات کی اصلاح اور اسلامی نظم و اتحاد پیدا کرنا۔

۹۔ دینی تعلیم و تربیت کے لیے مکاتب و مراکز تعلیم بالغاں وغیرہ قائم کرنا۔

۱۰۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر اور جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش۔

۴۔ فارم متفقین جماعت اسلامی حسب ذیل ہے :۔

فارم متفقین جماعت اسلامی ہند حلقہ ....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام .... ولدیت .... عمر ....

پتہ ....

میں نے جماعت اسلامی ہند کی دعوت کے بنیادی نکات کو اس فارم پر مذکور کتابوں کو پڑھ کر/سن کر سمجھ لیا ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے۔ انشاء اللہ میں اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا/کروں گی۔ اور جماعت کے دینی و اصلاحی اور خدمت خلق کے کاموں میں حتی الوسع تعاون کروں گا/کروں گی

دستخط .... تاریخ ....

میں تصدیق کرتا ہوں/کرتی ہوں کہ میرے علم کے مطابق مذکورہ بالا اندراجات صحیح ہیں۔

دستخط : رکن/متفق .... تاریخ ....

جناب .... صاحب کو جماعت اسلامی ہند کے متفقین میں شمار کیا جاتا ہے۔

دستخط مقامی امیر/ناظم حلقہ متفقین .... تاریخ ....

نوٹ : فارم پر مذکور کتابوں سے فی الحال حسب ذیل کتابیں مراد ہیں :۔

۱۔ حقیقت اسلام ۔ ۲۔ شہادتِ حق ۔ ۳۔ دستور جماعت اسلامی ہند سے عقیدہ و نصب العین مع تشریح

البتہ کوشش کی جائے گی کہ جلد از جلد ایک ایسا مختصر کتابچہ شائع کیا جائے جس سے دعوت کے بنیادی نکات بآسانی سمجھ میں آسکیں۔

۵۔ جس مقام پر دو یا دو سے زائد متفقین ہوں وہاں حلقہ متفقین قائم کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ حلقہ متفقین کا ایک ناظم ہوگا جس کا تقرر امیر مقامی/ناظم ضلع/امیر حلقہ/امیر جماعت، متفقین حلقہ کی رائیں سامنے رکھ کر کرے گا۔

۷۔ جس مقام پر مقامی جماعت موجود ہو وہاں متفقین اپنی مالی اعانتیں مقامی جماعت کے بیت المال میں داخل کریں گے اور جہاں مقامی جماعت نہ ہو وہاں ناظم ضلع، امیر حلقہ یا امیر جماعت کے مشورے سے کوئی اور مناسب صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔

۱۱۔ اپنے اوقاف کے تحفظ کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنا اور حکومت پر دباؤ ڈالنا کہ وقف بورڈ کی تشکیل میں نامزدگی کے بجائے انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

منتخب مسلم محلوں اور بستیوں میں کام

مسلم عوام میں عمومی طور سے مندرجہ بالا کام انجام دینے کے ساتھ منتخب مسلم محلوں اور آبادیوں کو خصوصیت سے مرکز توجہ بنایا جائے گا اور مذکورہ بالا کاموں کے علاوہ مزید حسب ذیل کاموں کے لیے بھی ان کو آمادہ کیا جائے گا اور ان کے تعاون سے ان کاموں کو انجام دینے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ تنظیم مساجد اور مقامی دینی اوقاف کا تحفظ اور انتظام

۲۔ یتیموں، بیواؤں اور معذورین کی امداد۔

۳۔ چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینا تاکہ بے کاری و بیروزگاری دور ہو سکے۔

۴۔ بلاسودی قرضوں اور امداد باہمی کے لیے فنڈ کا اہتمام

۵۔ صفائی، ستھرائی اور حفظان صحت کا اہتمام

۶۔ حسب گنجائش دارالمطالعہ کا قیام

۷۔ بستی کے عمومی مفاد سے متعلق مسائل کو اجتماعی طور سے حل کرنا۔

مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ

مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ بطور خاص سامنے رکھا جائے گا اور اس سلسلے میں حسب ذیل تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

فرقہ وارانہ صورت حال کے اعتبار سے ملک جس ہلاکت کی طرف جا رہا ہے۔ اس سے باشندگان ملک کی غفلت اور بے توجہی کا ایک بڑا سبب حالات و واقعات سے بے خبری ہے اس لیے صحیح حالات و واقعات کو ملک کے سامنے لایا جائے گا۔

۲۔ اکثریت کے امن پسند افراد کو شر پسند اور ملک کے فسادی عناصر کے خلاف کھڑے ہونے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے گا۔

۳۔ اس سلسلے میں ایڈمنسٹریشن پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور پھر ان کے سلسلے میں اس سے جو کوتاہیاں ہو رہی ہیں ان کی طرف اسے مؤثر انداز میں توجہ دلائی جائے گی۔

۴۔ مسلمانوں میں صبر و استقامت اور اعتماد و توکل علی اللہ کے جذبات پیدا کرنے کے ساتھ ان کو یہ احساس

دلایا جائے گا کہ حملوں کے وقت مایوسی اور گھبراہٹ کا شکار نہ ہوں بلکہ صورتِ حال کا جرأت و پامردی کے ساتھ مقابلہ کریں اور اپنی محافظت اور مدافعت کے لیے وہ تمام تدبیریں بروئے کار لائیں جو نہ شرعاً اور اخلاقاً غلط ہوں اور نہ مروجہ قانون کے خلاف۔ اور اس سلسلے میں سماج کے دیگر امن پسند عناصر کا تعاون بھی حاصل کریں

۵۔ ان غلط فہمیوں اور افواہوں وغیرہ کے ازالے کی کوشش کرنا جو مستقلاً یا وقتی طور سے ان کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی اور بسا اوقات فسادات کا موجب بنتی ہیں۔

دینی تعلیم اور اصلاحِ نصاب دینی تعلیم اور اصلاح نصاب کے سلسلے میں حسب ذیل کام انجام دیے جائیں گے۔

۱۔ مرکزی و ریاستی محکمۂ تعلیم کی طرف سے منظور یا شائع شدہ کتابوں کے ان مضامین کو جن کے ذریعہ ایک دھرم اور عقائد اور تصورات کی تبلیغ کی جا رہی ہے، یا جو اسلامی اصول و عقائد کے خلاف ہیں یا جو مسلمانوں کے مذہبی جذبات و احساسات کو مجروح کرتے ہیں ان کو نصاب و درسیات سے خارج کرانے کی مؤثر جدوجہد کی جائے گی۔

اس مقصد کے لیے ہر ریاست کے پرائمری و جونیر ہائی اسکول کے سرکاری نصاب و درسیات کا اس نظر سے جائزہ لیا جائے گا کہ ان میں کیا باتیں قابل اعتراض اور قابل حذف ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کے لیے آزاد پرائمری مکاتب قائم کریں

۳۔ مسلمانوں کے آزاد پرائمری مکاتب میں تعلیم پانے والے طلبہ کو جبری تعلیم سے مستثنیٰ کرانے کی کوشش کی جائے گی

۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے صباحی و شبینہ مکاتب قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے گا۔

۵۔ حسب ضرورت و گنجائش ہر حلقے میں اساتذہ کی ٹریننگ (تدریسی تربیت) کا انتظام کیا جائے گا۔

پرسنل لا ۱۔ پرسنل لا کے سلسلے میں مسلمانوں پر ان کی ذمہ داریاں واضح کی جائیں گی اور اگر کوئی ایسی قانون سازی کی جا رہی ہو جو پرسنل لا پر اثر انداز ہوتی ہو تو بروقت احتجاج کیا جائے گا۔

۲۔ دین میں پرسنل لا کا مقام اور پرسنل لا میں زیر غور ترمیموں کے سلسلے میں مسلمانوں کا موقف کتابوں، سیمینار اور سمپوزیم وغیرہ کے ذریعے واضح کیا جائے گا۔

۳۔ اس موضوع پر اردو، انگریزی اور مقامی زبانوں میں ضروری لٹریچر شائع کیا جائے گا۔

غیر مسلموں میں دعوتی کام غیر مسلموں میں دعوتی کام کی کمی کے پیش نظر اس میقات میں اس کام کی طرف خصوصی توجہ دی جائے گی۔

غیر مسلموں میں حسب ذیل کام انجام دیے جائیں گے۔

- اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ
- اسلام کا جامع تعارف
- جدید افکار و نظریات جو اخلاق و انسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں ان کی مضرتوں سے انہیں آگاہ کرنا۔
- معروف اخلاقی قدروں کی ترویج و اشاعت۔
- باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانا۔
- منکرات کے دفعیہ کی کوشش، مثلاً شراب نوشی، فحاشی وغیرہ۔
- چھوت چھات، ذات پات، نسل پرستی، لسانی اور صوبائی تعصبات، طبقاتی و فرقہ وارانہ کش مکش وغیرہ کو دور کرنے کی کوشش

غیر مسلموں میں دعوتی کام انجام دینے کے لیے ہر حلقے میں منتخب با صلاحیت کارکنوں کی اس طرح تربیت کی جائے گی کہ وہ علمی حیثیت سے اس کام کے لیے تیار ہو سکیں اور ان تک اپنی باتیں کس طرح پہنچانی ہیں اس سے بھی واقف ہو جائیں اور اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً ان کے اجتماعات بھی منعقد کیے جائیں گے۔

غیر مسلموں سے مرکز، حلقہ، مقامی ہر سطح پر دعوتی ربط قائم کیے جائیں گے۔ خصوصاً پارٹی لیڈروں، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبروں اور ذمہ داران حکومت سے۔

غیر مسلموں کو دعوت سے روشناس کرانے کے لیے اور اسلام و مسلمانوں اور ان کی تاریخ کے بارے میں ان کی ناواقفیت یا غلط فہمیوں کے ازالے نیز اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور رسول حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے واقف کرانے کے لیے اردو و ہندی انگریزی اور مقامی زبانوں میں مزید لٹریچر فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ملی جلی منتخب آبادیوں اور محلوں میں کام عام غیر مسلموں میں مذکورہ بالا کام انجام دینے کے ساتھ

ان کی اور مسلمانوں کی ملی جلی منتخب آبادیوں اور محلوں کو خصوصیت کے ساتھ مرکز توجہ بنایا جائے گا اور مذکورہ بالا کاموں کے علاوہ مزید حسب ذیل کاموں کو بھی ان کے تعاون سے انجام دینے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ خدمت خلق بالخصوص یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی امداد۔

۲۔ پس ماندہ اور مفلوک الحال لوگوں کو سماجی و معاشی اعتبار سے اونچا اٹھانے کی اجتماعی کوشش۔

۳۔ منکرات کے دفعیہ اور معروف اخلاقی قدروں کی ترویج

۴۔ امدادی اور رفاہی کاموں کے لیے مقامی طور سے فنڈ اکٹھا کرنا اور اس کے جمع و صرف اور حفاظت کا معقول بندوبست کرنا۔

۵۔ صفائی ستھرائی اور حفظان صحت کا اہتمام۔

نوٹ: ۔ کچھ بستیاں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن میں مذکورہ بالا دونوں قسم کی منتخب بستیوں میں سے کسی کا بھی پورا پروگرام اختیار نہ کیا جا سکتا ہو۔ وہاں حسب حال ان دونوں پروگراموں کو سامنے رکھ کر ملا جلا پروگرام بنایا جا سکتا ہے۔

آزادیٔ رائے و ضمیر آزادیٔ رائے و ضمیر ہر انسان کا فطری حق ہے اور ملک کی صحیح تعمیر و ترقی نیز جماعت اسلامی کی خود اپنی سرگرمیوں کے جاری رہنے کے لیے ملک میں اس کا قیام و بقا ایک ناگزیر شرط کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ان کوششوں کی مذمت کرنا جن کے نتیجے میں کلیت پسندی اور آمریت کے رجحانات فروغ پا سکیں اور ان کے مقابلے میں ان کوششوں کی تائید کرنا جن سے ملک میں آزادیٔ ضمیر اور جمہوریت کو فروغ حاصل ہو اور بوقت ضرورت اس کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا ہمارے پروگرام کا ایک جز ہوگا۔

ترقیاتی اسکیمیں ملک میں جس معاشی نظام کے قیام کی کوششیں ہو رہی ہیں وہ اگرچہ اس وجہ سے یک رخا نظام ہے کہ اس میں انسان کی مادی ضرورتوں ہی کو بطور اصل کے سامنے رکھا گیا ہے۔ درآنحالیکہ ملک کی حقیقی فلاح و بہبود ایک ایسے نظام کے قیام میں مضمر ہے جو معاشی ترقی کے ساتھ اخلاقی بہتری اور اخروی فلاح کا بھی ضامن ہو لیکن ایسی ترقیاتی اسکیموں یا ان کے اجزاء کی جو شرعی اور اخلاقی قباحتوں سے پاک ہوں، تائید کی جائے گی۔

دیگر جماعتوں سے تعاون اپنے پروگراموں کے سلسلے میں اپنے اصول اور تحریکی مصالح کو سامنے

رکھتے ہوئے مسلم وغیر مسلم جماعتوں اور اداروں کا تعاون حاصل کیا جائے گا اور ان سے تعاون کیا جائے گا۔

تربیت جس دین کے ہم داعی ہیں اس کا یہ اولین تقاضا ہے، نیز اس کا قیام اس پر موقوف ہے کہ اس کے داعیوں کی عملی زندگی زیادہ سے زیادہ اس کا نمونہ ہو اس لیے ہمیں اپنی اصلاح و تربیت کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرنی ہوگی۔

تربیت کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے:۔

مقاصد تربیت ۱۔ ایمانیات کی پختگی، خصوصاً وجود باری تعالےٰ اور توحید کا پختہ یقین، صفات الٰہی اور اس کے تقاضوں کا استحضار صحیح توازن کے ساتھ۔ زندگی بعد موت پر پختہ یقین، آخرت کی جوابدہی اور جنت و دوزخ کے مناظر کا ایسا استحضار کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی واقعۃً زندگی کا حقیقی مقصود بن جائیں۔ ایمان بالرسول کی پختگی اور اس کے تقاضوں کا صحیح شعور، اسلام کے واحد دین حق ہونے پر یقین، محبت خدا و رسول کا دلوں پر غلبہ۔

۲۔ انفرادی و اجتماعی کردار کی تعمیر اور اس بات کی کوشش کہ تقویٰ و احسان کی کیفیتیں پیدا ہوں۔

۳۔ داخلی نظم کا استحکام۔

۴۔ دعوتی کام کرنے کے لیے صلاحیت و استعداد اور عملی جذبے کی نشو و نما۔

۵۔ علم دین میں اضافہ اور اسلامی فکر میں پختگی۔

مقاصد تربیت کے حصول کے لیے حسب ذیل ذرائع اختیار کیے جائیں گے

ذرائع تربیت ۱۔ قرآن پاک، سیرت اور صالح لٹریچر کا گہرا مطالعہ جو فکر و عمل کو مقاصد تربیت کے لیے تیار کر سکے۔ صالح لٹریچر کے ذیل میں جماعت کا بنیادی لٹریچر اور ایسی کتابیں خاص طور سے داخل ہیں جن میں دین کی بنیادی باتوں توحید، آخرت اور رسالت، عبادات اور انفرادی و اجتماعی اخلاق سے بحث کی گئی ہو۔

۲۔ اذکار و نوافل، احتساب و استغفار اور انفاق مال۔

۳۔ دعوت کے لیے عملی جدوجہد

۴۔ مرحمت و مواسات اور خدمت خلق۔

• ہر رکن کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ اپنی تربیت کی زیادہ سے زیادہ فکر کرے۔ اس لیے اسے مقاصد تربیت کو سامنے رکھ کر ذرائع تربیت سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

● مقامی امرائے جماعت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ارکان جماعت کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ کریں اور اس غرض کے لیے ہر رکن سے شخصی ارتباط رکھنے کا خاص اہتمام رکھنا چاہیے۔

● مقامی اجتماعات کو تربیت کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ مفید اور موثر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

● امرائے حلقہ جات کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ارکان حلقہ اور مقامی امراء کی طرف پوری توجہ دیں۔

● امرائے حلقہ جات اپنے حلقہ میں سال میں کم از کم ایک بار اجتماعی تربیت کا انتظام حلقہ یا ضلع کی سطح پر کریں گے۔

● امرائے حلقہ جات اپنے دوروں میں خاص طور سے تربیتی مقاصد کو سامنے رکھیں گے۔

● اس میقات میں امرائے حلقہ جات کے دو اجتماعات منعقد کیے جائیں گے۔ جن میں خاص طور سے تربیتی پہلو سامنے رکھا جائے گا۔

تصنیفی پروگرام

اس میقات میں حسب ذیل کتب تیار کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ جماعت کی دعوت کے بنیادی نکات کی تفہیم کے لیے ایک مختصر کتابچہ آسان زبان میں (متفقین کے لیے)

۲۔ توحید، رسالت، آخرت اور دین کے ہمہ گیر تصور پر آسان زبان میں کتابچے (غیر مسلموں کے پیش نظر)

۳۔ "کوتاہ نظری"، "عقل کا فیصلہ" وغیرہ جیسے مضامین کو آسان زبان میں مرتب کرکے شائع کرنا

۴۔ غیر مسلموں کے عقائد و افکار وغیرہ کو سمجھنے میں مدد دینے کے لیے ایک کتاب

۵۔ ہندوستان میں چلنے والی تحریکوں کے تعارف پر ایک کتاب

۶۔ ایک کتاب "وحدت ادیان" پر اور ایک "پرسنل لائ" پر ـــــ مولانا صدرالدین صاحب۔

۷۔ رسالت پر ایک کتاب مستشرقین اور غیر مسلموں کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر۔ مولانا جلال الدین انصر صاحب

۸۔ احادیث کا ایک مجموعہ غیر مسلموں کے پیش نظر ہندی میں ـــــ جناب محمد فاروق صاحب

۹۔ موجودہ جماعتی درسیات پر نظر ثانی کی جائے گی اور مزید درسی کتب تیار کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ ملک کے مصنفین اور اہل قلم حضرات کو مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کرنے کی دعوت دی جائے گی اور ان کی اس خدمت کا انہیں معاوضہ بھی پیش کیا جائے گا۔

● شعبہ تصنیف میں ایک مزید صاحب صلاحیت فرد کا اضافہ کیا جائے گا

● علاقائی دارالاشاعتوں کو وسعت دی جائے گی تاکہ مقامی زبانوں میں بنیادی لٹریچر زیادہ سے زیادہ تیار ہو سکے

جماعتی اخبارات و رسائل جماعتی اخبارات و رسائل کی توسیع اشاعت کے لیے پوری جدوجہد کی جائے گی اور اس مقصد کے لیے ہر حلقے میں ہر سال کم از کم ایک ہفتہ منایا جائے گا۔

مرکز اور شعبۂ تنظیم کا پروگرام حسب ضرورت خود امیر جماعت بنائیں گے۔

نوٹ: مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس میقات کے لیے بھی وہی پالیسی برقرار رہے گی جو اس سے پہلے میقات میں رائج رہی ہے۔ چنانچہ اسی کو سامنے رکھ کر یہ پروگرام مرتب کیا گیا ہے لیکن اسے پروگرام کے ساتھ شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ اس لیے صرف پروگرام شائع کیا جا رہا ہے۔

الیکشن الیکشن میں عملاً حصہ لینے کے لیے جو رکاوٹیں درپیش ہیں۔ ان کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال پر تفصیلی رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی بہت پہلے تشکیل دی گئی تھی۔ اس اجلاس میں اس کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئی کمیٹی کی بعض سفارشات پر بحث وگفتگو کے ذیل میں یہ بات سامنے آئی کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اور چونکہ اس کا تعلق بنیادی پالیسی سے ہے۔ اس لیے دستور کی دفعہ ۲۹ (ج) کے تحت اس کا فیصلہ مجلس نمائندگان کے ذریعہ کرایا جائے گا۔ اور کمیٹی کی بقیہ سفارشات اور انتخاب سے متعلق دیگر مسائل اس فیصلے تک ملتوی کر دیے گئے

اعلیٰ تعلیم کی کمیٹی کی رپورٹ مئی ۱۹۷۷ء کے اجلاس شوریٰ میں ایک کمیٹی اس مقصد کے لیے تشکیل دی گئی تھی کہ اعلیٰ تعلیم کی اسکیم کے عملی نفاذ کی عملی تدابیر پیش کرے۔ چنانچہ اس اجلاس میں اس کی رپورٹ پیش ہوئی اور بحث وگفتگو کے بعد حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جو پورے تعلیمی مسئلہ پر اس حیثیت سے غور کرکے کہ جماعت اپنے اصولوں وسائل اور حالات کے پیش نظر کیا تعلیمی اسکیم عملاً اختیار کر سکتی ہے آئندہ چھ ماہ کے اندر اپنی رپورٹ مرکز کو پیش کرے گی۔ افراد کمیٹی یہ ہیں:۔

۱۔ جناب افضل حسین صاحب (داعی) ۲۔ جناب انیس الدین احمد صاحب۔ ۳۔ محمد یوسف صدیقی صاحب

۴۔ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی

ترمیم دستور دستور جماعت میں ترمیم سے متعلق کچھ تجاویز بھی مجلس شوریٰ کے سامنے تھیں۔ جن پر وقت کی کمی کی وجہ سے اجلاس میں غور کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ ان تجاویز پر آئندہ شوریٰ میں جو اجلاس نمائندگان سے پہلے منعقد ہوگی۔ غور کیا جائے گا اور ترمیم دستور سے متعلق امیر جماعت کی تجویزوں پر غور کرنے کے لیے حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۔ جناب محمد نجات اللہ صدیقی۔ ۲۔ جناب محمد یوسف صاحب صدیقی۔ ۳۔ جناب افضل حسین صاحب (داعی)

۴۔ محمد یوسف، قیم جماعت

ہفتہ وار کانتی کا اجرا۔ غیر مسلموں میں دعوت اسلامی کے تعارف کے پیش نظر ماہنامہ کانتی کو ہفتہ وار بنانے کا فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا مگر کچھ موانع کی بنا پر زیر عمل نہیں لایا جا سکا تھا اس اجلاس میں طے کیا گیا کہ اسے جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے اور آئندہ کانتی رام پور کے بجائے دہلی سے شائع کیا جائے۔

مستقل ریلیف فنڈ ملک میں فرقہ وارانہ صورت حال کے نتیجے میں مسلمانوں کے جانی ومالی نقصانات میں ترقی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس کے پیش نظر طے کیا گیا کہ مرکز کے زیر اہتمام ایک مستقل ریلیف فنڈ قائم کیا جائے تاکہ بوقت ضرورت مستحقین امداد کو فوری امداد پہنچانے میں سہولت ہو۔

آڈیٹر کا تقرر جناب عبدالحی صاحب نے جو ایک مدت سے آڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے اپنی آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے آئندہ اس کام کو انجام دینے سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اس منصب سے استعفا پیش کیا تھا جسے امیر جماعت نے معقول عذر سمجھتے ہوئے منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ اجلاس میں ان کی جگہ پر نئے آڈیٹر کے تقرر کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس سلسلے میں کچھ نام ارکان شوریٰ نے تجویز کیے لیکن ان کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے مجلس نے امیر جماعت کو اختیار دیا کہ وہ کسی موزوں فرد کا بحیثیت آڈیٹر تقرر کر دیں۔

ان مسائل کے علاوہ کارکنان جماعت کے مشاہروں اور مسلم مجلس مشاورت وغیرہ سے متعلق مسائل بھی زیر بحث آئے اور ان کے بارے میں کچھ فیصلے کیے گئے۔

آخر میں سال رواں کا بجٹ پیش ہوا جسے مجلس نے منظور کیا اور بجٹ کے متوقع خسارے کے سلسلے میں طے ہوا کہ اسے قرض اور رفقاء کی اعانتوں سے پورا کیا جائے۔

اس کے بعد دعا پر اجتماع ختم ہوا۔

محمد یوسف، قیم جماعت اسلامی ہند

۲۰ رجون ۱۹۶۸ء

ماہنامہ "الفاروق" مدیر: مسرت حسین آزاد۔ صفحات ۴۸ چندہ سالانہ۔ دس روپیہ۔ ششماہی: چھ روپیہ فی پرچہ:۔ ۵۰ پیسے۔ پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "الفاروق" بنگلہ آزاد خاں رامپور یوپی

یہ ماہنامہ جناب حبیب اللہ خاں صابری نے نکالا ہے وہی اس کے مالک اور پبلشر ہیں۔ اس کی ادارت یہاں کے معروف ادیب جناب مسرت حسین آزاد کے سپرد کی گئی ہے۔ اس رسالہ کو بنگلہ آزاد خاں کی خانقاہ صابریہ کے موجودہ سجادہ نشین جناب شاہ محمد فضل حسن صاحب صابری کی سرپرستی حاصل ہے۔ جناب شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"رسالہ ماہنامہ "الفاروق" کا پہلا نمبر بیماری کی حالت میں میرے سامنے آیا۔ میں نے اس کا طابع ناشر اپنے سعید داماد منشی حبیب اللہ خاں صابری سلمہٗ کو پایا۔ اس وقت بیماری کے عالم میں میرے رگ و پے میں ایسی مسرت کی لہر پیدا کر دی کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب سے زیادہ مجھے یہ خوشی ہوئی کہ میرے داماد اور میرے مرید سعید کو یہ توفیق ہوئی کہ "الفاروق" ایسا رسالہ طبع و نشر کریں۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"یہ رسالہ جس مقام سے شائع ہوا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں میں نے خود اخبار "دبدبہ سکندری" کو عرصۂ دراز تک برقرار رکھ کر دینِ متین کی تبلیغ و اشاعت کی خدمات انجام دی تھیں لیکن اپنی ضعیفی اور حالات کی ناسازگاری کی بنا پر اب تقریباً بارہ سال سے یہ سلسلہ بند تھا۔ الحمد للہ کہ اب پھر وہی تبلیغ دین کا سلسلہ جاری ہو گیا۔"

یہ ماہنامہ سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کا دوسرا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے مضامین بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ تبلیغ اسلام کے جذبے سے جو رسالہ نکالا گیا ہو اس کے جذبۂ نیک ہونے میں کیا شبہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلام کیا ہے؟ کے جواب میں نقطہ ہائے نگاہ اور خیالات و تصورات مختلف ہو گئے ہوں۔ ہم اپنے اس

نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں

(بقیہ اشارات) ہمیں اندیشہ لاحق ہے کہ اکثریت ہمیں مٹا نہ ڈالے لیکن مکہ میں مسلمانوں نے قرآن کی حیات بخش تعلیم پر جس طرح عمل کیا اور اپنے ایمان و یقین اور اخلاق و کردار کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ان سے ہماری زندگی کس قدر مختلف ہے؟ ان کے ایمان و عمل کا انہیں وہ صلہ ملا جس کا ذکر آیت کے دوسرے ٹکڑے میں ہے۔ انہیں جائے پناہ مہیا کی گئی، ان کی مدد کر کے ان کے ہاتھ مضبوط کیے گئے اور انہیں اچھا رزق عطا کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں یہ صلہ نہیں مل سکتا۔ ضرور مل سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی اسی سانچے میں ڈھال لیں جس میں مکہ کے مسلمانوں نے اپنی زندگی ڈھال لی تھی، وہی ہمارا مقصد زندگی ہو، وہی ہماری جدوجہد کا خاکہ ہو اور وہی ہمارا اخلاق و کردار ہو۔

سورۂ انفال کی ان تین آیتوں سے ہمیں جو سبق ملتے ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) کتاب و سنت کی دعوت اور اس کی تعلیم زندگی بخش ہے اور یہی تعلیم ہمیں حیات نو عطا کر سکتی ہے۔

(۲) دنیا و آخرت میں ہمیں عزت، سربلندی، فلاح اور کامیابی و کامرانی صرف اسی تعلیم پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(۳) اس تعلیم پر عمل مخلصانہ ہونا چاہیے اور اس عمل کا محرک یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ ہمیں قیامت میں اپنی پوری زندگی کا حساب دینا ہے اور وہاں کی کامیابی ہی اصل کامیابی اور ہمارا حقیقی مقصود ہے۔

(۴) ہم صرف اپنی شخصی زندگی کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ پوری جماعت اور پورے معاشرے کی اصلاح کی سعی بھی ہمارا دینی فریضہ ہے۔

(۵) تعداد کی قلت اور بے زوری و کمزوری، اللہ کی مدد سے کثرت اور قوت و شوکت میں بدل جاتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اللہ کی مدد کا مستحق بنا لیں۔

Monthly "ZINDGI" Rampur August 1968 Regd. No. L-688

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

ستمبر ۱۹۶۹ء

اقامتِ دین کا داعی

سالانہ آٹھ روپے

فی پرچہ ۸۰ پیسے

ماہنامہ

زندگی
رامپور

مدیر:- سید احمد قادری

سالانہ چندہ	سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/=	غیر ممالک سے
پاکستان سے ۸/=	۱۲ شلنگ
ششماہی	ہوائی ڈاک سے
ہندوستان سے ۴/-	۱۴ شلنگ
پاکستان سے ۴/-	
فی پرچہ:- ستر پیسے	

جلد:- ۴۱ | جمادی الاخریٰ ۱۳۸۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۸ء | شمارہ: ۳

اس دائرے میں ○ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آیندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے اس مہینے میں چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو انشاء اللہ اگلا پرچہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر ماہنامہ زندگی رام پور یوپی

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع روہیلا پرنٹرس۔ خاص روڈ، رامپور یوپی

مقام اشاعت:- دفتر زندگی۔ رام پور یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

خالص اور بے آمیز حق پر جمنا، اس کی تبلیغ کرنا، اس کے تقاضے پورے کرنا، اس کو قائم اور برپا کرنے کی سرگرم جد و جہد کرنا اور خود اپنے عمل اور اخلاق و کردار سے اس کی حقانیت و صداقت کا ثبوت دینا، ایک ایسی جاں گسل مہم ہے جو مجھ جیسے اشخاص سے کبھی نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔ زبان کی طلاقت و شہادت اور عمل کی گواہی دو الگ چیزیں ہیں اور کبھی کبھی ان دونوں میں آسمان و زمین کی دوری ہوتی ہے۔ اپنے نفس کی سرکوبی شیطان سے لڑائی، ماحول سے کش کش اور وقت کے حکمراں طاغوت سے جنگ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ چوطرفی جنگ صرف ایمان و یقین کے ہتھیار سے لڑی جا سکتی ہے اور یہ تلخ گھونٹ وہی پی سکتا ہے جس نے ایمان کی حلاوت چکھ لی ہو، جس کی آنکھیں جنت کی طراوت دیکھ سکتی اور جس کے کان چیختی چنگھاڑتی ہوئی جہنم کی سنسناہٹ سن سکتے ہوں۔ مجھ جیسا شخص اس مقام بلند کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا، اس کی طرف سر اٹھاؤں تو سر سے ٹوپی گر جائے۔ نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر۔

اس مقام بلند پر وہی لوگ فائز ہوتے ہیں جو سید قطب شہیدؒ جیسا ایمان و یقین رکھتے ہوں۔ سید قطب شہید جس نے بے آمیز حق کی شہادت صرف اپنی زبان و قلم ہی سے نہیں، اپنے خون سے بھی دی۔

بجرم عشق توام می کشند غوغائے است　　　　تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائے ست

اگر سید قطب، فرعونی نظام حکومت سے مصالحت پر آمادہ ہوتے تو انہیں "وزارت" بھی مل سکتی تھی۔ وزارت جس کے لیے لوگ اپنا دین دھرم، ایمان و ضمیر، یہاں تک کہ شرم و غیرت تک داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم سے خالص حق کی تبلیغ کی اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ صرف ان کی زبان پر جاری نہیں بلکہ ان کے دل میں

بھی ساری ہے اور حق جب تک دل میں سرایت نہ کرے، ہتھیلی پر نہیں لیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی کتاب معالم الطریق میں جس خالص اور بے آمیز حق کی تبلیغ کی تھی وہ اس سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوئے۔ مجھے اب تک ان کی اصل کتاب پڑھنے کا موقع نہیں ملا، اس کا اردو ترجمہ "نقوش راہ" میں نے پڑھا ہے اور اس کو پڑھ کر میرے دل میں اس شہید راہ حق کی وقعت و عظمت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ حق منفعت کے عجب آزاد مرد تھا۔ نفس کے بندھن سے آزاد، شیطان کے چکر سے آزاد، ماحول کی بندش سے آزاد، طاغوتی حکومت کی دہشت سے آزاد۔

ہم چاہتے ہیں کہ ایمان کو تازگی اور روح کو بالیدگی عطا کرنے والی اس کتاب کے چند اقتباسات یہاں پیش کریں۔ دعوت اسلامی اور دین حق کے اصل الاصول اور اس کے مرکز و محور کی بصیرت افروز توضیحات سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے۔ ایک جگہ سید قطب لکھتے ہیں:۔

رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس طویل سلسلۂ دعوت اسلامی کی آخری کڑی ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کی قیادت و رہنمائی میں سرانجام پاتی رہی ــــ اس دعوت کے پیش نظر ہمیشہ صرف ایک ہی کام رہا، خواہ تاریخ انسانی کا کوئی بھی دور رہا ہو۔ وہ کام تھا انسانوں کو ان کے الٰہ واحد اور رب حقیقی سے آگاہ کرنا، انہیں تنہا رب کائنات کا غلام بنانا اور مخلوقات کے شیشۂ ربوبیت کو چکنا چور کر دینا پھر ایسا نہیں کہ لوگ سرے سے سرچشمۂ الوہیت کے ہی منکر رہے ہوں اور خدا کے وجود ہی کے قائل نہ رہے ہوں تاریخ انسانی میں اس طرح کے معدودے چند ہی افراد گزرے ہیں، جن کے نظریات ان کے ساتھ ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ورنہ بات صرف اتنی ہوتی کہ انہیں اپنے رب کی حقیقت کا صحیح عرفان نہ ہوتا یا وہ اور دوسرے خداؤں کو بھی اس کا شریک ٹھہرا لیتے خواہ اعتقاد و عبادت کی شکل میں یا حاکمیت اور اتباع کی صورت میں، اور یہ دونوں ہی باتیں یکساں شرک ہیں۔ جن سے انسان کا رشتہ دین الٰہی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ دین الٰہی جس کا علم رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو ہوتا رہا مگر کچھ عرصہ بعد وہ اس کا انکار کرتے رہے اور جس جاہلیت سے نکلتے اسی جاہلیت میں پھر پلٹتے رہے اور پھر شرک کی غلاظت میں آلودہ ہوتے رہے خواہ یہ شرک اعتقاد و عبادت کی شکل میں رہا ہو یا حاکمیت اور اتباع کی صورت میں یا دونوں ہی صورتوں میں۔

تاریخ انسانی کے ہر دور میں دعوت الی اللہ کا یہی مزاج رہا ہے۔ اس کا نصب العین تھا "حاکمیت" ، بندوں

کی حوالگی، بندوں کے رب کے لیے یعنی انہیں بندوں کی پرستش سے نکال کر خدائے واحد کی پرستاری میں داخل کرنا اور شریعت و حاکمیت اور اقدار و روایات کے سلسلے میں بندوں کی خدائی سے نکال کر زندگی کے سارے ہی معاملات میں تنہا خدا کی خدائی، اس کی حاکمیت اور اس کی شریعت میں داخل کرنا ..... محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت آنے والے اسلام کا یہی مقصد تھا جس طرح کہ آپ سے پہلے دوسرے انبیائے کرام کے ذریعہ آنے والے اسلام کا بھی یہی مقصد تھا۔" (نقوش راہ ص۸۰)

وہ دوسری جگہ رقمطراز ہیں :-

یہ دین دراصل مخلوق کی بندگی سے انسان کی آزادی کا ایک اعلان ہے۔ نیز بندگی نفس کے خلاف بھی وہ ایک کھلا ہوا اعلان جنگ ہے۔ کیونکہ بندگی نفس بھی بندگی خلق کی ہی ایک شاخ ہے اور اس کا مظاہرہ صرف اللہ کی الوہیت اور اسی کے رب کائنات ہونے کے اعلان سے ہوگا۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ تنہا اللہ کے رب کائنات ہونے کے اعلان کا مطلب ہے: انسان کی حاکمیت پر ہمہ جہتی یورش اور ہر اس نظام سے مکمل بغاوت جس میں کسی بھی پہلو سے انسان کی حاکمیت یا دوسرے لفظوں میں اس کی الوہیت کی بو ہو۔ کیونکہ ایسی حکومت جس میں سارے اختیارات کے مالک، بندے ہوں اور قوت و اقتدار کا سرچشمہ بھی بندے ہوں۔ ایسی حکومت دراصل بندوں کو منصب الوہیت پر فائز کرنے کے مرادف اور اللہ کے بجائے کچھ بندوں کو کچھ بندوں کا رب بنانے کے ہم معنے ہے۔ اس اعلان کا مطلب ہے: اللہ کے غصب شدہ اقتدار کو پھر حاصل کر کے اسے اللہ ہی کے حوالے کرنا اور ان ستم پیشہ غاصبوں کو ملک بدر کرنا جو اقتدار الٰہی پر ناجائز قبضہ کر کے اپنے خود ساختہ آئین و قانون کے ذریعہ انسانوں پر اس طرح فرماں روائی کر رہے ہیں گویا وہ رب ہیں اور لوگ ان کے بندے۔ اس اعلان کا مطلب ہے: انسان کے شیشہ حاکمیت کو چور چور کر کے زمین پر حاکمیت الٰہ کا آہنی قلعہ تعمیر کرنا قرآن کریم کے الفاظ میں: وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ـــــ اور وہی آسمان میں الٰہ ہے اور وہی زمین میں بھی الٰہ ہے۔" ص۱۰۹

فاضل مصنف مزید تشریح کرتے ہیں :-

عقیدۂ اسلامی کا پہلا ستون تنہا اللہ کی بندگی ہے اور اس بندگی کے طریقے اور کیفیات صرف رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرنا اس کا دوسرا ستون ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادت دراصل اسی عہد کا اعلان اور اسی عزم کا اظہار ہے "

مسلمان اور مومن شخص وہی ہے جس کے دل میں یہ بنیاد اپنے دونوں ہی اجزاء کے ساتھ پوری طرح راسخ ہو کیونکہ ان کے علاوہ جتنے بھی اسلامی ارکان اور ایمانی بنیادیں ہیں وہ حقیقت میں انہیں کا لازمی تقاضہ ہیں۔ فرشتوں، آسمانی کتابوں، اللہ کے رسولوں، اچھی اور بری تقدیروں اور روز آخرت پر ایمان، اسی طرح نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، پھر حدود و تعزیرات، حلت اور حرمت، احکام اور معاملات اور بقیہ دوسری اسلامی ہدایات غرض ساری ہی چیزوں کی بنیاد تنہا اللہ کی بندگی ہے جس طرح کہ ان تمام کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت ہے " (ص۸۲)

اسلامی نظام حیات کے مزید نکتوں کی تشریح و توضیح کرکے سید قطب نے بہت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے کہ اس نظام کو برپا کرنے کا طریق کار کیا ہے؟ انھوں نے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی دلیلیں پیش کرکے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلی چیز جس پر داعیان حق کی توجہ مرکوز ہونی چاہیے یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں عقیدۂ توحید اتارنے کی سعی کریں۔ اس لیے کہ جب تک کوئی ایسی مسلم تنظیم یا مسلم معاشرہ وجود میں نہیں آجاتا جو علماً و عملاً عقیدۂ توحید سے سرشار ہو، دین اسلام قائم نہیں ہو سکتا۔ سید قطب نے اقامت دین کے طریق کار کو بہت اہمیت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

اسلام میں طریق کار کی وہی حیثیت ہے جو حقیقت کی ہے۔ ان دونوں کا یہ باہمی رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا اور کوئی بھی دوسرا اجنبی طریق کار اسلام کی تجلی کو نہیں نکھار سکتا۔ دوسرے نقش ہائے کار اپنے انسانی نظاموں کو تو برپا کر سکتے ہیں لیکن ہمارے نظام کو برپا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہر اسلامی تحریک میں طریق کار کی رعایت اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی عقیدے اور نظام کی۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (ص۴۸)

ایک جگہ وہ یوں رقمطراز ہیں:۔

اس دین کے علم برداروں کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ جہاں وہ ایک خدائی دین ہے وہیں اس کا لائحۂ عمل بھی خدائی لائحۂ عمل ہے اور وہ اپنے مزاج سے کبھی الگ نہیں ہو سکتا۔ اس دین

کی حقیقت کو کبھی اس کے لائحہ عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔" (صلا)

سید قطب نے مکہ اور اطراف مکہ کے حالات کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۃ العرب کے ان حصوں کو جو رومی و ایرانی اقتدار کے زیر اثر تھے آزاد کرانے کے لیے کوئی قومی تحریک چلاتے یا عربوں کی اقتصادی و معاشی بدحالی کو دور کرنے کا نعرہ بلند کرتے یا عربی معاشرے کی بداخلاقیوں کو ختم کرنے کی اصلاحی مہم شروع کرتے تو بہت جلد آپ کے جھنڈے تلے ہزاروں افراد جمع ہو جاتے اور جب آپ کو مقبولیت اور اقتدار حاصل ہو جاتا تو پھر لوگوں کے ذہن کو عقیدۂ توحید کی طرف موڑتے اور ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کی حقیقت سمجھاتے لیکن آپ نے یہ آسان طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اسی بحث کے ذیل میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انداز پر رہنمائی نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ لا الٰہ الا اللہ کا ہنگامہ خیز نعرہ بلند کریں اور اس کی دعوت کو بالکل واشگاف انداز میں پیش کریں۔ پھر آپ اور آپ کے گرد جمع ہونے والے چند نفوس مصائب کا سامنا کریں ——— ایسا کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اپنے مومنوں کو خواہ مخواہ تنگی میں ڈالنا تو کبھی پسند نہیں کر سکتا، وہ جانتا تھا کہ اصل طریقہ یہ نہیں ہے کہ زمین رومی یا ایرانی طاغوت کے ہاتھ سے نکل کر عربی طاغوت کے ہاتھ میں چلی جائے کیونکہ سارے طاغوت، طاغوت ہی ہیں۔ زمین اللہ کی ہے اور ضروری ہے کہ اللہ ہی کی رہے اور وہ اللہ ہی کی اسی وقت رہ سکتی ہے جب کہ اس پر لا الٰہ الا اللہ کا پھریرا لہرا رہا ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہرگز نہیں کہ اہل زمین، رومی یا ایرانی طاغوت سے آزاد ہو کر عربی طاغوت کے پنجے میں آجائیں ...... لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم جیسا کہ ہر وہ شخص جانتا ہے جو عربی زبان سے اچھی طرح واقف ہو ——— یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف اللہ کو ہے، شریعت بس اسی کی چلے گی، کسی کو کسی پر اقتدار نہیں، کیونکہ سارا اقتدار صرف اللہ کا ہے اور اس لیے بھی کہ جو "قومیت" اسلام کو مطلوب ہے وہ عقیدہ کی "قومیت" ہے جس میں عربی، رومی ایرانی غرض ساری ہی قومیتیں اور سارے رنگ خدا کے جھنڈے تلے بالکل مساوی ہیں اور یہی اصل طریقہ ہے۔" (صفحہ ۵۵)

قومی، معاشی، اخلاقی اور دوسری بنیادوں پر تحریک چلانے کے بجائے عقیدۂ توحید پر زور دینے اور اس اساس پر ایک مسلم معاشرہ تعمیر کرنے کا جو نتیجہ نکلا وہ یہ تھا :-

" تو جب انتہائی جاں فشانی کے بعد عقیدہ راسخ ہو گیا اور وہ اتھارٹی حاصل ہو گئی جو اس عقیدے کی

پشت پناہی کرے۔ جب لوگوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور تنہا اسی کو اپنا معبود بنالیا جب لوگ بندوں کی خدائی اور شہوات کی حکمرانی سے آزاد ہوگئے۔ جب دلوں میں لا الٰہ الا اللہ نے پوری طرح گھر کرلیا۔۔۔ تو اللہ نے اپنے اور صرف اپنے ماننے والوں کے ہاتھوں وہ سب کچھ کرایا جو تجویزیں پیش کرنے والے اپنی تجویزوں میں پیش کرسکتے ہیں۔ زمین رومیوں اور ایرانیوں سے پاک ہوگئی۔ اس لیے نہیں کہ اس پر عرب کی شہنشاہی قائم ہو، بلکہ اس لیے کہ اللہ کی شہنشاہی قائم ہو۔ وہ سارے ہی طاغوتوں کی شہنشاہی سے پاک ہوگئی۔ قطع نظر اس سے کہ وہ طاغوت رومی ہو یا ایرانی ہو یا عربی ہو ـــــ اور سوسائٹی ہر قسم کے اجتماعی ظلم سے یکسر پاک ہوگئی اور "نظام اسلامی" قائم ہوگیا جو عدل الٰہی کا نمونہ اور میزان الٰہی کا پابند تھا اور صرف اللہ کے نام پر عدل اجتماعی کا پرچم اٹھائے ہوئے تھا وہ پرچم جس کا نام تھا "پرچم اسلام" اور اس پر نقش تھا لا الٰہ الا اللہ" (ص۶۲)

وہ مزید زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اگر دعوت کا آغاز اس انداز پر نہ ہوتا اگر دعوت نے صرف یہی پرچم لا الٰہ الا اللہ کا پرچم بلند کرکے دوسرے پرچموں سے اپنا رشتہ توڑ نہ لیا ہوتا اور اگر اس نے اس راہ کو اختیار نہ کیا ہوتا جو راہ دیکھنے میں تو بہت دشوار اور پُرخار ہے لیکن حقیقت میں بہت ہی آسان اور باعث خیر ہے، تو یقین جانیے اس مبارک نظام کا ایک حصہ بھی اتنے بلند پیمانے پر ظہور پذیر نہ ہوتا ـــــ پھر اس مبارک نظام میں اخلاص وللّٰہیت کی بو بھی نہ ہوتی۔ اگر یہ دعوت ایک قومی یا اشتراکی یا اخلاقی دعوت کی حیثیت سے اپنے سفر کا آغاز کرتی، یا اپنے منفرد شعار لا الٰہ الا اللہ کے پہلو بہ پہلو کسی دوسرے شعار کا بھی علم اٹھائے ہوئے ہوتی" (ص۶۵)

اس کتاب کے شہید مصنف نے وقت کے چلتے ہوئے تصورات، افکار وخیالات اور تحریکات وتنظیمات پر بھی جگہ جگہ تنقید کی ہے اور موجودہ مسلم معاشرے کے تغافل وانحراف کو بھی واضح کیا ہے اور کتاب کے آخر میں انھوں نے سورۂ البروج سے ملنے والے سبق کو انتہائی مومنانہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے اور یہ اس کتاب کا بڑا قیمتی حصہ ہے۔ راہ حق میں اصحاب الاخدود کی سرفروشی وجاں نثاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

اس واقعہ میں مومنین کی روحیں خوف والم پر، زمین اور زندگی کے علائق پر اور آزمائشوں پر غالب رہیں

اور اس شان سے غالب رہیں کہ ہر دور کی ساری نوعِ انسانی اس پر فخر کر سکتی ہے اور غور کرو تو یہی اصل غلبہ ہے۔

موت تو سبھی کو آتی ہے اور مختلف انداز سے آتی ہے لیکن سب کے لیے یہ رتبۂ بلند کہاں؟ یہ غلبہ و نصرت، یہ شرف و عزت اور یہ ذکرِ دوام کہاں؟ یہ تو بس انہیں کا نصیب تھا، یہ خدا کا خصوصی انعام و اکرام تھا کہ وہ نیک روحیں موت میں تو سب کی شریک رہیں مگر عز و شرف میں سب سے منفرد رہیں۔ پھر عز و شرف بھی ایسا کہ زمین کی وسعتیں بھی اس کے لیے ناکافی ہیں چنانچہ جہاں خاکدانِ ارضی کے مکینوں میں اس کا چرچا ہوا وہیں ملاءِ اعلیٰ کے قدسیوں میں بھی اس کا شہرہ ہوا۔

مومنین کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ ایمان کی ہزیمت گوارا کر کے خود اپنی زندگی بچا لیتے، مگر یہ سودا کتنے خسارے کا ہوتا! کتنا عظیم خسارہ ہوتا ان کا بھی، اور ساری نوعِ انسانی کا بھی۔ کتنا عظیم خسارہ ہوتا اگر وہ اس تصور کا خون کر ڈالتے کہ عقیدہ ہی زندگی کی روح اور آزادی ہی اس کا حسن ہے۔ اور اگر سرکش تو تیں جسم سے گزر کر روح پر بھی قابض ہو جائیں تو حقیقت میں یہی موت ہے۔

اصحاب الاخدود کی ظاہری ہزیمت حقیقی ہزیمت نہ تھی اس لیے کہ:۔

پھر اس سب کے علاوہ آخرت بھی ہے اور وہی اصل ہے جس سے اس دنیا کا بھی سررشتہ جا کر ملتا ہے۔ یہ بات جہاں ایک قطعی حقیقت ہے وہیں عقیدہ مومن کی ایک اہم بنیاد بھی ہے ـــــ گویا معرکہ ابھی ختم نہیں ہوا لہٰذا واقعات کی چند کڑیوں کی ہی بنیاد پر اس کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ محض ظن و تخمین ہوگی جسے سنجیدگی اور علم و واقفیت سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

یہ کتاب ایک ایسا اعلان ہے جس میں کہیں کوئی ابہام او ر تذبذب نہیں ہے۔ سید قطبؒ کو اس "اعلانِ حق" کے صلے میں شہادت ملی۔ اس راہ پر چلنے کی ہمت وہی کر سکتا ہے جس کی گردن پھانسی کے پھندے کو چوم لینے پر آمادہ ہو۔

زندۂ جاوید

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو

بلکہ

وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے

(البقرۃ آیت ۱۵۴)

طلب آخرت

(ڈاکٹر عبدالحق انصاری)

مقصد زندگی کے اسلامی نظریہ کا چھٹا اہم تصور طلب آخرت (ابتغاء الدار الاخرۃ) ہے۔

الاخرۃ کے معنے بعد میں آنے والی یا دوسری شے کے ہیں۔ اس کے مقابل میں الدنیا قریب کی شے اور الاولی پہلی شے کے الفاظ آتے ہیں۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس سے بعد میں آنے والی زندگی یا دوسری زندگی مراد ہے۔ موجودہ زندگی کے لیے الدنیا اور الاولی دونوں الفاظ آتے ہیں۔ کبھی ان الفاظ کے ساتھ حیوٰۃ یا دار کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً الحیوٰۃ الدنیا (قریب کی زندگی) الدار الاخرۃ (دوسرا گھر) دنیا کے معنے حقیر اور قابل نفرت کے بھی ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں دنیا کی زندگی کی شدید مذمت کی گئی ہے وہاں الحیوٰۃ الدنیا کے مفہوم میں حقیر اور مذموم ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے مگر بالعموم الدنیا یا الحیوٰۃ الدنیا کے معنے موجودہ زندگی کے ہوتے ہیں۔ مذمت اور حقارت کے معنے مفہوم میں داخل نہیں ہوتے۔

(۱) قرآن مجید میں بارہا صریح اور واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ آخرت کی فلاح ہر کام میں پیش نظر ہونی چاہیے

وَابْتَغِ فِیْ مَا اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا (قصص ۷۷)

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔

مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَشْكُوْرًا (اسراء: ۱۹)

جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مومن تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی

آخرت کی فلاح کے معنے گناہوں کی مغفرت، عذاب جہنم سے نجات اور جنت کی نعمتوں سے سرفرازی ہے جس کی اعلیٰ ترین نعمت خدا کی خوشنودی، اس کی معیت اور اس کا تقرب ہے۔ قرآن مجید کی جنت ایک ایسی بلند اور پاکیزہ زندگی سے عبارت ہے جو دل و دماغ اور روح و جسم ہر اعتبار سے مکمل اور ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔

(۲) قرآن مجید نے جنت کو انسانی زندگی کی آخری غایت، انسانی کاوشوں کا بلند ترین مطمح نظر قرار دیا ہے اور اس کی دل و جان سے تمنا، اس سے والہانہ محبت، اس کی یافت کے لیے مسلسل جد و جہد، مسارعت مسابقت اور دعا کی تاکید فرمائی ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ	تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَآءُ وَالْاَرْضِ	دوڑو اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان
اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ	اور زمین کے برابر ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے
رُسُلِهٖ (حدید ۲۱)	تیار کی گئی ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں
وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ	دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ	کی بخشش اور اس کی جنت کی طرف جاتی ہے
اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران، ۱۳۳)	جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہو اور
(آل عمران، ۱۳۳)	وہ خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔
رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ	اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھ کو
بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ	صالحوں کے ساتھ ملا اور بعد کے آنے والوں
صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ وَاجْعَلْنِيْ	میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر اور مجھے جنت نعیم کے
مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ (شعراء ۵)	وارثوں میں شامل فرما!
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝	پرہیزگار لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں
اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ	گے۔ ان کے رب نے ان کو جو کچھ عطا کیا ہوگا
كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝	اس کو پاکر خوش ہوں گے۔ کیوں نہ ہو وہ لوگ
كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝	پہلے نیکو کار تھے، راتوں کو کم سوتے تھے اور آخر شب

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ وَفِیْٓ	میں استغفار کیا کرتے تھے ان کے اموال میں سائل
اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات، ۲۰)	اور مفلس کا حق تھا۔

(۳) دنیا کی فلاح اور کامیابی آخرت کی فلاح و کامیابی کے مقابلہ میں بے حد حقیر ہے۔ اس کی لذتیں اور آسائشیں بہت مختصر اور عارضی ہیں۔ آخرت کی زندگی ابدی، اس کی بھلائی دائمی، اس کی لذتیں غیرفانی ہیں۔ پھر آخرت کی زندگی ہر اعتبار سے کامل، ہر طرح سے بلند اور دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں ہزاروں گنا پاکیزہ، مقدس و مطہر، مکمل اور قابل رشک ہے۔ دانشمندی کا تقاضا ہے کہ جب بھی آخرت اور دنیا کے مفادات میں تصادم ہو تو آخرت کے مفادات کو دنیا کے مفادات پر ترجیح دی جائے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے خسارے، شدید سے شدید اذیت، عظیم سے عظیم تر قربانی کو آخرت کی فلاح کے لیے بخوشی برداشت کیا جائے حتی کہ جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَالْاٰخِرَةُ	ان سے کہو، دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے
خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی	اور آخرت ایک خداترس انسان کے لیے زیادہ
نساء، ۷۷	بہتر ہے۔
یَا قَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ	اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیا کی زندگی
الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ	تو ایک عارضی سرمایہ ہے۔ ہمیشہ کے قیام کی جگہ
هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ (غافر۔ ۳۹)	آخرت ہی ہے
اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ	اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے۔ کاش
لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ (عنکبوت۔ ۶۴)	یہ لوگ جانتے
وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (اعلیٰ، ۱۷)	آخرت کی زندگی ہی بہتر اور باقی رہنے والی

(۴) دنیا کی زندگی اگر خدا کا منکر اور باغی ہو کر، اس کی ہدایت سے بے نیاز اور آخرت کو پس پشت ڈال کر گذاری جائے تو انتہائی مذموم اور قابل نفرت ہے کسی بھی قدر و قیمت کی حامل نہیں۔ انجام کے اعتبار سے سراسر خسارہ کی چیز ہے۔ برے اعمال تو برے ہی ہیں، اچھے اعمال بے معنے اور بے نتیجہ ہیں۔ خدا کی میزان میں ان کا کوئی وزن نہیں۔ انسان ان سے تھوڑی دیر کے لیے مسرور تو ہو سکتا ہے لیکن کھیل و تماشہ کی طرح ان سے بھی کسی کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ زندگی بڑی حسین اور دلکش ہے لیکن اس کی حقیقت کھوٹے سکے سے زیادہ نہیں۔

انسان اس سے دھوکا ضرور کھا سکتا ہے۔ مگر نہ آخرت کے عذاب سے بچ سکتا ہے اور نہ دنیا میں سکون اور طمانیت کی دولت سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (کہف ۴۵)

اور اے نبی! انہیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہو گئی اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ (کہف: ۱۰۶)

اے محمدؐ! ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (عنکبوت: ۶۴)

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔

(۵) لیکن اگر دنیا کی زندگی خدا پر ایمان کے ساتھ اس کی ہدایت کی روشنی میں اور آخرت کی فلاح کو پیش نظر رکھ کر خدا کی رضا جوئی میں گزاری جائے تو یہ وہ زندگی ہے جس کی بھلائی اور کامیابی کی دعا اولوالعزم انبیاء اور ان کے جلیل القدر اصحاب نے کی ہے۔ حضرت موسیٰ اور آپ کے ستر اصحاب کی دعا یہ ہے جو بنی اسرائیل میں منتخب تھے۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ (اعراف: ۱۵۶)

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی ہم نے آپ کی طرف رجوع کرلیا۔

دوسری جگہ حج کے موقع پر خدا کے نیک اور پسندیدہ بندوں کی دعا یوں نقل کی گئی ہے:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔

دنیا کی بھلائی اور کامیابی خدا کا بڑا انعام ہے جس سے خدا نے اپنے نیک بندوں متقین اور محسنین کو نوازا ہے:۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَّلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ٥ (نحل: ۳۰)

اس طرح کے نیکو کار لوگوں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ٥ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یونس: ۶۴)

سنو! جو اللہ کے دوست ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ٥ (نحل: ۴۰-۴۱)

جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش جان لیں وہ مظلوم جنھوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)

دنیا کی رسوائی اور ذلت، اس کی تباہی اور خسارہ خدا کی شریعت سے بغاوت اور فسق و فجور کی سزا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ (حج : ۱۱)

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے۔ اگر فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا اور جو کوئی مصیبت آگئی تو الٹا پھر گیا اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرہ : ۸۵)

تو کیا کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو: پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

(۶) دنیا کی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لیے انبیاء بھیجے گئے۔ کتابیں نازل کی گئیں شریعتیں عطا کی گئیں۔ قرآن مجید کے احکامات کا ایک بڑا اہم حصہ وہ ہے جس کا مقصد دنیا کی زندگی کی تعمیر ہے شریعت اسلامی کے مقاصد میں دنیا کی فلاح و سعادت بھی اسی طرح داخل ہے جس طرح آخرت کی کامیابی اور بھلائی۔

امام غزالی لکھتے ہیں:۔

مقصود الشرع من الخلق خمسة وهو ان يحفظ عليهم دينهم ونفسهم وعقلهم ونسلهم ومالهم فكل ما يتضمن حفظ هذه الاصول الخمسة فهو مصلحة وكل ما يفوت هذه الاصول فهو مفسدة ودفعها مصلحة

شریعت کے پیش نظر مقاصد پانچ ہیں۔ یعنی انسان کے دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت۔ پس ان پانچ بنیادی مقاصد کی حفاظت جس چیز سے ہو وہ مصلحت ہے اور جس سے ان کو نقصان پہنچے وہ مفسدہ ہے اور اس کا ازالہ مصلحت ہے۔

المستصفیٰ ۱: ۱۴۰

علامہ شاطبیؒ نے لکھا ہے :-

الاحکام الشرعیۃ انما شرعت لجلب المصالح اودرء المفاسد وھی مسبباتھا قطعا (الموافقات-۱: ۱۹۵)	پھر احکام شرعیہ مصالح کے حصول اور مفاسد کے ازالہ کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ اور یقیناً ان کے پیش نظر انہیں مقاصد کا حصول رہا ہے

پھر مصالح کی دو قسمیں ہیں۔ دنیوی مصالح اور اُخروی مصالح۔ دنیوی مصالح کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :-

اعنی بالمصالح مایرجع الی قیام حیاۃ الانسان وتمام عیشہ ونیلہ ما تقتضیہ اوصافہ الشہوانیۃ والعقلیۃ علی الاطلاق حتی یکون منعما علی الاطلاق (الموافقات ۲ : ۲۵)	مصالح سے میری مراد وہ ساری چیزیں ہیں جن سے انسانی زندگی کا قیام و تکمیل عبارت ہے اور جن سے انسان کے سارے جسمانی اور روحانی خواہشات و مقاصد پورے ہوتے ہیں یہاں تک کہ انسان ہر اعتبار سے خوش ہو جاتا ہے

علامہ عزالدین ابن عبد السلام نے تصریح کی ہے۔

کل مامور فقیہ مصلحۃ الدارین اواحدھما وکل منھی عنہ ففیہ مفسدۃ فیھما اوفی احدھما (قواعد الاحکام فی مصالح الانام ۱: ۶)	شریعت کے ہر امر میں دنیا اور آخرت کی بھلائی (مصلحت) ہوتی ہے، یا کسی ایک کی اور اس کی ہر ممانعت کا سبب دنیا اور آخرت میں سے دونوں یا کسی ایک کی برائی ہوتی ہے۔

پھر مصلحت اور مفسدہ کی تعریف یوں کی ہے :-

یعبر عن المصالح والمفاسد بالخیر والشر والنفع والضر والحسنات والسیئات لان المصالح کلھا خیور نافعات حسنات والمفاسد باسرھا مضرات سیئات وقد غلب فی القرآن استعمال الحسنات فی المصالح والسیئات فی المفاسد (قواعد الاحکام : ۴)	مصالح اور مفاسد سے مراد خیر و شر، نفع و ضرر بھلائیاں اور برائیاں ہیں۔ کیونکہ سارے مصالح خیر، نافع اور بھلائی ہوتے ہیں اور مفاسد تمام تر شر اور ضرر ہوتے ہیں۔ قرآن میں حسنات کا لفظ مصالح کے مفہوم میں اور سیئات کا لفظ مفاسد کے مفہوم میں بالعموم آیا ہے۔

(۶) او پر تھو نکات ہیں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اسی وقت ہم آہنگ ہو سکتی ہیں جب کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن مجید نے دنیا کی زندگی کی نہ تو مطلق مذمت کی ہے اور نہ مطلق تحسین۔ نہ تمام تر شر قرار دیا ہے اور نہ تمام تر خیر نہ خیر شر طور پر مقصود ٹھیرایا ہے اور نہ کلیۃً قابلِ اجتناب۔

قرآن مجید کی جن آیتوں میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی متاعِ غرور ہے، لہو و لعب ہے، خسارہ ہی خسارہ ہے۔ بے وزن، حقیر اور مذموم ہے۔ وہ آیتیں دو طرح کے سیاق میں آئی ہیں۔ ایک طرح کے سیاق میں اہلِ لوگوں کی زندگی ہے جو خدا کی ہدایت اور آخرت کے منکر ہیں یا جو صرف زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر دل سے منکر ہیں۔ یا وہ جو زبان و دل سے منکر نہیں لیکن یقین سے محروم اور ارادے کے کچے ہیں۔ ان کی عملی زندگی بیشتر غیر اسلامی ہے۔ وہ دین و ایمان کے بنیادی تقاضوں سے بھی مجرمانہ طور پر غافل ہیں۔

اہلِ کفر اور نفاق کے اول دو گروہوں کی زندگی کے سیاق میں قرآن کی یہ آیات مطلق ہیں۔ یقیناً ان کی زندگی تمام تر خسارہ اور یکسر شر ہے۔ برے اعمال کی طرح ان کے اچھے اعمال بھی باطل و بے وزن ہیں۔ کیونکہ وہ بندگی اور اطاعت کی بنیادی حقیقت کے منکر ہیں۔ فساق و فجار اگرچہ اس بنیادی حقیقت کے معترف ہیں۔ مگر ان کا اعتراف بے اثر اور بے جان ہے۔ ان کی زندگی کو اگرچہ مطلق طور پر شر قرار نہیں دیا گیا ہے لیکن انتہائی مذموم بتایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ	لوگو! تمہاری یہ بغاوت الٹی تمہارے ہی خلاف
عَلَىٰ أَنفُسِكُم مَّتَاعَ الْحَيَاةِ	پڑ رہی ہے۔ دنیا کے چند روزہ مزے ہیں (لوٹ لو)
الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ	پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے۔ اس وقت
فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ	ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔
إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشہ میں مست ہو کر تم ہماری
كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ	نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی
السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ	ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی
الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ	پیداوار جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں خوب
وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ	گھنی ہو گئی۔ پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی
زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ	بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور

وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (یونس، ۲۳-۲۴)

اس کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم اس سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۝ (آل عمران: ۲۲)

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اٹھیں ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے اور ان کا مددگار کوئی نہیں ہے۔

أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (توبہ: ۶۹)

ان (منافقوں اور کافروں) کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی خسارے میں ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝ (آل عمران: ۱۸۵)

آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کیا جائے۔ رہی یہ دنیا تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔

دوسرا سیاق ان بعض اہل ایمان کا ہے جن سے خدا کے کسی ایسے بڑے حکم کی نافرمانی ہوئی ہے یا اس کا اندیشہ ہے جس کی وجہ ان کی جان و مال کی شدید محبت ہے۔ جو آیات اس سیاق میں آئی ہیں وہ مطلق نہیں ہیں جس طرح کہ اہل کفر و نفاق کے سیاق میں ہیں۔ ان کا واضح اشارہ مخصوص اعمال کی طرف ہے نہ کہ پوری زندگی کی طرف [illegible]

مزید یہ کہ تنقید و مذمت کا انداز بھی وہ نہیں ہے جو کفار و منافقین کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ
سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ
فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ فَلَا تَهِنُوا
وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ
الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ
يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ إِنَّمَا الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوا
وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا
يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ

(محمد: ۳۳-۳۶)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور
رسول کی اطاعت کرو اور (کفار کی طرح اللہ اور
رسول کی خلاف ورزی کرکے) اپنے اعمال کو برباد
مت کرو۔ جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے اللہ کے
راستے سے روکا اور (کفر کی حالت ہی میں مر گئے اللہ
ان کو کبھی نہ بخشے گا۔ سو تم ہمت نہ ہارو اور صلح
کی طرف بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ
تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال میں ہرگز
کمی نہ کرے گا۔ دنیوی زندگانی تو محض ایک کھیل
اور دل کا بہلاوا ہے۔ اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ
اختیار کرو تو اللہ تم کو تمہارا اجر عطا کرے گا اور تم
سے تمہارا مال طلب نہ کرے گا۔

حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَ
تَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ
مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا
تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ
الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ
لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ
وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ ۝

(آل عمران۔ ۱۵۲)

مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام
میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ
نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی
مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی
کر بیٹھے۔ اس لیے تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب
تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے
تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری
آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں
معاف ہی کر دیا۔ کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرعنایت
رکھتا ہے۔

(۸) قرآن مجید میں اہل ایمان کے سلسلے کی آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ کہ آخرت اور دنیا کے مفادات و مقاصد میں جب تصادم ہو تو انہیں ہمیشہ آخرت کو ترجیح دینی چاہیے۔ دنیا کی فلاح اور کامیابی بری چیز نہیں ہے۔ اس کے حصول کی کوشش سے انہیں کہیں بھی روکا نہیں گیا بلکہ اس کو تحسین کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے لیے دعا کی ترغیب دی گئی ہے، اس کی بشارت دی گئی ہے۔ انبیائ رسل اور صالحین کو اس کے لیے دعا کرتے اور اس کی طلب کی جدوجہد کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف دنیا کی رسوائی اور ذلت کو خدا کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اور اس عذاب سے بچنے اور اس سے نکلنے کی تاکید کی گئی ہے یقیناً دنیا کی فلاح اور کامیابی اور اس کے لیے سرگرم جدوجہد پر اس طرح زور نہیں دیا گیا ہے جیسا کہ آخرت کی فلاح اور کامیابی پر زور دیا گیا ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی فلاح اور کامیابی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کی تاکید کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔ خود انسان کی فطرت میں اس مقصد کے لیے انتہائی قوی اعیات اور رجحانات ودیعت کر دیے گئے ہیں جو اس مقصد کی تحصیل کے لیے کسی مزید ترغیب سے بے نیاز کر دیتے ہیں ان کے مقابلہ میں مقاصد آخرت کو ترجیح دینے کے لیے فطری داعیات اس قدر قوی نہیں ہیں۔ پھر آخرت کے مقاصد مستقبل کے مقاصد ہیں اور وہ بھی غیر محسوس ہیں۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ان مقاصد کو وحی اور رسالت کے ذریعہ بار بار ذہن نشین کیا جاتا۔ پُر اثر الفاظ میں مسلسل ان کی اہمیت اجاگر کی جاتی اور ان کی ترغیب دی جاتی۔

شریعت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جن مقاصد کے لیے قوی داعیات خود انسان میں موجود ہوتے ہیں ان کی تاکید نہیں کی جاتی۔ لیکن جن مقاصد کے لیے فطری داعیات قوی نہیں ہوتے ان کی پر زور تاکید کی جاتی ہے اس بات کو علامہ شاطبی نے بڑی خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

مَا كَانَ لِلْإِنْسَانِ فِيهِ حظ
عاجل وباعث من نفسه يستدعيه
الى طلب ما يحتاج اليه وكان ذلك
الداعي قويا جدا بحيث يحمله قهرا
على ذلك لم يؤكد عليه الطلب بالنسبة
الى نفسه بل جعل الاحتراف والتكسب
والنكاح على الجملة مطلوبا طلب الندب

جن کاموں کے انجام دینے سے انسان کو
فوری مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہو اور جن کے
لیے اس کے اندر اتنے قوی داعیات موجود ہوں
جو اس کو ان کاموں کے لیے مجبور کر دیں تو اس کی
اپنی ذات کی حد تک ان مقاصد کے حصول کی
تاکید شریعت میں نہیں کی گئی ہے اسی لیے کسب
رزق اور نکاح کو فرض نہیں کیا گیا بلکہ صرف

لا يطلب بالجزء بل بالكلية مما يأتي في معرض الإباحة..... مع أنا لو فرضنا أخذ الناس له كأخذ المندوب بحيث يسعهم جميعا الترك لأثموا لأن العالم لا يقوم إلا بالتدبير والاكتساب فهذا من المشار إليه كالحوالة على ما في الجبلة من الداعي الباعث على الاكتساب حتى إذا لم يكن فيه حظا وجهة نازع طبعي أوجبه الشرع عينا أو كفاية كما لو فرض هذا في نفقة الزوجات والأقارب وما أشبه ذلك (الموافقات ۲: ۱۸۰-۱۸۱)

مندوب قرار دینے پر اکتفا کیا گیا۔ بلکہ ان مقاصد کے لیے اکثر اباحت کی زبان استعمال ہوئی ہے.... مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر لوگ ان مقاصد کو صرف مندوب سمجھ لیں اور سب انہیں چھوڑ بیٹھیں تو گنہگار ہوں گے۔ کیونکہ دنیا تدبیر اور معاشی جد و جہد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس معاملہ میں گویا شارع نے جبلی داعیات پر اعتماد کر لیا ہے جو انسان کو کسب معاش پر مجبور کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بالفرض اگر فطری داعیات نہ ہوتے اور ان مقاصد کے ساتھ لذت و مسرت وابستہ نہ ہوتی تو شرع نے ان کے حصول کو بالعین یا بالکفایہ واجب قرار دے دیا ہوتا جیسا کہ بیوی اور اقربا کا نفقہ فرض کر دیا گیا ہے۔

(۹) دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کے معنے یہ ہیں:۔

۱۔ فرائض ادا کرنا اور محرمات سے بچنا۔

۲۔ مکروہات سے احتراز کرنا اور مندوبات و مستحبات کے لیے کوشش کرنا۔

۳۔ دین میں اعمال کی جو درجہ بندی فرمائی گئی ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک پابندی کرنا اور ان مقاصد سہ گانہ کے حصول میں طبیعت کے ان رجحانات، تقاضوں اور خواہشات سے دستبردار ہو جانا جو ان کے حصول کی راہ میں مانع ہوں۔ ایسا کرنے میں ان لذتوں کی قربانی کو خوشی سے قبول کرنا اور ان اذیتوں کو بطیب خاطر برداشت کرنا جن کے بغیر ان مقاصد کی بخوبی تحصیل ممکن نہ ہو۔ جن رجحانات، تقاضوں اور خواہشات سے کنارہ کشی درکار ہے، ان میں غالب حصہ جسمانی اور مادی تقاضوں کا ہوتا ہے۔ مگر اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے ان سے زیادہ اہم وہ عقلی، نفسیاتی اور روحانی رجحانات ہیں جو ان مقاصد سہ گانہ کے صحیح حصول میں مانع ہوتے ہیں۔ یہی رجحانات دین میں بدعت اور تحریف کو جنم دیتے ہیں اور بالآخر دین کی صورت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

ان مقاصد سہ گانہ کے حصول کے لیے اپنے طبیعی رجحانات اور خواہشات کی قربانی ہی ضروری نہیں ہے

بلکہ اپنے اعزہ و اقارب اور اہل خاندان و برادری کے غلط اثرات سے بلند ہونا اور ناجائز مقاصد کو نظر انداز کر دینا اور ماحول، معاشرہ، قوم اور حکومت کے دباؤ اور اثرات اور اذیتوں کے درمیان صبر و استقامت کی روش پر قائم رہنا بھی ضروری ہے۔

(۱۰) فرائض اور مندوبات زندگی کے کسی ایک شعبے میں محدود نہیں ہیں۔ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے معنے کسی ایک شعبہ زندگی کے فرائض و مندوبات و مستحبات پر جد و جہد مرکوز کر دینا نہیں ہے۔ اہل دین کا ایک گروہ اپنی بیشتر اور بہترین کوششیں خدا کے امور کے دائرے میں مرکوز کر دیتا ہے۔ دوسرے گروہ کی زیادہ تر توجہ بندوں کے امور پر ہوتی ہے اور اس کی بہترین قوتیں اسی میدان میں صرف ہوتی ہیں۔ یہ دونوں رجحانات یک طرفہ اور ناقص ہیں۔

دین میں خدا کے امور کو بندوں کے امور پر مجموعی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے لیکن خدا کے امور میں سے ہر امر کو بندوں کے ہر امر پر ترجیح نہیں ہے۔ یہی حال خدا اور نفس اور بندوں اور نفس کے امور کے درمیان ہے کوئی فرض خواہ اس کا تعلق خدا کے امور سے ہو یا بندوں یا نفس کے امور سے اس کو خدا کا حکم سمجھ کر ادا کرنا اور خدا کی رضا کے لیے ادا کرنا دین میں مطلوب ہے۔ اس لیے کہ ہر فرض خواہ اس کا تعلق جس دائرے سے ہو خدا کا عائد کردہ فرض ہے اور ہر حق فی الواقع خدا کا حق ہے، خواہ وہ حق العباد اور حق نفس ہی کیوں نہ ہو۔ اور اسی تصور کے ساتھ اس کو ادا کرنا خدا کی عبادت اور اس کی اطاعت ہے۔ معروف عبادات، ذمہ داری حقوق کی ادائیگی اور تزکیۂ ذات سب یکساں خدا کی عبادت ہیں اور سب مقصود اور مطلوب ہیں۔

یہ بات فرائض و واجبات تک محدود نہیں ہے۔ مندوبات و مستحبات کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کی شریعت اس اصول کے سلسلے میں زندگی کے تینوں شعبوں میں کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھتی۔ امور خدا، امور عباد اور امور نفس تینوں شعبوں میں احسان و تکمیل مطلوب بھی ہے اور مقصود بھی۔

(۱۱) امور نفس سے متعلق فرائض اور ترغیبات کا مقصد فرد کی ایک بہتر، بلند تر اور مکمل تر زندگی ہے۔ اس دائرے میں جو محرمات اور مکروہات ہیں ان کا حاصل فرد کی زندگی کا تحفظ اور اس کو برائیوں سے پاک کرنا ہے۔ امور عباد سے متعلق جو فرائض اور ترغیبات ہیں، ان کے پیش نظر بندوں کی اجتماعی تعلقات کی اصلاح و تہذیب و تعمیر اور اجتماعی تعاون و تنظیم کے ذریعے اور اجتماعی وسائل و ذرائع کی مدد سے افراد کا تحفظ، اصلاح و تزکیہ، ترقی اور تکمیل کے مقاصد ہیں۔ ان دونوں مقاصد میں فرق دو حاصل نہیں اور طریقۂ کار کا ہے ورنہ بالآخر

مقصود افراد کی اصلاح و ترقی ہی ہے ۔

اگر انسان کی شخصیت کا وسیع تصور پیش نظر ہو جس میں اس کے جسمانی تقاضوں، مادی مفادات، علمی و فکری مقاصد نفسیاتی اور روحانی ضرورتوں کو وہ مقام حاصل ہو جو اسلام انہیں دینا چاہتا ہے ۔ اگر اس کی شخصیت کا ایک پہلو وہ ہو جو اس کا نجی اور ذاتی ہو۔ دوسرا وہ ہو جو معاشرتی اور اجتماعی ہو اور تیسرا وہ ہو جس کا مرکز ان محسوسات سے بلند خدا کی ذات ہو تو اس ہمہ گیر اور جامع شخصیت کے پیش نظر یہ کہنا درست ہوگا کہ شریعت کے وہ احکامات جن کا تعلق امور خدا سے ہے ان کا حاصل بھی اس ہمہ گیر شخصیت کے اس آخری پہلو کی اصلاح تعمیر اور ترقی ہے جس کا مرکز خدا کی ذات ہے ۔ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ ان احکامات کا براہ راست اور اولین مقصد اسی پہلو کی تعمیر ہے ۔ اگرچہ اس کے ثانوی اور بالواسطہ مقاصد میں پوری شخصیت کی تعمیر داخل ہے ۔

امور نفس، امور عباد اور امور خدا سے متعلق شریعت کے احکامات اور ترغیبات کا کلی مقصد اسی ہمہ گیر شخصیت کی تعمیر ہے ۔ جو مادی جسمانی اور ایک حد تک نفسیاتی اعتبار سے اس زمین سے وابستہ ہے ۔ مگر عقلی اور روحانی اعتبار سے اس زمین سے بلند ہو کر خدا سے وابستہ ہو جاتی ہے ۔ جو وقتی طور پر اس دنیا کے اور اس زندگی کے حدود میں ہے ۔ مگر فی الحقیقت دنیا اور آخرت دونوں کو سمیٹے ہوئے ہے ۔

اس ہمہ گیر شخصیت کی تعمیر بیک وقت حیات دنیا کی تعمیر بھی ہے اور حیات اخروی کی تعمیر بھی ۔ بیک وقت دنیا کی سعادت اور کامیابی بھی ہے اور آخرت کی فلاح و کامرانی بھی ۔ دنیا کی تعمیر ہی آخرت کی تعمیر ہے ۔ آخرت کی تعمیر ایک نتیجہ ہے دنیا کی تعمیر کا ۔ ایک ایسا نتیجہ جس کی تکمیل خدا کے ارادہ پر موقوف اور جس کا وجود اس کی رحمت کا کرشمہ ہے ۔

تعمیر آخرت کے اسلامی تصور میں دنیا کی تعمیر مضمر ہے ۔ ترجیح آخرت کی کوشش عبارت ہے ایک بہتر، بلند تر وسیع تر اور جامع تر دنیا کی زندگی کو ایک حقیر، پست، تنگ، محدود اور ناقص زندگی کے مقابلہ میں عارضی لذتوں کی قربانی کرکے اور مصیبتوں اور اذیتوں کو برداشت کرکے خدا کی مخلصانہ رضاجوئی کے جذبے کے ساتھ اختیار کرنے سے ۔ آخرت کی فلاح اسی کوشش کا نتیجہ ہے جو خدا کی رضاجوئی کا صلہ اور انعام ہے ۔

حافظ محمد نعیم صدیقی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

رشوت

(کتاب و سنت کی روشنی میں)

چھٹی صدی عیسوی کا ربع آخر تاریخ انسانی کا تاریک ترین دور تھا۔ اس وقت پورے ربع مسکون پر وحشت ناک تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ظلمات کی تہہ بہ تہہ بلائیں شرک و کفر، غرور و تکبر، بغض و عناد، حرص و ہوس، قتل و غارت، مکاری و غداری اور بدمستی و بدشعاری وغیرہ انسانی قلوب کو ناگن کی طرح ڈستی چلی جارہی تھیں، انسانیت تباہی و ہلاکت کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ قریب تھا کہ خداوند قدوس بغاوت و سرکشی کی پاداش میں اس دنیا کو فنا کے گھاٹ اتار دے۔

لیکن ـــــ جس طرح شب دیجور کی تاریکی کے بعد سپیدۂ سحر نمودار ہوکر روز روشن کا مژدہ سناتا ہے۔ اسی طرح جب دنیا پر تو بر تو تاریکیاں سایہ فگن ہوگئیں تو اللہ تعالےٰ نے اپنے قانون ازلی کے تحت عرب کے ریگ زار میں اپنی رحمت کے سوتے کھول دیئے جس سے پوری تشنہ کام دنیا سیراب ہوگئی۔

خداوند قدوس نے جو نظام حیات دے کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اس گم کردہ راہ دنیا کی رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا تھا وہ بلاشبہہ ہر گوشے سے کامل اور جامع تھا۔ زمانہ بدلتا رہا۔ انقلابات رونما ہوتے رہے لیکن یہ قانون ابدی ہر عصر و عہد کے عقدہائے مشکل کی گرہ کشائی کرتا رہا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر اسی نظام حیات کو عام کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اور بلاشبہہ آپ نے اپنی بارآور مساعی کے ذریعے سے پورے ربع مسکون سے برائیوں کی جڑ کاٹ کر اسے امن و آشتی کا گہوارہ بنادیا تھا۔ شرک و کفر کی بدلیاں چھٹ کر رہ گئیں۔ اسلام کے لائے ہوئے نظام زندگی کو اپنا کر اس وقت ایک ایسا صالح اور صحتمند معاشرہ تیار ہوگیا تھا، جو رہتی دنیا کے لیے قابل تقلید اور نمونۂ عمل ہے

لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ عہد نبوی سے جتنا بُعد ہوتا گیا اسی نسبت سے تعلیمات نبوی بھی دلوں سے محو ہوتی گئیں۔ خدائی وعدوں پر ایمان و ایقان میں ضعف کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی حیثیت سے

مسلمان قعر ذلت میں گر گئے اور ــــــ وہ قوم جو صدیوں تک اپنی سیادت وقیادت کے ذریعہ دیگر اقوام پر فائق وممتاز رہی اور جس کی شجاعت ودلیری کے چرچے دشمنوں کے ایوانوں کو لرزہ براندام کر دیتے تھے آج ــــ اس نکبت اور ذلت سے دوچار ہے جس کی نظیر پوری اسلامی تاریخ میں ملنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے ۔

ملت مسلمہ کا یہ ضعف کوئی غیر متوقع نہیں بلکہ عین فطرت کے مطابق ہے ۔ کتاب مقدس نے اَنتمُ الاعلون اِن کُنتمُ مُومِنِین کہہ کر جہاں ایک طرف ملت کی سربلندی کے لیے ایمان وایقان کی شرط عائد کی ہے وہیں وَلاَ تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم سے اس کے ضعف اور وہن کے اسباب پر بھی روشنی ڈال دی ۔

یورپ کی تقلید میں رفتہ رفتہ پوری مسلم قوم اپنے مخصوص تہذیب وتمدن سے دامن چھڑا کر مغرب سے آنے والے سیلاب بلاخیز کی لہروں میں بہہ گئی ۔ وہ تمام مفاسد اور برائیاں جن کی بناء پر یورپ اخلاقی جذام میں مبتلا تھا در آئیں ۔ مثال کے طور پر رشوت ہے ۔ یہ درحقیقت معاشرہ انسانی کا ایک ایسا گھن ہے جو اندر ہی اندر اسے تباہ کرتا جا رہا ہے ۔ یہ معیشت کا ایک ایسا کیڑا ہے جس نے سماج کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

یاتی علی الناس زمانٌ لا یُبالی	لوگوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ
المرء ما اخذ امن الحلال ام	آدمی پرواہ ہی نہ کرے گا کہ وہ کیا لے رہا ہے
من الحرام	حلال سے یا حرام سے ۔

آج مرور وقت کے ساتھ ساتھ عرب کے اس صاحب بصیرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کے مظاہر کن کن نت نئے عنوانات کے ساتھ سامنے آتے جا رہے ہیں ۔ آج قوم کا ہر فرد شب وروز چکی کی طرح کسب مال کے لیے کوشاں ہے ۔ وہ ہمہ وقت صرف اسی فکر میں غلطاں وپیچاں رہتا ہے کہ کس طرح بیش از بیش مال اسے حاصل ہو جائے وہ کبھی بھول کر بھی یہ خیال اپنے نہاں خانہ دماغ میں نہیں لاتا کہ حصول مال کا یہ طریقہ شریعت کے مطابق ہے بھی یا نہیں، جائز ہے یا ناجائز، مناسب ہے یا نامناسب حرام ہے یا حلال ؟ بلکہ ــــــ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ عام طور پر لوگ ہر اس چیز کو جائز اور حلال تصور کرتے ہیں جو ان کے تعیش اور حظ نفس کا ذریعہ بن جائے ۔

یہی اور صرف یہی وجہ ہے کہ آج انسانی زندگی میں حرص و آز کی کثرت ہوگئی ہے۔ کم کمانے والا زیادہ مال حاصل کرنے کے لیے ساعی ہے اور زیادہ مال رکھنے والا بیش از بیش دولت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اور اس کے لیے بلا کسی خوف اور ہچکچاہٹ کے پوری آزادی کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو استعمال کر رہا ہے، نتیجہ ـــــ یہ ہے کہ آج دولت سے برکت یکسر ختم ہو کر رہ گئی، جس راہ سے مال کی ریل پیل ہوتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اسی راہ سے رخصت ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ـــــ رات کے کروڑپتی کے صبح کو دیوالیہ ہو جانے کی مثالیں اوراق ہستی پہ بکھری ہوئی بکثرت مل سکتی ہیں۔ رسول عربی (فداہ ابی و امی) کا ارشاد ہے:۔

جو شخص حرام کا مال کماتا ہے اس میں برکت نہیں دی جاتی اور اس کا صدقہ قبول نہیں کیا جاتا اور جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے، وہ اس کے لیے دوزخ کا ایندھن بنا دیا جاتا ہے۔

شرعی حیثیت سے تو رشوت کی حرمت قطعی ہے ہی، خود عقل و اخلاق کی رو سے بھی یہ ملک و معاشرہ کے خلاف غداری کے مترادف ہے۔ قوم کی عمارت اسی وقت مستحکم ہو سکتی ہے جب اس کے بنیادی عناصر میں باہمی ہمدردی تعاون و تکافل اور مواسات و اخوت کا دور دورہ ہو اور رشوت ـــــ اس میں ایک ناقابل تلافی شگاف پیدا کر دیتی ہے۔ گو کہ رشوت کا وجود کسی نہ کسی شکل میں ہر عہد میں رہا لیکن اس کا جتنا عموم آج ہو گیا ہے۔ اغلباً تاریخ کے کسی دور میں نہ رہا ہو۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں رشوت کے حرام، ناجائز اور نامناسب ہونے پر روشنی ڈال دی جائے۔ شاید کہ اس کا مطالعہ کسی ایک شخص کی بھی بگڑی زندگی کا اہم موڑ بن جائے اور وہ توبہ کر کے ~~اس~~ امداد غیبی سے دستکش ہو جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز

رشوت کی تعریف رشوت ہر اس معاوضہ کو کہتے ہیں جو کسی فرض منصبی کی ادائیگی، واجب کام کی انجام دہی اور ناحق و ناجائز کام کرنے کے لیے نقد رقم یا کسی دوسری چیز کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی رشوت کی تعریف کرتے ہوئے مجمع البحار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:۔

رشوت کے معنے یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کر لے۔[1]

---

[1] سیرت النبی جلد ۶ ص ۴۰۱

ناجائز معاوضہ کسی فرض منصبی کی ادائیگی میں ناجائز معاوضہ لینے کی مختلف صورتیں ہیں
(۱) کسی بل یا چیک کو متعلقہ حاکم سے منظور کرانے کے لیے کسی شخص کو تعویق میں ڈالے رکھنا حتیٰ کہ بالآخر یہ شخص اس کلرک کو کچھ "حق" ادا کرے اور پھر فوراً اس کا کام ہو جائے
(۲) کسی کی سفارش یا "کچھ" دینے کی وجہ سے اصلی حق دار کو محروم کر کے غیر مستحق کے حق میں فیصلہ کر دینا۔
(۳) کسی منصبی فرض کو انجام دینے کے لیے کچھ اپنا "حق الخدمت" وصول کرنا اور اس کے نہ ملنے کی صورت میں متعلقہ کو پریشان کرنا ڈرانا اور دھمکانا وغیرہ۔
مذکورہ بالا ان تین صورتوں کے علاوہ اور بھی متعدد صورتیں ایسی ہیں جن میں لیا گیا معاوضہ قطعی ناجائز اور ناحق ہوتا ہے۔ کسی مظلوم آفت رسیدہ پریشان حال اور حاجتمند کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا تو یوں بھی قانون اخلاق کی رو سے قطعی غیر انسانی حرکت ہے اور پھر جب اس پر قرآن و حدیث رسول دونوں نے سخت نکیر فرمائی ہو تو اس کی حرمت اور شناعت مزید مسلم ہو جاتی ہے۔

تحریم رشوت قرآن کی روشنی میں

اللہ جل شانہ نے اپنی مخلوق کے لیے ایک انتہائی صالح اور صحتمند معاشرہ تجویز کیا ہے جس میں ملت کا ہر فرد ایک دوسرے کا مونس و غمخوار اور ہمدرد ہو۔ ایک کی ذرہ برابر تکلیف دوسرے کا شب و روز کا چین اڑا دے اور ایک کی خوشی دوسرے کے لیے شادیانہ مسرت ثابت ہو اور جہاں سے یہ اسپرٹ یہ جذبہ مضمحل ہو گا وہیں سے قوم کی عمارت متزلزل ہو جائے گی۔
چنانچہ خداوند قدوس نے انسان کو رزق حلال کمانے کا حکم دیا تاکہ ہر شخص کسب مال میں اور معاش میں ساعی رہے اور کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آسکے کہ وہ دوسرے کے مال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کرے اور اس طرح سے جو رزق حاصل ہو گا وہ حلال اور طیب ہو گا اور اس سے نشو و نما پایا ہوا جسم انسانی کامل طور پر طاہر ہو گا۔
چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ	اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں
طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ	جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (بقرہ: ۱۷۲)	اگر تم اس کے بندے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى	اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے
الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا	حلال پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کی
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ	اتباع نہ کرو کیونکہ بلاشبہ وہ تمہارا کھلا ہوا
مُّبِيْنٌ ۝ (بقرہ۔۲۱)	دشمن ہے۔

اسی طرح سورۂ اعراف میں حلال و حرام کی ایک جامع فہرست بیان کرتے ہوئے خداوند قدوس نے ان دونوں کے درمیان گویا خط فاصل کھینچ دیا ہے۔ فرمایا:۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ	تو کہہ دے میرے رب نے حرام کیا
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْىَ	ہے صرف بے حیائی کی باتوں کو جو ان میں
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا	کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا	گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور اس
وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ	بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو کہ جس
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝	کی سند اس نے نہیں اتاری اور اس بات
(اعراف: ۳۳)	کو کہ لگاؤ اللہ کے ذمے وہ باتیں جو تم
	کو معلوم نہیں۔

آیت مذکورہ بالا کا ہر لفظ درحقیقت اپنے اندر تفصیلات کا ایک دفتر نہاں رکھتا ہے۔ الفواحش میں تمام علانیہ و خفیہ کام اور ان پیدا کرنے والی چیزیں آجاتی ہیں۔ الاثم میں ہر قسم کے صغائر و کبائر داخل ہیں۔ خواہ ان کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے۔ البغی سے حیوانی رذیل خصائل مراد ہیں — بغیر الحق میں ظلم کی حد تک پہنچی ہوئی زیادتیاں شامل ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب یہ امر متعین ہوگیا کہ غیر کے مال کو کسی ناجائز طریق سے حاصل کرنا درحقیقت باطل اور حرام مال لینا ہے۔ قرآن نے ناجائز طریق سے حاصل کردہ مال (جس میں رشوت بھی شامل ہے) کی حرمت کے بیان میں کسی ابہام سے کام لیے بغیر بہت صراحت اختیار کی ہے۔ علاوہ ازیں رشوت کی حرمت کو منتقل

طور سے بھی واضح کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	اور ایک دوسرے کا مال آپس میں
بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ	ناحق مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک
لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ	تاکہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال سے ظلم کے
بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	(ناحق) اور تم جان رہے ہو۔

آیتِ بالا میں "الاکل" درحقیقت "الاخذ" کے معنے میں مستعمل ہوا ہے یعنی مال کو ناجائز طریقہ سے لینا اور کسی طرح بھی اپنے تصرف میں لے آنا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر اس مال کو کھایا نہ جائے بلکہ کسی اور مصرف میں استعمال کر لیا جائے تو وہ جائز ہو جائے گا۔ کیونکہ عمومی طور پر مال کے حصول کا مقصد کثیر پندی ہوتا ہے اس لیے قرآن نے 'الاکل' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جمیع مفسرین نے اس کو الاخذ ہی کے معنے پر محمول کیا ہے۔

چنانچہ علامہ آلوسی آیت زیر نظر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

المراد من الاكل ما يعم الاخذ والاستيلاء[1]	اکل سے مراد اخذ ہے

علامہ رشید رضا مصری رقمطراز ہیں۔

المراد بالاكل مطلق الاخذ و	اکل سے مطلقاً اخذ مراد ہے اور یہ
التعبير من الاخذ بالاكل معروف	چیز لغت میں بھی معروف عام ہے۔ اہل عرب
في اللغة تجوزوا فيه قبل نزول	نزول قرآن سے قبل بھی اس طرح استعمال
القرآن[2]	کرتے تھے۔

عصر حاضر کے باکمال مفسر اور صاحب اسلوب ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی آیت زیر بحث کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے خامہ ریز ہیں کہ:۔

اکل یہاں لفظی معنے میں نہیں یعنی صرف "کھانا" مراد نہیں بلکہ کسی طرح بھی اپنے تصرف میں لے آنا ہے۔ اردو میں محاورہ بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ فلاں صاحب روپیہ کھا گئے یا روپیہ ہضم کر گئے اور بالباطل سے ہر ناجائز طریق مراد ہے...... وہ مال (حلال)

---

[1] روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۱
[2] تفسیر المنار ج ۲ صفحہ ۱۹

بھی باطل ہی کے حکم میں آتا ہے جو اس مال کے مالک سے اس کی خوشدلی کے بغیر حاصل کیا جائے گو مالک اسے خوشی سے بھی دے رہا ہو لیکن شریعت نے اس مد کو ناجائز قرار دیا ہو۔[1]

آیت میں اموالکم کا لفظ قرآن کی بلاغت کا ایک شاہکار نمونہ ہے حکم فرمایا کہ "اپنا مال نہ کھاؤ" بظاہر رشوت لینے والا دوسرے کا مال حاصل کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ اپنے ہی مال کو نامناسب طریقے سے غصب کرتا ہے کیونکہ انما المومنون اخوۃ کے اصول کے تحت ملت کے تمام افراد ایک ہی برادری سے متعلق ہیں۔ ان میں باہم اس طور پر اسلامی اخوت پائی جاتی ہے کہ ایک انسان کی کوئی چیز درحقیقت پوری قوم کی ملکیت ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ملتی ہیں جیسے لا تقتلوا انفسکم، لا تلمزوا انفسکم یعنی کسی بھی فرد کے جان، مال اور آبرو کا احترام اور حفاظت اصل میں اپنے مال، جان اور آبرو کا احترام اور حفاظت ہے۔

اور "باطل" کا مطلب یہ ہے کہ اس مال کے مقابل میں کوئی حقیقی شے نہ ہو جسے اس مال کا معاوضہ قرار دیا جاسکے۔ مثال کے طور پر ایک پیشکار کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ عوام کی درخواستوں اور شکایات کو حاکم کے روبرو پیش کرے۔ اب اگر وہ کسی شخص سے درخواست پیش کرنے کا کچھ "حق الخدمت" لیتا ہے تو یہ رشوت ہے اور قطعی ناجائز اور حرام۔ کیونکہ درخواست پیش کر کے تو اس نے اپنا فرض منصبی انجام دے دیا جس کی تنخواہ وہ حکومت یا متعلقہ محکمے سے ماہ بماہ وصول کرتا ہے۔ اب یہ "حق الخدمت" کے نام سے جو معاوضہ ہے اس کے مقابل میں کوئی بھی چیز باقی نہیں رہتی لہذا اس کے جواز کا کوئی سوال ہی نہیں۔

علامہ رشید رضا لکھتے ہیں:۔

اما الباطل فهو ما لم يكن في مقابلة شيء حقيقي ...... فقد حرمت الشريعة اخذ المال بدون مقابلة حقيقة	باطل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقابل میں کوئی حقیقی چیز نہ ہو ...... لہذا شریعت نے بغیر حقیقی شے کی مقابل مال لینے کو حرام قرار دیا ہے۔

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۱ صفحہ ۷۰

[2] تفسیر المنار جلد ۲ صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱

مفسر ابوحیان اندلسی نے لکھا ہے کہ بالباطل سے مراد یہ ہے کہ اموال کو ایسے طریق سے لیا جائے جو مشروع نہیں ہے رقمطراز ہیں :۔

فیدخل فی ذالک الغصب	چنانچہ اس میں لوٹ کھسوٹ، جوا، کاہن
والنھب والقمار وحلوان الکاھن	کی رشوت، خیانت، رشوت اور جو نجومی لیتے
والخیانۃ والرشاء ومایاخذہ	ہیں اور ہر وہ چیز شامل ہے جس کے لینے کی
المنجمون وکل مالم یاذن فی اخذہ الشرع[1]	شریعت نے اجازت نہیں دی ۔

اور تفسیر خازن کے مطابق ظلم کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، رہزنی کرنا، جوا کھیلنا، گانے بجانے کو ذریعہ روزگار بنانا، لہو ولعب کے کھیل دکھا کر روزی کمانا، رشوت لینا، جھوٹی گواہی دینا، جعلی دستاویزات تیار کرنا، دروغ حلفی کرنا، حاکموں کو نذر نذرانے اور ہدیے و تحفے پہنچانا، ان کی دعوتیں کرنا اور امانت میں خیانت کرنا (خواہ مسلم سے یا غیر مسلم سے) یہ سب چیزیں "ناجائز طریقے (بالباطل) کی تعریف میں داخل ہیں۔[2]

یہاں تک کی گفتگو آیت کریمہ کے پہلے جزء یعنی "ناجائز طریق سے مال کے حاصل کرنے کے بارے میں تھی جس میں دوسری صورتوں کے ساتھ رشوت بھی داخل ہے جیسا کہ مذکورہ بالا تصریحات سے ظاہر ہوا ۔ اس کے بعد آیت کا دوسرا جزء رشوت کی حرمت کے سلسلے میں بہت صریح ہے ۔ فرمایا گیا :۔

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا	اور تم حکام کے پاس رشوت نہ پہنچاؤ
فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ	تاکہ تم لوگوں کا کچھ مال ناحق کھا جاؤ۔ درآں حالیکہ
وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○	تمہیں علم ہو ۔

آج کچہریوں، دفتروں، پرائیوٹ اداروں، سرکاری محکموں حتیٰ کہ تعلیمی اداروں میں اس رشوت کی جو گنگا بہتا ہے وہ اہل نظر و خرد سے مخفی نہیں ۔ علامہ آلوسی آیت کریمہ کے اس جزء کی نسبت رقمطراز ہیں کہ

لا تلقوا بعضھا الی الحکام	کچھ مال برے حکام کو رشوت کے طور پر
السوء علی وجہ الرشوۃ[3]	نہ دو ۔

---

[1] البحر المحیط جلد ۲ صفحہ ۵۶ [2] تفسیر خازن جلد ۱ صفحہ ۱۲۱

[3] روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۶۹

عربی میں ادلار کے معنے پانی نکالنے یا کسی اور غرض کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ اسی سے استعارۃً مقصودِ حقیقی یا کسی شے تک پہنچنے کے معنے میں لے لیا گیا۔ چنانچہ لغات القرآن میں ہے

"تدلوا' ادلاء سے ہے جس کے معنے ڈول نکالنے کے ہیں۔ اسی اعتبار سے بطور استعارہ کسی چیز تک پہنچنے اور کسی شے کے ڈالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے[1]

ابن جریر طبری رقمطراز ہیں کہ

اصل الادلاء ارسال الرجل الدلو فی سبب متعلقا بہ فی البئر[2]
ادلار کی اصل کسی شخص کا کنوئیں میں کسی غرض کے لیے ڈول ڈالنا ہے

اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں

والادلاء فی الاصل ارسال الحبل فی البئر ثم استعیر للتوصل الی الشیئ
اصل میں ادلار کے معنے کنوئیں میں رسی ڈالنے کے ہیں۔ پھر کسی شے تک پہنچنے کے معنے میں اس لفظ کو مستعار لے لیا گیا۔

رشوت کو" ادلار دلو" سے تشبیہ دینے کی دو وجہیں ہیں۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی اس کی توضیح کرتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر میں لکھتے ہیں:

(۱) بلاشبہ رشوت ضرورت کی رسی ہے پس جس طرح پانی سے بھرا ہوا ڈول رسی کے ذریعہ دور سے قریب کھینچ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح مقصد بعید کا حصول بھی رشوت کے ذریعہ قریب ہو جاتا ہے۔

(۲) جس طرح حاکم کو رشوت دے کر بغیر کسی تاخیر کے فوراً موافق فیصلہ کرا لیا جاتا ہے اسی طرح ڈول بھی جب پانی نکالنے کے لیے کنوئیں میں ڈالا جاتا ہے تو غایت درجہ تیزی سے چلا جاتا ہے۔

ابو حیان اندلسی تدلوا بھا الی الحکام کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

معناہ لا ترشوا بالاموال الحکام لیقضوا لکم باکثر منھا
اس کے معنے یہ ہیں کہ حکام کو مال کی رشوت نہ دو تاکہ وہ تمہارے موافق فیصلہ کردیں

ابن عطیہ نے ابو حیان کے مذکورہ بالا قول کو راجح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

---

[1] لغات القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۰ — [2] تفسیر طبری جلد ۲ صفحہ ۱۰۱

[3] روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۱۰ — [4] تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۱۱

لان الحاکم مظنۃ الرشاو الا من عصمہ وھو الاقل [1]

اس لیے کہ حاکم ہی زیادہ رشوت لیتے ہیں الا یہ کہ کوئی مامون رہے، مگر ایسے حاکم خال خال ہی مل سکیں گے۔

مدارک میں ہے:۔

وتدلوا بھا ای وتلقوبعضھا الی حکام السوء علی وجہ الرشوۃ یقال ادلی دلوہ ای القاءہ فی البئر للاستسقاء [2]

وتدلوا بھا یعنی برے حکام کو مال رشوت کے طور پر مت دو۔ کہا جاتا ہے کہ ادلی دلوہ یعنی اس نے کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے اس میں ڈول ڈال دیا۔

متذکرہ الصدر تفصیلات سے معلوم ہوا کہ جمیع مفسرین نے اس آیت کریمہ کو تحریم رشوت کے باب میں صریح قرار دیا ہے۔ کیونکہ جب "ناجائز طریق سے مال کے حصول میں رشوت کا تعین ہو جاتا ہے تو پھر "لا تاکلوا" سے اس کی حرمت پر مہر قطعی ثبت ہو جاتی ہے۔

تحریم رشوت، احادیث کی روشنی میں

کتاب الٰہی کی روشنی میں رشوت حرام ثابت ہو جانے کے بعد اس کے شارح اعظم پیغمبر عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال زریں کے آئینہ میں بھی اس گناہ عظیم کے خدوخال ملاحظہ کر لیے جائیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا مقصد اولیں اور مشن ہی یہ تھا کہ اس کرۂ ارضی پر خدائے وحدہٗ لاشریک کا اطاعت گزار ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جو ہر گوشہ اور ہر حیثیت سے اس طرح مکمل ہو کہ آنے والی نسلیں اسے نمونۂ عمل اور دلیل راہ بنائیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد عدل ہے کہ آپؐ کی بار آور مساعی کے ثمرہ میں قرون اولیٰ کے بے نظیر معاشرہ کی نظیر سے پوری تاریخ انسانی خالی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج اور سوسائٹی سے تمام برائیوں کی جڑ کاٹتے ہوئے رشوت پر بھی شدید نکیر فرمائی ہے۔ چنانچہ تحریم رشوت کے سلسلے کی بنیادی حدیث جس میں رشوت لینے اور دینے والوں کا ٹھکانا دوزخ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

---

[1] البحر المحیط جلد ۲ صفحہ ۵۶ [2] مدارک التنزیل جلد ۱ صفحہ ۹۳

اس حدیث کے متعلق امام ترمذیؒ رقمطراز ہیں کہ

حدیث ابی سلمۃ عن عبد اللہ ابن عمرو عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسن شیئ فی ھذا الباب واصح [1]	ابو سلمہ کی حدیث جو انھوں نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ صحیح حدیث ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی حدیثوں میں رشوت لینے اور دینے پر شدید ترین نکیر کی گئی ہے جو ذیل میں مندرج ہیں :۔

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعنۃ اللہ علی الراشی والمرتشی [2]	عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رشوت لینے اور دینے والے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔
عن عبد الرحمٰن بن عوف قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ الآکل و المطعم الرشوۃ [3]	حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے رشوت کھانے اور کھلانے (لینے اور دینے) والے پر لعنت کی ہے۔
عن عبد اللہ بن عمرو قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی [4]	حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت کی ہے۔

اور ــــــ نہ صرف رشوت لینے اور دینے والوں پر لعنت کی گئی ہے بلکہ وہ شخص جو ان دونوں کے درمیان معاملت اور دلالی کا کام انجام دیتا ہے وہ بھی اسی سزا کا مستوجب اور مستحق قرار دیا گیا ہے

[1] ترمذی کتاب الاحکام

[2] مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۲ و کنز العمال ج ۳ ص ۲۱۰ [3] کنز العمال ج ۳ ص ۲۱۰

[4] مسند طیالسی حدیث ۲۲۷۶ و مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۶۴

چنانچہ فرمایا گیا :۔

عن ثوبان قال لعن رسول	حضرت ثوبان رضؓ سے مروی ہے کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی و	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے دینے والے
والمرتشی والرائش الذی یمشی	اور وہ شخص جو ان دونوں کے درمیان دلالی
بینھما لہ	کرے ان سب پر لعنت کی ہے ۔

رشوت اور حکام قرآن پاک کی جو آیت شروع میں گذری ہے اس میں تحریم رشوت کے ساتھ ساتھ حکام کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ کیونکہ معاشرہ میں سب سے زیادہ وہی ملوث ہوتے ہیں ۔ آج بھی عدالتوں میں کچہریوں میں سرکاری اور نیم سرکاری دفتروں میں، اور نجی تجارتی اداروں میں غرض ہر جگہ رشوت کی گرم بازاری اور نت نئی شکلوں میں اس کا عمل دخل ملتا ہے ۔ کہیں بواسطہ اور بلا واسطہ کہیں نقدا ور کہیں دوسرے ناجائز مفاد کی شکل میں

دراں حالیکہ ہر محکمہ کا ذمہ دار درحقیقت عوام اور رعایا کے حقوق کا محافظ اور اپنے شعبہ کا امین ہوتا ہے ۔ اگر وہ اپنے اس فرض میں کوتاہی اور خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ ـــــــ درحقیقت حدود اللہ کے توڑنے کے ساتھ حکومت کی عمارت میں شگاف ڈالنے کا مرتکب ہوتا ہے جس کی سزا انتہائی دردناک ہے ۔

تحفہ اور حکام حکام کے لیے رشوت کے حرام ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہدیہ اور تحفہ جو کہ ازدیاد تعلق اور محبت کی علامت ہے ۔ اور جس کا حکم خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "تہادوا تحابوا" کے واضح الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے لیکن حکام کے لیے تحفہ قبول کرنے ممانعت کی گئی ہے کہ وہ بھی رشوت میں داخل ہے ۔ فرمایا :۔

ھدایا العمال حرام کلھا ؎	عمال کا ہدیہ قبول کرنا یکسر حرام ہے

اور

اخذ الامیر الھدیۃ کفر و	امیر کا ہدیہ کو قبول کرنا اور قاضی کا رشوت
قبول القاضی الرشوۃ کفر ؎	لینا دونوں کفر کی طرح ہیں

لہ مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۷۹، کنز العمال ج ۳ ص ۲۱۰، اتحاف السادۃ شرح احیاء العلوم ج ۶ ص ۱۵۹
ؔ کنز العمال ج ۳ ص ۲۱۰ ؔ ایضاً

اور

ھدایا السلطان سحت وغلول[1] سلطان کا ہدیوں کو لینا خیانت اور حرام ہے

اور

الھدایا للامراء غلول[2] امراء کے لیے ہدیوں کا قبول کرنا خیانت ہے

ہاں چند شرائط کے ساتھ حکام اور دوسرے ذمہ دار لوگوں کو تحفہ دینا اور ان لوگوں کو اس کو قبول کر لینا جائز ہے۔

(۱) جب ازراہ اخلاص اور کسی توقع کے بغیر پیش کیا جائے۔

(۲) اس سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔

(۳) سابقہ تعلقات ہوں۔

عہد نبوی میں ایک علاقہ کا حاکم ابن اللتبیہ نامی ایک مرتبہ صدقات و زکوٰۃ کی رقمیں جمع کر کے دربار نبوی میں حاضر ہوا۔ تو اس نے رقمیں پیش کر کے عرض کیا کہ یہ آپ کا واجب الوصول ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے۔ یہ سنکر حضور منبر پر کھڑے ہوئے اور ایک تاریخی خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ:۔

میں تم لوگوں میں سے کچھ کو ان کاموں کا حاکم بناتا ہوں جو اللہ نے میرے سپرد فرمائے ہیں تو تم میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ ہدیہ مجھے دیا گیا ہے' وہ اپنے والدین کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہا اور پھر دیکھتا کہ گھر بیٹھے پر اس کو یہ ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں[3]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رح اپنے دور حکومت میں ہدایا قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ اس کا سبب دریافت کیا گیا کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہدیے قبول فرمایا کرتے تھے تو آپ کیوں انکار کرتے ہیں؟ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی وجہ سے ہدیہ دیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کی صورت نہیں بدلتی تھی مگر ہمیں ـــــ حکومت کی وجہ سے ہدیہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی نوعیت بدل جاتی ہے وہ ہدیہ نہیں رہتا بلکہ رشوت بن جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام حاکموں کو لکھا کہ "لا تقبلوا الھدیۃ فانھا رشوۃ" ہدیہ قبول نہ کیا کرو۔ کیونکہ وہ رشوت ہوتا ہے۔

---

[1] کنز العمال ج ۳ ص ۲۱۰ [2] ایضاً۔ [3] بخاری باب الزکوٰۃ

رشوت اور فیصلہ آج یہ ایک انتہائی غلط تصور عام ہو چکا ہے کہ حکام اور ذمہ دار منصب والوں کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرانے سے فی الواقع اور عند اللہ بھی وہ فیصلہ جائز اور برحق ہوتا ہے حالانکہ مقدمات فیصل کرنے میں رشوت لینا بجائے خود حرام ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے۔

کل لحم انبتہ السحت فالنار اولی بہ قیل وما السحت قال الرشوۃ فی الحکم ۱؎	ہر وہ جسم جو حرام مال سے نشو و نما پائے وہ آگ میں جلائے جانے کا زیادہ مستحق ہے دریافت کیا گیا کہ السحت سے کیا مراد ہے فرمایا فیصلہ کرنے میں رشوت لینا۔

دوسری جگہ سخت وعید کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:۔

لعن اخذ رشوۃ فی الحکم کانت سترا بینہ وبین الجنۃ ۲؎	فیصلہ کرنے میں رشوت لینے والے پر لعنت کی گئی ہے وہ رشوت اس شخص اور جنت کے درمیان حائل ہو جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ الراشی والمرتشی فی الحکم ۳؎	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کرنے میں رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت کی ہے۔

حتیٰ کہ رشوت لے کر فیصلہ کرنے والے کے عمل کو کفر کے برابر سنگین گناہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الرشوۃ فی الحکم کفر وھی بین الناس سحت ۴؎	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے میں رشوت لینا دینا کفر ہے اور لوگوں کے درمیان باہمی رشوت کا لین دین حرام ہے

۱؎ ابن جریر بحوالہ کنز العمال ج ۳ ص ۲۱۱
۲؎ کنز العمال ج ۳ ص ۲۱۱
۳؎ مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۳۸۷
۴؎ المعجم الصغیر للطبرانی

ثانیاً بقول مولانا ابوالکلام آزاد "رشوت خور حاکم کے فیصلے سے ناجائز بات جائز نہیں ہو سکتی"[۱]
امام ترمذی نے اپنی جامع میں ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے۔ باب ماجاء فی التشدید علی من یقضی لہ بشیئ لیس لہ ان یاخذہ اور پھر اس کے تحت درج ذیل حدیث نقل کی ہے

عن ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ	حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی
عنہا قالت قال رسول اللہ صلی	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
اللہ علیہ وسلم انکم تختصمون	کہ تم لوگ میرے پاس اپنا تنازعے کراتے
الی وانما انا بشر ولعل بعضکم	مگر میں بھی ایک انسان ہی ہوں اور ممکن ہے کہ
ان یکون الحن بحجتہ من بعض	تم سے کوئی فریق اپنی تیز زبانی سے دوسرے
فان قضیت لاحد منکم بشیئ من	پر سبقت لے جائے اگر میں کسی چیز کا فیصلہ کر دوں
حق اخیہ فانما اقطع لہ قطعۃ	اور وہ درحقیقت اس کے ساتھی کی ہو تو سمجھ لو
من النار فلا یاخذ منہ	کہ میں اس کے لیے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں
شیئاً [۲]	پس اس کو اس میں سے ناحق نہ لینا چاہیے۔

اس خوفناک انجام کے فرمان کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو فریقین اپنا قضیہ لے کر دربار نبوی میں آتے تھے ان میں سے ہر ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر مصر ہونے لگا۔

عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار و رئیس فیصل کرتے تھے، وہ لوگ قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے قاضی علانیہ لیتے تھے اور اس طرح وہ تورات کے احکام پر پردہ ڈال کر ناحق فیصلے کرتے تھے۔

حضرت سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ تورات کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری ہے قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے۔ ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتٰب ویشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار الخ "پیٹ میں آگ بھرنا" اس لیے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں رد و بدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے۔[۳]

---

[۱] ترجمان القرآن جلد ۱ ص ۲۳۶ [۲] ترمذی ابواب الاحکام وتفسیر المنار ج ۲ ص ۱۹۴
[۳] سیرۃ النبی ج ۶ ص ۲۰۲

رشوت کے اثرات

بظاہر انسان ناجائز طریقہ سے مال حاصل کرکے اسے امداد غیبی تصور کرتا ہے اور شاداں ہوتا ہے لیکن اس متاع قلیل کے لیے کر اس نے درحقیقت ایک بہت بڑی خدائی لعنت ہمیشہ کے لیے اپنے اوپر مسلط کرلی۔ کیونکہ رشوت کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں جب تک وہ رشوت کے مال کو اس کے حقیقی مالک کو واپس نہیں کردیتا اسے مال غیر پر غاصب تصور کیا جائے گا اس لیے کہ مال حرام پر ملکیت اصل مالک ہی کی برقرار رہتی ہے۔

علاوہ ازیں رشوت لینے والے کا نہ تو نیک عمل قبول ہوتا ہے اور نہ عبادات صدقات وخیرات ہی شرف قبول سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اسی طرح رشوت راشی اور جنت کے درمیان حائل ہوجاتی ہے۔ رشوت کے اثرات یہاں تک وسیع ہوتے ہیں کہ اس مال سے عزیز واقارب، دوست واحباب اور اہل وعیال جو کوئی بھی فائدہ اٹھائے گا سب گناہگار رہیں گے، حتی کہ حکم ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق معلوم ہوجائے کہ اس کی تنخواہ کی حلال آمدنی سے رشوت کی تعداد زیادہ ہے تو ایسے شخص کی دعوت اور اس کا تحفہ قبول کرنا بھی ناجائز اور مکروہ ہے۔

صاحب بذل المجہود کے قول کے مطابق اگر کوئی شخص اپنے جائز حق کو حاصل کرنے یا اپنے سے کسی زیادتی و ظلم کو دور کرنے کے لیے رشوت دیتا ہے تو وہ اس وعید سے خارج ہے۔

لیکن یہ امر ملحوظ رہنا بہت ضروری ہے کہ ایسی شدید مجبوری کی صورت میں بھی اپنا جائز حق وصول کرنے کے لیے جو کچھ دیا جائے گا۔ وہ رشوت ہی کہلائے گا، ہاں اتنا ضرور ہوگا کہ رشوت دینے والے کو معذور سمجھا جائے گا۔ تاہم رشوت لینا والا ارتکاب حرام سے نجات نہ پاسکے گا۔

آخری بات

مذکورہ بالا تفصیلات سامنے آنے کے بعد اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہنی چاہیے کہ آج معاشرہ اور سوسائٹی رشوت کے جس مہلک ترین مرض میں گرفتار ہے شریعت میں اس کے لیے کسی عنوان سے قطعًا کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آج ـــــ سماج میں خود غرضی اور مفاد پرستی کا جو دور دورہ ہے وہ درحقیقت رشوت اور سود ہی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ایک طاقتور قوم کی عمارت اسی بنیاد پر مستحکم ہوتی ہے کہ اس کے افراد باہم پشتیبان ثابت ہوں اور اس قوم کے تمام عناصر اس طرح جڑے ہوئے ہوں کہ انہیں جدا کرنا ممکن نہ ہو، لیکن ـــــ جس قوم میں رشوت اور سود کا عموم ہوجائے، وہاں اتحاد کے بجائے افتراق، انارکی، تشتت اور انتشار کی کارفرمائی نظر آئے گی اور آج تمام اقوام عالم اسی خطرناک دور سے

گزر رہی ہیں۔

ایسے وقت میں ملت مسلمہ بالخصوص اکابر امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ معاشرہ سے ان برائیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے جد وجہد کریں۔ خود "حلال کی کمائی میں برکت" کا نمونہ بن کر دوسروں کے سامنے پیش ہوں، اب تک جو رشوت لے چکے ہوں اس پر سے اپنا غاصبانہ قبضہ ختم کر کے ان کے حقیقی مالکوں کو واپس کریں اور آئندہ کے لیے صدق دل سے توبہ کر کے ازسرنو میدان حیات میں قدم رکھیں۔ ان شاء اللہ رزق حلال میں برکت سے شادکام ہوں گے۔ یہ خدائی وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ شرط اولیں ایمان و یقین کی پختگی ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

(سید جمال احمد، امین آبادی)

انسان کی سیرت اور اس کے کردار کی تعمیر و تشکیل پر عمومی طور پر معاشرے اور ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ خارجی طور پر تعلیم و تربیت کے ذریعہ بھی بڑی حد تک شخصیت بنتی ہے اور اس کے اندر مطلوبہ صفات پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن سیرت کی تعمیر میں بعض ایسے عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں جن کا تعلق انسان کی زندگی کے طبعی، خلقی، جبلی اور وہبی خصوصیات سے ہے۔ انسان کی بعض خصوصیات خلقی حیثیت سے مثبت نوعیت کی حامل ہیں جیسے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (سورہ التین) ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ انسان کے جس حسن کا تذکرہ فرما رہے ہیں وہ حسن، جسمانی ہیئت و ساخت کے اعتبار سے بھی ہے اور طبیعت و مزاج کے اعتبار سے بھی۔ انسان کو بحیثیت مجموعی پیکر حسن و کمال بنایا گیا ہے۔ یہ ہے سیرت انسانی کا مثبت پہلو۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ ایک منفی پہلو۔ یہ بھی بیان کیا گیا کہ انسان کی تخلیق اس طور پر کی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ رنج و محن اور فکر و غم میں مبتلا رہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ (البلد) ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے

اگر کسی ایسے آدمی کو جو تیرنا نہ جانتا ہو اٹھا کر بحر مواج میں پھینک دیا جائے تو ظاہر ہے وہ غرق ہو جائے گا۔ کیونکہ پانی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے انسان کو غرق کر دینے پر مائل رہتا ہے۔ اگر انسان ہاتھ پیر مارے بغیر پانی میں کھڑا رہے تو وہ خود بخود پانی کی تہہ میں پہنچ جائے گا۔ پانی کے اوپر ٹھہرا رہنے کے لیے تیرنے کی مشق کرنی پڑتی ہے اور کچھ ہاتھ پیر چلانا ضروری ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی صورت انسان اور

اس دنیا کی ہے۔ قرآن کریم میں سورۃ العصر کے اندر ٹھیک یہی مضمون بڑی جامعیت اور بلاغت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ	قسم ہے زمانے کی کہ انسان بڑے خسارے
خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	میں ہے، مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے
الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ	اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝	کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی فہمائش
(العصر)	کرتے رہے۔

انسانیت اپنی بے شعوری کی وجہ سے نقصان و ہلاکت کی طرف جا رہی ہے۔ عالم انسانی کا ایک سرسری مطالعہ اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہے کہ فکر و عمل کی زبوں حالی نے ہلاکت و تباہی کے قعر مذلت میں سارے زمانے کو جھونک دیا ہے اور تاریخ عالم انسانی بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ایمان، عمل صالح، فہمائش حق و وصیت صبر کی صفات سے متصف نفوس قدسیہ کے ایک مختصر گروہ کے سوا انسانوں کا ایک جم غفیر تباہی سے ہم کنار ہوتا رہا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شعوری طور پر حق کے تقاضوں کو اختیار کر کے مخالف حق عوامل سے نمٹنے کی بالارادہ اور ذمہ دارانہ طور پر سعی و جہد نہ کی جائے تو انسان کے اندر نہ صرف یہ کہ ذخوداعلیٰ و پاکیزہ صفات کا پیدا ہونا ناممکن ہے بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ ہلاک و برباد ہو اور اس کو اس بات کا احساس بھی نہ ہونے پائے کہ وہ بربادی کی راہ پر گام زن ہے۔ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے اسی حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى	ہم نے یہ امانت (یعنی احکام دین)
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی
فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	تھی سو انہوں نے اس ذمہ داری کے لینے سے انکار
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا	کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو
جَهُوْلًا ۝	(اپنے ذمہ) لے لیا۔ وہ ظالم ہے جاہل ہے۔

اس آیت میں تین باتیں ہیں۔ ایک انسان میں ذمہ داری کے احساس کا فقدان دوسرا اس کا ظالم ہونا

اور تیسری بات اس کا جاہل ہونا ہے جس طرح روز ازل اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے انسان سے اس بات کا عہد و میثاق لیا تھا کہ وہ آیندہ دنیا کی زندگی میں اللہ تعالےٰ کی ربوبیت کو تسلیم کرے گا اور اس سے سرتابی نہیں کرے گا۔ اسی طرح اس کے سامنے امانت دین کی گراں بار ذمہ داری بھی پیش کی گئی تھی یہ ذمہ داری اس قدر عظیم اور کمر ہمت کو توڑ دینے والی تھی کہ آسمان، زمین اور پہاڑوں کے لیے بھی اس کو قبول کرنے کا تصور لرزا دیتا تھا۔ انسان نے اس ذمہ داری کو قبول کیا لیکن اس ذمہ داری کی عظمت کے تقاضے کے طور پر اسے جس طرح اس بار گراں کا حق ادا کرنا چاہیے تھا اس سے وہ اکثر عاری ہی رہا۔ اسی سیرت انسانی کے کمزور پہلو کی بنا پر اللہ تعالےٰ نے اس کو ظالم و جاہل قرار دیا ہے۔ اس ظلم و جہل سے انبیاء علیہ السلام اور صالحین کرام کا ایک مختصر گروہ ہی محفوظ رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ انسانیت کا سواد اعظم ظلم و جہل کا مظہر رہا ہے۔ کسی شے کو اس کے اصل مقام و محل سے ہٹا دینا ظلم ہے۔ حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے کائنات میں انسان کا حقیقی مقام و منصب کیا ہے۔ نیز اس کو کس طرح اپنے خالق و مالک کو پہچان کر اس کی اطاعت و عبادت کا حق ادا کرنا چاہیے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس پہلو سے عام انسانیت ہمیشہ حقیقت سے گریز کی راہ اختیار کرتی رہی ہے۔ اس لیے اس کا ظالم ہونا واضح ہے۔ اسی طرح اگر باوجود علم و دانش کے بلند بانگ دعووں کے اپنے خالق ہی کو پہچاننے سے قاصر رہ جائے تو اس انسان کو جاہل نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ انسانی سیرت کی اس عمومی کمزوری کا تقاضا ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان اس پہلو سے ہوشیار رہے لیکن یہاں بھی انسان بیداری ذہن و فکر کا ٹھیک طور پر حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جبکہ خود قرآن ہی سے تذکیر و یاد دہانی کا کام لیتا رہے۔ انسان کے ان منفی اور کمزور پہلوؤں کی رعایت کرتے ہوئے قرآن کس طرح مؤثر اور دل نشین انداز میں تعمیر سیرت کا کام انجام دیتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال مندرجہ ذیل آیات میں موجود ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ	پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لیے رزق
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ	پیدا کیا اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی کو مسخر بنایا

لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖۚ وَسَخَّرَ	کہ وہ خدا کے حکم سے دریا میں چلے۔ اور
لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِۚ	تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو مسخر بنایا اور
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۝	تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو مسخر بنایا
وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُؕ	جو ہمیشہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور تمہارے
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ	نفع کے واسطے رات اور دن کو مسخر بنایا اور
لَا تُحْصُوْهَاؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ	جو چیز تم نے طلب کی تم کو عطا کی گئی اور اللہ
لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝	تعالیٰ کی نعمتیں اگر تم شمار کرنے لگو تو شمار میں
(ابراہیم رکوع ۵)	نہیں لا سکو گے۔ سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی
	بے انصاف اور بڑا ہی ناشکرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر کس کس طرح سے احسانات فرمائے ہیں ذرا ایک ایک کا تصور کیجیے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیے۔ آپ جتنا ان نعمتوں کے بارے میں سوچتے جائیں گے آپ کا دل اللہ تعالیٰ کے بے پایاں شکر و احسان کے جذبات سے معمور ہوتا جائے گا۔ پھر آپ خود اپنا جائزہ لیجیے کہ کس حد تک ان عظیم نعمتوں اور گراں مایہ احسانات پر شکر و سپاس کے گہرے جذبات کے اثرات زیادہ دیر تک باقی رہتے ہیں۔ اس پہلو سے جب آپ اپنا محاسبہ کریں گے تو مندرجہ بالا آیات کا مفہوم آپ پر کھلتا جائے گا۔ پھر دنیا میں کتنے فی صدی انسان ایسے ہیں جو ان نعمتوں کا شکر ادا کرنا تو بڑی بات ہے کم از کم اس بات کا اعتراف ہی کرتے ہوں کہ یہ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔ اسی تلخ حقیقت کو قرآن کریم شدید متاثر کن انداز میں بیان کیا گیا ہے:۔

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًاۙ فَالْمُوْرِیٰتِ	قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے
قَدْحًاۙ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًاۙ	دوڑتے ہیں، پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں پھر
فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ	صبح کے وقت تاخت و تاراج کرتے ہیں، پھر اس
جَمْعًا ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ	وقت غبار اڑاتے ہیں۔ پھر (دشمنوں کی) جماعت
لَكَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ	میں جا گھستے ہیں بے شک آدمی اپنے پروردگار
لَشَهِیْدٌ ۝	کا بڑا ناشکرا ہے۔ اس کو خود بھی اس (حقیقت)
(العٰدیٰت)	کی خبر ہے۔

(باقی صفحہ ۴۲ پر دیکھیے)

ویدوں کا ایک مختصر تعارف

جناب احمد خضر زبیری ایم۔ ایس۔ سی

برادرانِ وطن سے باہمی روابط بڑھانے اور ان تک اسلام کی دعوت پہچانے کے لئے ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد و افکار اور ان کی مذہبی کتابوں سے واقفیت حاصل کی جائے اسی ضرورت کے پیش نظر ہم ماہنامہ زندگی میں اس طرح کے مختصر اور طویل مقالات شایع کرتے رہے ہیں۔ جناب احمد خضر صاحب کا ایک مقالہ ہم پہلے شایع کر چکے ہیں اور اب ان کا یہ دوسرا مقالہ شایع کر رہے ہیں (ادارہ)

وید کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم زمانے کی مذہبی حالت کی محفوظ کتابیں ہیں، وید یا اس سے قبل کی جو اور مذہبی کتابیں ملی ہیں وہ ناقص حالت میں ہیں، وید کافی ضخیم ہیں۔ ان کو برہمن[1] کے جزو کے طور پر غیر مخلوق خیال کیا جاتا ہے جو کہ کائنات کی تجدید کے وقت اس کے اندرون سے باہر آجاتے ہیں مغربی محققین رگ وید کو دو ہزار سے ایک ہزار قبل مسیح کی تصنیف قرار دیتے ہیں اور بعض لوگ اس کو ایک ہزار سے پانچسو سال قبل مسیح کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آریوں کے ہندوستان اور ایران میں آباد ہونے سے پہلے ان میں یکساں یا ملتے جلتے دیوتا اور رسم و رواج تھے، جس کی کہ وید اور پارسیوں کی اوستھا شاہد ہیں۔ رگ وید میں منظوم دعائیں ہیں۔ یجروید میں نثری عبارتیں ہیں، جو کہ قربانی اور عبادت کے وقت استعمال کی جاتی تھیں۔ سام وید میں منتر ہیں جو تقریباً سب، رگ وید سے لے کر گانے کے لئے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اتھروید میں بہت سے جادو منتر ہیں۔ اتھروید کو دوسرے ویدوں

۱۔ سنسکرت میں برہمن کا لفظ تلفظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے برہمن جب جنس کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس کے معنی ہیں غیر مشخص خدا مگر جب مذکر کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب ہے مشخص خدا۔ اس کے علاوہ اس لفظ کا اطلاق کچھ قدیم کتابوں پر کیا گیا ہے نیز برہمن ذات کے جو لوگ ہوتے ہیں ان سے تو سبھی واقف ہیں

کے مقابلے میں درجہ بڑی کشمکش کے بعد ملا تھا، ان ویدوں کا، کاغذ پر آنا اس نئے دور ہی کی بات ہے اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں، بعض انگریز مفکرین کی کوشش سے یہ کاغذ پر منتقل ہوئے۔ اس سے پہلے یہ صرف سینوں میں محفوظ تھے۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ بڑی احتیاط سے ان کی حفاظت کی گئی کیونکہ ان کے الفاظ میں بڑا جادو کا اثر سمجھا جاتا تھا اور تلفظ کی ذرا سی غلطی بہت خطرناک سمجھی جاتی تھی۔

رگ وید رگ وید میں دیوتاؤں کی شان میں حمدیہ نظمیں ہیں۔ رگ وید کے دیوی اور دیوتاؤں میں اگنی، اندر، سوم، ورن، متر، پوشن، بھاگ، وشنو، ردر، اوشا، سوریہ شامل ہیں۔ اگنی کا مقام دیوتاؤں میں کافی بلند ہے، وہ حفاظت کرتاہے، وہ دیوتا اور انسان کے درمیان واسطہ بھی ہے اور خود دیوتا بھی ہے۔ مغربی مفکرین کا خیال ہے کہ یہ دیوتا مظاہر قدرت کی تصویریں ہیں

اگنی ایلیٹ[1] کا خیال ہے کہ اگنی کا ذکر حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ تشبیہ کے طور پر کیا گیا ہے۔ بعض نظموں میں اس کی بھوری داڑھی اور بالوں کا ذکر ہے، بعض میں ایک یا کئی شعلہ ریز سر، بعض میں شعلہ نما زبان اور بعض میں شعلہ بار آنکھوں کا ذکر ہے۔ یہ سب آگ کی تشبیہیں ہوسکتی ہیں اس کی پیدائش کا ذکر مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے، وہ زمین پر لکڑی کی رگڑ سے پیدا ہوتا ہے، بادل میں بجلی کی طرح کوندتا ہے اور آسمان میں سورج کی طرح چمکتا ہے ـــــ ایک نظم میں اس کی دو پیدائشوں کا ذکر ہے، ایک زمین میں، ایک آسمان میں ـــــ ایک اور نظم میں اس کی ہزاروں پیدائشوں کا ذکر ہے کیونکہ وہ ہر گھر میں آگ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ـــــ کبھی اپنے آپ اپنا بیٹا کہا جاتا ہے اس کا مطلب ہے خود بخود منتقل ہونے والی آگ ـــــ بعض دفعہ اگنی کو دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ متحد کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اگنی، ورن ہے وہی متر ہے وہی اندر ہے اور سب دیوتا اس کی شکل ہیں ـــــ

اندر اندر، آریوں کا بہادر دیوتا ہے۔ وہ آریوں کی حفاظت کرتا ہے اور سیاہ فام لوگوں کو ان کا غلام بنا دیتا ہے ـــــ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے میدان جنگ میں پچاس ہزار سیاہ فام لوگوں کو مار بھگایا۔ بعض ایسے واقعات بھی ہیں جن کا ذکر اندر کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہندوازم اور بدھ ازم (از سر چارلس ایلیٹ)

ان واقعات کی کچھ نہ کچھ تاریخی بنیاد بھی ہے جیسے راجہ سودس کی جنگ ۔ نظموں میں اندر کی تصویر ایک لحیم شحیم اور مغلوب الجذبات دیوتا کی کھینچی جاتی ہے ۔ اس کی خوراک کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ سیکڑوں آدمیوں کا پکایا ہوا بیل اور بھینسوں کا گوشت کھاتا ہے اور نشہ آور سوم پیتا ہے اس کو نوجوان، غیر فانی اور لازوال کہا جاتا ہے ۔ وہ ایک ہیرو کی طرح رتھ میں سوار ہو کر تیر اور کمان سے لڑتا ہے ۔ بدھ ازم کی مقدس کتابوں میں اندر کو ایک عظیم الشان اور مقدس حیثیت دی گئی ہے ۔ مہابھارت اور پران میں بہت سے اندروں کا ذکر ہے ۔ ہر اندر ایک خاص زمانے کا مالک ہوتا ہے ۔ لیکن ژند اوستا جو کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے اس میں اندر کا ذکر، اہرمن کے دشمنوں میں کیا گیا ہے ۔ رگ وید میں بھی ان لوگوں کا ذکر ہے جو اندر کو نہیں مانتے ۔

وید میں جن دیوتاؤں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ہمیں خاص دلچسپی ورن کے ساتھ ہے

ورن ورن کا ذکر بالعموم متر کے ساتھ آیا ہے ۔ اس کے ساتھ دیومالا کے قصے، کہانیاں منسوب نہیں ہیں ۔ وہ قادر مطلق اور ہر جگہ موجود ہے اور اخلاقی قوانین کا محافظ ہے، زمین و آسمان اسی کی تخلیق ہیں، سورج، چاند، تارے، اسی کے حکم سے گردش کرتے ہیں، ہوا اس کی سانس ہے ۔ اسی کے حکم سے زمین اور آسمان جدا جدا ہیں، وہ ہمہ بیں اور ہمہ داں ہے ۔ زمین، آسمان اور اس کے باہر بھی جو کچھ ہو اس کو اس کا علم ہے، کوئی آدمی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا چاہے وہ آسمان سے بھی کہیں دور جا چھپے، جو کچھ آدمی کرتا یا سوچتا ہے اس کا بھی اسے علم رہتا ہے، گناہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کا نام ہے وہ گناہگاروں کو اپنی مضبوط گرفت میں رکھتا ہے، گناہ گار اس سے استغفار کرتے ہیں اور وہ توبہ کو سننے اور معاف کرنے والا ہے ۔ جبکہ اور دیوتاؤں سے دنیا کی چیزیں طلب کی جاتی ہیں ورن سے مغفرت مانگی جاتی ہے ۔ وہ آسمان میں ایک سنہرے محل میں رہتا ہے، اس کا تخت عظیم الشان ہے اور اس پر ہزاروں ستون ہیں، اس تخت سے وہ تمام آدمیوں پر نظر رکھتا ہے اور سب کو دیکھنے والا سورج اس کے دربار میں حاضر ہو کر سب باتوں کی اطلاع دیتا رہتا ہے ۔

ورن دیوتا کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ اور سب دیوتاؤں کی خصوصیات سے الگ اور بلند ہیں، ہر چند کہ اس کا ذکر وید میں اگنی اور اندر کے مقابلے میں بہت کم ہے مگر اس کی حیثیت بڑی عظیم الشان معلوم ہوتی ہے ۔ وید کے دیوتاؤں میں شاید یہی ایک دیوتا ایسا ہے جس کو اللہ کے تصور

کو نہ مماثلت حاصل ہے۔

اتھروید میں ایک نظم ورن کی شان میں ہے۔ ٹی۔ ایچ گری فیتھ کا خیال ہے کہ پورے ویدک لٹریچر میں کوئی اور نظم نہیں ہے جس میں خدا کی معرفت کا اتنے پر زور طور پر ذکر ہو۔ بدقسمتی سے یہ نظم بھی ایک جادو کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ گری فیتھ کا خیال ہے کہ نظم، اصل میں قدیم ہے اور بعد کو جادو کے لئے اس میں کچھ شعر اور بڑھا کر اتھروید میں شامل کر لیا گیا ہے۔

پرجاپتی

ہمارے لئے ایک اور ہستی جو قابل توجہ ہے پرجاپتی کی ہے، پرجاپتی کا ذکر واحد اور جمع دونوں صیغوں میں آتا ہے۔ وہ کائنات کی تخلیقی قوت یا قوتوں کا مظہر ہے۔ وید میں پرجاپتی کو زندہ مخلوق کا پروردگار اور مالک کہا گیا ہے۔ یہ القاب سوریہ کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ پرجاپتی کا تصور یہ ہے کہ سب دیوتا اور کائنات اسی ہستی سے وجود میں آئی اور اسی کے طفیل میں زندہ اور برقرار ہے۔ برہمن اور دوسرے لٹریچر میں جس میں کہ عبادت کی رسموں کا ذکر ہے پرجاپتی کو بلند درجہ حاصل ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ پرجاپتی کے تصور کو ہمارے تصورِ رب کے ساتھ کسی درجے میں بھی مماثلت حاصل ہے۔

اوشا

ادبی خصوصیات کے اعتبار سے، سب سے اچھی حمدیہ نظمیں اوشا دیوی سے متعلق ہیں، اوشا دیوی کا ذکر کبھی بطور ایک دلہن کے کیا جاتا ہے اور کبھی اس کا ذکر ایک مغرور دوشیزہ کے طور پر کیا جاتا ہے۔

سام وید

سام وید میں جو منتر ہیں وہ تقریباً سب رگ وید سے لئے گئے ہیں، یہ نظمیں سام یوگ کے موقع پر پڑھی جاتی ہیں، یہ ان دیوتاؤں کی شان میں ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس مقدس رسم کی ادائیگی کے موقع پر آتے ہیں، ان نظموں کا خاص مضمون پجاریوں کے لئے برکت طلب کرنا ہے، بعض نظموں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے اثر سے وہ آگ جس میں قربانی ڈالی جاتی ہے، مقدس ہو جاتی ہے، اور بعض کے اثر سے سوم کا رس مقدس ہو جاتا ہے۔

سام یوگ کی رسوم کی ادائیگی میں دو دن لگتے ہیں، پجاری اسی دوران میں جبکہ وید کی تلاوت کی جاتی ہے سخت ریاضت کرتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ریاضت سے پجاری ایک دیوتا کی

طرح پاک ہوجاتا ہے۔ تینوں ویدوں کے پڑھنے والے یعنی رگ، سام اور یجر کے پڑھنے والے ان رسوم میں حصہ لیتے ہیں۔ اتھروید کے پڑھنے والے ان رسوم میں شریک نہیں ہوتے۔ وید پڑھنے والوں کو چھ گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک رگ وید پڑھتا ہے دوسرا سام، تیسرا اندر کا انتظام کرتا ہے چوتھا آگ جلاتا ہے پانچواں سب رسوم کی ادائیگی پر دھیان رکھتا ہے اور چھٹا ایک گرنے کر دروازے پر کھڑا رہتا ہے تاکہ کوئی غیر مطلوب اندر نہ آنے پائے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک ایسا بھی ہوتا ہے جو ان ساری رسوم کا ذمہ دار ہوتا ہے اور جس کی طرف سے اور جس کے فائدے کے لئے یہ سب کیا جاتا ہے، رسوم کے پورا ہونے کے بعد برہمنوں کو انعام و اکرام ملتا ہے۔ سوم کا رس جس کو نذر میں خاص اہمیت حاصل ہے نشہ آور ہوتا ہے۔ اس رس کو خود دیوتا سمجھا جاتا ہے اور کبھی اگنی اور اندر کو بھی اسی کا مظہر کہا جاتا ہے۔

یجروید یجروید میں وہ منتر ہیں جو نذر کے وقت پڑھے جاتے ہیں، یج "کے معنی ہیں" عبادت کرنا اور" رد" کے معنی ہیں" جاننا" اس طرح یجر کے معنی ہیں" نیاز کے منتر اور رسوم کا علم" جب نیاز چڑھائی جاتی ہے تو یجروید میں سے مختلف منتر پڑھے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر نئے چاند اور پورے چاند کے موقع پر برہمن گرہست کے لئے نذر و نیاز فرض ہے۔ ہر نیاز میں دو روز لگتے ہیں۔ پہلے روز ابتدائی کام کئے جاتے ہیں۔ جیسے کہ مشرق اور شمال میں آتشدان بنائے جاتے ہیں اور مغرب کے آتشدان سے آگ لائی جاتی ہے۔ اسی روز، روزہ اور دوسری ریاضتوں کی نیت کی جاتی ہے اور دودھ کی نذر چڑھائی جاتی ہے۔ پہلے روز برہمن جو نذر چڑھانے میں سارا کام انجام دیتا ہے پالی کی شاخ کاٹتا ہے اور اس سے گائے کے ان بچھڑوں کو ہانک کرلے جاتا ہے جس گائے کا دودھ دوسرے روز نذر میں چڑھایا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ جب تک اس قسم کی تفصیلات پر نظر نہ ہو یجروید کے معنی نہیں سمجھے جاسکتے۔

اتھروید اتھروید کو دوسرے ویدوں کے برابر درجہ بعد کو حاصل ہوا۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا بعض مخفی طاقتوں کا شکار ہے۔ لوگ اپنی حفاظت کے لئے جادو منتر سے کام لیتے ہیں یا تو وہ خود ان بری طاقتوں سے رحم کی التجا کرتے ہیں یا کچھ دوسری بھلی طاقتوں سے امداد مانگتے ہیں۔ جن طاقتوں سے امداد طلب کی جاتی ہے ان میں رگ وید کے دیوتا بھی شامل ہیں

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

رسائل و مسائل

مسلکِ شافعی میں تکبیراتِ عیدین پر ایک سوال

سوال :- زندگی جلد ۴۰ شمارہ جنوری ۶۶ء میں پڑھا کہ مسلک شافعی میں عیدین کی نماز میں "امام اور مقتدی تکبیرات زور سے کہیں" یہ بات آپ نے کہاں سے لکھی ہے. حوالہ دیجئے کیرلہ میں شوافع ایسا نہیں کرتے آپ نے جو لکھا ہے اس پر لوگ بہت سوالات کرتے ہیں

جواب :-

میں نے وہ بات عبد الرحمٰن الجزیری کی مشہور کتاب "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کے حوالہ سے لکھی تھی، ہماری لائبریری میں فقہ شافعی پر بہت کم کتابیں ہیں اس لئے اس کتاب پر اعتماد کرکے وہ بات لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کی عبارت یہ ہے۔

والقراۃ فی صلوٰۃ العیدین تکون جهرا لغیر المأموم اما التکبیر فیسن فیها الجهر للجمیع

(ج۱ ص۳۵۲ مطبوعہ مصر)

نمازِ عیدین میں امام زور سے قراءت کریگا مقتدی زور سے قراءت نہیں کریں گے باقی رہی تکبیر تو اس کو امام اور مقتدی سب کے لئے زور سے کہنا مسنون ہے۔

یہ بات مولف نے مسلک شافعی کی توضیح کرتے ہوئے لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ مصر میں مقتدی بھی زور سے تکبیرات کہتے ہوں۔

وجوب عشر کیلئے زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں ہے

سوال :۔ جولائی ۵۳ء کے شمارے میں عشری زمین پر آپ نے جو لکھا ہے اس میں ایک قسم زمینوں کی اور رہ گئی ہے۔ میونسپلٹی زمینوں کو نیلام کرتی ہے، کسی کو پانچ سال کے لئے کسی کو نو سال کے لئے اور کسی کو وہ متعین لگان پر فروخت بھی کر دیتی ہے۔ میرے قبضے میں جو زمین ہے وہ نیلام میں لی گئی تھی لیکن میں اس کا مالک نہیں ہوں یعنی میں نہ اس کو فروخت کر سکتا ہوں، نہ کسی دوسرے کو بٹائی پر دے سکتا ہوں اور نہ میونسپلٹی کی اجازت کے بغیر اس میں کوئی تعمیر کر سکتا ہوں، ہر سال اس کا لگان ادا کرتا ہوں۔ مجھے بتلائیے کہ یہ کس قسم کی زمین ہے اور کیا اس کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے ؟

جواب :۔

جولائی ۵۳ء کے شمارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ چند سوالات کے جواب میں لکھا گیا تھا، اس میں اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان، جن زمینوں کے مالک ہیں ان میں عشری زمینیں ہیں یا نہیں ؟ اس میں گفتگو یہ نہ تھی کہ عشر کن کن صورتوں میں واجب ہوتا ہے۔ اس کو پڑھ کر شاید آپ نے یہ سمجھ لیا کہ عشر صرف اسی مسلمان پر واجب ہوتا ہے جو عشری زمین کا مالک ہو۔ بات یہ نہیں ہے۔ عشر واجب ہونے کے لئے کھیت کا مالک ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی پیداوار کا مالک ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی مسلمان زمین کی پیداوار کا مالک ہو تو اس پر بھی عشر واجب ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کسی مسلمان کاشتکار نے کسی دوسرے مسلمان سے اس کی زمین ایک سال کے لئے عاریۃً لی تاکہ وہ اس میں غلہ پیدا کر کے اس سے فائدہ اٹھائے تو اس عاریت لی ہوئی زمین میں جو غلہ وہ پیدا کرے گا۔ اس میں عشر واجب ہوگا اس لئے کہ اگرچہ وہ اس زمین کا مالک نہیں ہے لیکن اس پیداوار کا مالک ہے، اسی طرح کسی مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان سے لگان پر اس کی زمین اجارے پر لی تو اس زمین کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہوگا حالانکہ وہ اس زمین کا مالک نہیں ہے ——— دوسری بات یہ سمجھئے کہ مسلمان کاشتکار اگر کوئی ایسی زمین لگان پر لے جو نہ عشری ہے نہ خراجی تو اس زمین کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ زمین خراجی نہ ہو، اس کا عشری ہونا ضروری نہیں ہے ——— اس سے معلوم ہوا کہ جو زمین عشری ہو

اس پر بھی عشر واجب ہے اور جو زمین خراجی نہ ہو اس پر بھی عشر واجب ہے۔ ان باتوں کو جان لینے کے بعد یہ معلوم کرلینا مشکل نہیں ہے کہ جس زمین کے بارے میں آپ نے سوال کیا ہے اس پر بھی عشر واجب ہے۔

میونسپلٹی کے قبضہ میں جو زمینیں ہیں وہ نہ عشری ہیں نہ خراجی ہیں۔ اس لئے فقہ حنفی کے لحاظ سے بھی، اگر کوئی مسلمان اس سے لگان پر زمین حاصل کرے تو اس زمین کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا فقہ حنفی کے اعتبار سے صرف انہیں زمینوں پر عشر واجب نہیں ہوتا جو خراجی ہوں اس لئے کہ فقہ حنفی میں عشر اور خراج ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ میں بار بار فقہ حنفی کا نام اس لئے لے رہا ہوں کہ دوسرے ائمہ کے نزدیک اگر کسی مسلمان کے پاس خراجی زمین ہو تو اس پر بھی عشر واجب ہوتا ہے ان کے نزدیک عشر اور خراج دونوں ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ جولائی ۶۰ء کے شمارے میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ فقہاء کی اصطلاح میں خراجی زمین وہ ہے جس پر مسلمان حکومت نے لگان مقرر کیا ہو، غیر مسلم حکومت کے لگائے ہوئے لگان پر "خراج" کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ اس شمارے میں یہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ کہ اب ہندوستان میں شاید ہی کوئی خراجی زمین باقی ہو اس لئے یہاں کے مسلمان کاشتکاروں پر عام طور سے ان کی پیداوار پر فقہ حنفی کے لحاظ سے بھی عشر واجب ہوگا۔

شیطان نے جنت میں کس طرح بہکایا

سوال :- شیطان نے جب حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو وہ جنت سے نکال دیا گیا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آدم و حوا کو شیطان نے جنت میں داخل ہو کر کیسے بہکایا ایک صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا، میں ان کو جواب نہیں دے سکا۔ اردو کی بعض تفسیریں پڑھیں لیکن اس میں اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ مہربانی کر کے آپ اس سوال کا جواب زندگی میں شائع کریں۔

جواب :-

قرآن میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو آسمان یا جنت سے نکلنے کا حکم دیا تو اس نے

انسان کو بہکانے کی اجازت و مہلت طلب کی اور اللہ نے اس کو اس کی اجازت دیدی، قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت کے بعد اس کو فوراً جنت سے نہیں نکالا گیا بلکہ جب وہ وسوسہ اندازی کر کے حضرت آدم و حوا کو اس درخت کے قریب جانے اور پھل کھانے کی لغزش میں مبتلا کر چکا تو حضرت آدم و حوا اور شیطان سب کو بیک وقت جنت سے زمین پر اتار دیا گیا تھا۔ یہ بات معلوم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تھا اور ان کو زمین ہی پر خلافت کا کام انجام دینا تھا۔ اس وقت ان کو جنت میں ہمیشہ کے لئے نہیں بسایا گیا تھا بلکہ محض آزمائش کے لئے رکھا گیا تھا اور آزمائش ہی کے لئے انہیں ایک خاص درخت کے قریب جانے کی ممانعت کی گئی تھی اب اگر شیطان کو اس کی اجازت ہی نہ ہوتی کہ وہ انہیں بہکا سکے تو پھر آزمائش کیا ہوتی ؟ میرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ شیطان جنت سے نکالے جانے کے بعد اس میں داخل نہیں ہوا بلکہ حضرت آدم و حوا کو بہکانے کے بعد جنت سے نکالا گیا تھا۔

اگلے مفسرین نے بھی اس سوال کا جواب دیا ہے بعضوں نے یہ لکھا ہے کہ شیطان سانپ کے منہ میں داخل ہو کر جنت میں جا گھسا تھا اور بعضوں نے لکھا ہے کہ وہ جنت کے دروازے پر کھڑا تھا اور جب حضرت آدم و حوا ادھر سے گزرے تو اس نے گفتگو کر کے ان دونوں کو بہکا دیا لیکن میرے نزدیک ان دو میں سے کوئی جواب صحیح نہیں ہے۔ خود قرآن کے اشارات سے وہی جواب نکلتا ہے۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

حج بدل کے بعض مسائل

سوال :۔ مندرجہ ذیل مسائل پر رسالہ زندگی میں از روئے شریعت روشنی ڈالیں تو باعث افادۂ عام ہوگا۔

(۱) زید پر حج فرض ہے لیکن وہ اپنی زندگی میں ادا نہیں کرتا اور نہ بوقت انتقال اسکی وصیت کرتا ہے۔ بعد کو ورثہ اہتمام کر کے اس کی طرف سے حج بدل کرواتے ہیں۔ تو کیا مرحوم کے ذمہ کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔ شرعی دلیل کے ساتھ جواب دیجئے ؟

(۲) جس شخص نے خود حج نہیں کیا ہے اس لئے کہ اس پر حج فرض نہیں ہوا ہے کیا ایسا شخص حج بدل کرے تو یہ حج بدل صحیح ہو گا۔

(۳) ایسے افراد کے بارے میں حکم شریعت کیا ہے جو صاحب نصاب اور صاحب استطاعت ہونے کے باوجود محض ڈر اور خوف کی بنا پر خود حج کے لئے نہیں جاتے اور دوسرے کو اپنی طرف سے حج بدل کے لئے بھیج دیتے ہیں کیا ان کا فرض اس طرح ادا ہو جاتا ہے ؟

(۴) حج فرض ہے، اگر یہ فرض دوسروں کے ادا کرنے سے ادا ہو سکتا ہے تو پھر نماز، روزہ اور دیگر فرائض بھی دوسروں کے ادا کرنے سے ادا ہو سکیں گے اس طرح ایک کاہل، نافرض شناس متمول شخص کے لئے بڑی آسانی پیدا ہو گی، وہ اپنے زر کے زور پر بہت سے ناداروں کی خدمات حاصل کر کے سستی جنت کے مستحق ہوتے رہیں گے۔

جواب:-

(۱) جی ہاں ہر دو صورت میں حج بدل صحیح ہے، وصیت کر جانے کی صورت میں بھی اور وصیت نہ کرنے کی صورت میں بھی اگر میت کے ورثہ بطور خود حج بدل کرا دیں تو میت کا حج ادا ہو جائے گا۔ صحاح ستہ میں صحیح احادیث موجود اور مشہور ہیں جن سے حج بدل کا مسئلہ اخذ کیا گیا ہے۔ بخاری شریف کی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے :

"حجۃ الوداع میں قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میرے والد پر حج ایسی حالت میں فرض ہوا ہے کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور سواری پر بیٹھ نہیں سکتے، اگر میں ان کی طرف سے حج کروں تو کیا ان کا حج ادا ہو جائے گا ؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں" (کتاب الحج)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص خود حج ادا کرنے سے بالکل معذور ہو چکا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل کرنا صحیح ہے اور اس طرح اس کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے :

"ایک عورت حضور کے پاس آئیں اور انھوں نے کہا میری ماں وفات پا گئیں۔ اور انھوں نے حج نہیں کیا تھا کیا میں ان کی طرف سے حج کروں ؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں

ان کی طرف سے حج کرو" (کتاب الحج)

اس حدیث میں صراحت ہے کہ میت کی طرف سے بھی حج کیا جا سکتا ہے خواہ اس نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

(۲) فقہ حنفی کی رو سے اس صورت میں بھی حج بدل صحیح ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ حج بدل میں ایسے شخص کو بھیجا جائے جو اپنا فرض حج ادا کر چکا ہو۔

(۳) اس بات پر تمام ائمۂ دین کا اجماع ہے کہ حج بدل یا تو میت کی طرف سے کیا جا سکتا ہے۔ یا کسی ایسے معذور کی طرف سے جس کے عذر کے ختم ہونے کی توقع باقی نہ رہی ہو اس لئے اگر کوئی شخص خود حج کر سکتا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل صحیح نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص خود استطاعت و قدرت رکھنے کے باوجود کسی دوسرے کو حج بدل کے لئے بھیجے تو اس کا حج ادا نہ ہوگا۔

(۴) احادیث میں جس نیابت اور حج بدل کی اجازت ہے اس کا آپ کے سوال نمبر۲ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان میں اجازت صرف دو صورتوں میں دی گئی ہے ایک یہ کہ کوئی شخص اپنا فرض حج اپنی زندگی میں ادا نہ کر سکا اور وفات پا گیا دوسری یہ کہ وہ اتنا معذور ہو چکا ہو کہ بطور خود حج ادا کر سکنے کی توقع باقی نہ رہی ہو۔ اس اجازت سے اگر کوئی کاہل اور فرض ناشناس مالدار فائدہ اٹھانا چاہے تو یہ اس کی حماقت ہوگی ـــــ باقی رہی یہ بات کہ کونسی عبادت نیابۃً ادا ہو سکتی ہے اور کونسی ادا نہیں ہو سکتی یہ ایک طویل الذیل اور اختلافی مسئلہ ہے اس مختصر جواب میں اس پر گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔

عشر کے بارے میں چند سوالات

خط: ـ (۱) کیا ہندوستان کے کسانوں پر پیداوار کی زکوٰۃ نکالنا فرض ہے جبکہ حکومت ان سے خراج وصول کرتی ہے (۲) عشر، زمین کو آباد کرنے کا خرچ منہا کر دیا جائے۔ یا خرچ نکالے بغیر دیا جائے (۳) کیا سونا اور چاندی کی طرح اس میں بھی صاحب نصاب ہونے کی شرط ہے یا اس کا کوئی نصاب نہیں ہے امید ہے کہ آپ مفصل جواب دینگے نصاب کے سلسلے میں اگر مختلف مسلک ہوں تو ان کا بھی ذکر کیجئے۔

جواب :-
(۱) ہندوستان میں بھی مسلمانوں پر زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ نکالنا فرض ہے، حکومت کو ٹیکس ادا کرنے کی وجہ سے عشر ساقط نہیں ہوتا اور نہ موجودہ حکومت کے ٹیکس کو خراج کہنا صحیح ہے اس مسئلے پر میں نے زندگی جولائی ۱۹۶۵ء کے شمارے میں مفصل لکھا ہے آپ چاہیں تو ۸۰ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر یہ شمارہ دفتر زندگی سے منگوا سکتے ہیں (۲) عشر نکالنے میں آبادکاری کا خرچ الگ نہیں کیا جائے گا پوری پیداوار کی زکوٰۃ خرچ الگ کئے بغیر نکالنا ہوگی۔ اس مسئلے پر بھی میں نے زندگی مارچ ۱۹۶۶ء میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ (۳) زمین کی پیداوار میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کوئی نصاب نہیں ہے البتہ دوسرے ائمہ کے نزدیک اس میں بھی نصاب ہے۔ راقم الحروف اسی دوسرے مسلک کو ترجیح دیتا ہے۔ اس مسئلے پر بھی زندگی جنوری ۱۹۶۶ء اور مئی ۱۹۶۷ء میں لکھا گیا ہے۔

خطبۂ جمعہ کے وقت سلام

خط :- ہمارے یہاں کے امام صاحب کا معمول یہ ہے کہ وہ جب خطبۂ جمعہ کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو السلام علیکم کہتے ہیں۔ کیا اس موقع پر سلام کرنا مستحب ہے؟ واضح رہے کہ میں حنفی مسلک کا ماننے والا ہوں

جواب :-
فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں لکھا ہے کہ امام جب خطبۂ جمعہ کے لئے اپنے حجرے سے نکلے تو اس وقت سے نماز جمعہ تک اس کے لئے سلام نہ کرنا سنت ہے لیکن اس میں اس کی کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے۔ لوگ اگر سنتوں میں مشغول نہ ہوں تو سلام کرنے میں مجھے کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ بہرحال اس موقع پر سلام کرنا مستحب نہیں ہے۔

مہر کا استحقاق اور نان و نفقہ

سوال :- ہندہ سے زید کو شادی کئے ہوئے تقریباً سولہ سال گزرے۔ ہندہ کے بطن سے

اس کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں بقید حیات ہیں زید اپنی بیوی کی حرکتوں سے ہمیشہ نالاں رہا ہے۔ وہ بہت فضول خرچ ہے۔ بغیر اجازت لوگوں سے قرض لیتی رہی ہے اور گھر کا سامان فروخت کرتی رہی ہے حالانکہ زید سرکاری ملازم ہے اور وہ اپنی بیوی کو خرچ کی تکلیف نہیں دیتا۔ برابر جھگڑا ہوتا رہا ہے اور لوگ صلح صفائی کراتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ زید کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر بھی نکلتی رہی ہے اور زید اس کو برابر منع کرتا رہا ہے اب آخری بات یہ ہے کہ وہ اپنے شیرخوار بچے کو بھی چھوڑ کر بلا اجازت اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے اور اس کو سات مہینے ہو چکے ہیں۔ اس صورت حال میں بتایئے کہ ہندہ کیا پورے مہر کی مستحق ہے اور کیا اس کا نان ونفقہ بھی اس کے شوہر پر واجب ہے؟

جواب:۔

(۱) زید کی بیوی پورے مہر کی مستحق ہے، مہر کا مسئلہ یہ ہے کہ نکاح کے بعد اگر خلوت صحیحہ ہو گئی ہو تو ایک ہی خلوت کے بعد شوہر پر پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور یہاں تو وہ کئی بچوں کی ماں ہے اس کے پورے مہر کے استحقاق میں کیا شبہ ہے۔

(۲) جب سے وہ شوہر کے گھر سے بلا اجازت چلی گئی ہے اس کا نان نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہے۔ نان نفقے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب بیوی، شوہر کے پاس رہے یا اس کی اجازت سے کسی اور جگہ رہے، اگر بیوی، شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو یا اس کی اجازت کے بغیر کسی دوسری جگہ قیام کرے تو اس کا نان نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوتا۔

کاغذی وجود

پناجی - ۱۸ر جولائی - گوا کے وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا ہے کہ ایک پل کے پراسرار طور پر لاپتہ ہونے کی تحقیقات کی جائے گی - پل کے نقشے وغیرہ سرکاری ریکارڈ میں موجود ہیں اور یہ بات بھی فائل میں درج ہے کہ سرکاری افسروں نے پل کا معائنہ کیا ہے اور اس کو آمد و رفت کے لیے کھول دیا ہے لیکن جس جگہ یہ پل بنا تھا وہاں اس کا کوئی وجود نہیں ہے - (ایک خبر)

اس خبر سے پہلے ایک پرندے کے بارے میں معلوم تھا کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے - اس پرندے کا نام عنقا ہے - اس کا مصرف صرف یہ ہے کہ غیر موجود چیزوں کو اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے - غالب نے کہا ہے -

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اس خبر سے یہ سبق ملا کہ وجود کی ایک مستقل قسم کاغذی وجود ہے - مادی وجود، روحانی وجود، اخلاقی وجود، ذہنی وجود اور خارجی وجود کے ساتھ اب "کاغذی وجود" کا اضافہ کر لینا چاہیے - اس کاغذی وجود کی بہت سی مثالیں جاننے کی خواہش ہو تو اس کے لیے بھارت کے دستور کو صرف ایک بار پڑھ لینا کافی شافی ہوگا - نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

خاندانی منصوبہ بندی

(شیطان خوشی سے ناچ رہا ہوگا)

نئی دہلی - ۱۲ر اگست حکومت مہاراشٹر کا ایک حکم نامہ جو یوم آزادی سے عملاً نافذ ہو جائے گا - خاندانی منصوبہ بندی کے لیے سخت اور مضبوط پالیسی کا آئینہ دار ہوگا - وزرا، نائب وزرا، سرکاری افسران اور حکومت کے تمام ذمہ دار بھی اس کے تحت آنے سے نہ بچ سکیں گے - اس حکم نامہ کے تحت اگر ان کے یہاں بھی تین بچوں سے زیادہ ہیں تو وہ بھی مفت طبی سہولت کے مستحق نہیں رہیں گے - یہ قانون سب پر لاگو

اور اگر مہاراشٹر کے لوگوں نے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کیا اور حکم نامہ کے مطابق بچوں کی پیدائش محدود نہ کی تو انہیں سرکاری اسپتالوں سے طبی سہولتیں نہیں ملیں گی جن افراد کے یہاں تین سے زیادہ بچے پہلے ہی سے ہیں ان پر یہ حکم اس وقت نافذ ہوگا جب اس کے بعد ان کے یہاں مزید بچے پیدا ہوں گے سیاسی مصیبت زدگان، دفاعی ملازمتوں سے متعلق افراد اور دوسرے وہ لوگ جو تعلیمی فیس کی معافی کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اور جن کے بچوں کو بعض صورتوں میں درس کی کتابیں بھی مفت مہیا کی جاتی ہیں وہ بھی اس حکم کے تحت خلاف ورزی کی صورت میں اکثر سہولتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ سرکاری ملازمین وغیرہ پر، کوارٹروں کے الاٹمنٹ، قرض اور مختلف امدادوں کو بھی یہ حکم نامہ محیط ہے۔

شاید اسی طرح کا ایک حکم نامہ میسور کی حکومت کا بھی ہے — ہندوستان کی مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں نے عوام کو خاندانی منصوبہ بندی کی طرف راغب کرنے کے لیے ایک عرصہ تک طرح طرح کے سبز باغ دکھائے اور قسم قسم کے پروپیگنڈے پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں اور کر رہی ہیں یہاں تک کہ سرکاری مولویوں سے فتوے حاصل کر کے انہیں بھی خوب پھیلایا لیکن اس سرگرمی اور بے دریغ اخراجات کے باوجود زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس لیے اب مہاراشٹر کی حکومت نے جبر و تشدد کا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کرنا جرم قرار دیا جا رہا ہے جس کی سزا کتنی ہوگی۔ اس حکم نامے کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ سرکاری ملازمین مفت طبی سہولت کے مستحق باقی نہیں رہیں گے۔

۲۔ کوارٹروں کے الاٹمنٹ میں بھی یہ دیکھا جائے گا کہ کون سرکاری ملازم اس پر عمل کر رہا ہے اور کون عمل نہیں کر رہا ہے جس کے گھر میں چوتھے بچے کا "حادثہ" پیش آگیا ہوگا وہ کوارٹر سے محروم کر دیا جائے گا یا کم سے کم اس کو پیچھے ڈال دیا جائے گا۔

۳۔ قرض اور مختلف قسم کی دوسری امدادوں میں بھی خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے نہ کرنے کے لحاظ سے فیصلہ ہوگا۔

۴۔ جن ملازمین کے بچے تعلیمی فیس کی معافی یا دوسری قسم کی سہولتوں کے مستحق سمجھے جاتے ہیں وہ اپنے والدین کے اس جرم کی پاداش میں تعلیم سے محروم ہو سکتے ہیں کہ تین کے علاوہ ان کے چوتھے بھائی یا بہن کو وہ عالم وجود میں کیوں لائے۔

۵۔ مہاراشٹر کے عوام نے اگر اس حکم کی خلاف ورزی کی تو ان کو سرکاری اسپتالوں سے طبی سہولت نہیں ملے گی

۶۔ سیاسی مصیبت زدگان بھی اس حکم نامے کی زد میں ہیں اگر انھوں نے تین سے زیادہ بچے پیدا کیے تو ان کے بچے تعلیمی فیس کی معافی اور دوسری سہولتوں کے مستحق نہیں رہیں گے۔

یہ حکم نامہ اس وقت سامنے آیا ہے جب پاپائے روم نے بھی خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف اپنا فتویٰ شائع کردیا ہے اور دنیا بھر کے ۵۵ کروڑ کیتھولک عیسائی اس فتوے کے پابند کیے جاچکے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا مذہبی پروپیگنڈے میں ناکام ہونے کے بعد اب اس منصوبے پر عمل کرانے کے لیے جبر و تشدد کی راہ اختیار کی جارہی ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوں گی ہم اس وقت ان پر اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جب شیطان نے مالتھس کے دماغ میں ضبط ولادت کا کیڑا داخل کیا تھا تو شاید اسے بھی اس دشمن انسانیت خیال کے اس قدر فروغ پانے کی توقع نہ ہوگی اور وہ یہ حکم نامہ پڑھ کر خوشی سے ناچ رہا ہوگا۔ مدیر

بقیہ صفحہ ۶۳) ہوتا ہے۔ وہاں کے طلبہ نے اپنے جامعہ ہی کے نام سے زیر تبصرہ اصلاحی، ادبی اور علمی مجلہ شائع کیا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ اردو، عربی اور انگریزی۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ طلبہ اپنے جامعہ میں قلمی ماہنامے اردو میں "تنویر" اور عربی میں "الربیع" مرتب کرتے ہیں۔ انہیں ماہناموں کے مضامین کا انتخاب سالنامہ "دارالسلام" کے نام سے طبع کرا کر شائع کیا گیا ہے اور یہ زیر تبصرہ سالنامہ، دوسرا سالنامہ ہے۔ اس سالنامے میں جو منتخب مضامین شائع کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے اساتذہ نے طلبہ میں مضمون نویسی اور مقالہ نگاری کا اچھا ذوق پیدا کیا ہے۔ اردو، عربی اور انگریزی کے سہ لسانی حصوں کے سبھی مضامین پڑھنے کے لائق ہیں اور لکھنے والے ہر طرح، حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

ترکی اُردو لغت مرتبہ محمد صابر استاد تاریخ اسلام و زبان ترکی کراچی یونیورسٹی صفحات ۵۵۰، قیمت تینتیس ۳۳ روپیہ۔ ناشر:۔ لائبریری پروموشن۔ بیورو بہار کالونی۔ کراچی ۲۔ پاکستان

جناب محمد صابر صاحب، پی ایچ ڈی (ترکیات، استنبول) کی ایک کتاب "ترکان عثمانی" پر چند مہینے ہوئے زندگی میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اب ٹائپ میں چھپی ہوئی ان کی یہ ضخیم تصنیف تبصرے کے لیے آئی ہے۔ موصوف بڑی محنت سے ترکوں کی تاریخ اور زبان ترکی پر کام کر رہے ہیں، ان کی یہ محنت ہم سب کے لیے قابل قدر ہے۔ اس کتاب پر ایک سرسری نظر بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے کتنی جاں کاہی و عرق ریزی سے اسے تیار کیا ہے۔ کراچی کا ترقی اردو بورڈ بھی لائق مبارک باد ہے کہ اس کے اشتراک اور مالی معاونت سے یہ ضخیم کتاب شائع ہوئی جس نے اردو زبان کے ذخیرے میں ایک اچھا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرکے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مصنف صرف ڈگری کے پی۔ ایچ ڈی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے ترکی زبان میں مہارت حاصل کی ہے۔ کتاب شروع کرنے سے پہلے قاری کو متعدد ممتاز اور نمایاں اشخاص کے تبریکی ہدیے ملتے ہیں جو انھوں نے فاضل مصنف کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ ان میں پاکستان میں ترکی سفیر اور استنبول یونیورسٹی میں زبان کے ڈپارٹمنٹ کے صدر بھی داخل ہیں۔ یہ لغت بیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ ترکی زبان سے متعلق شاید کوئی گوشہ نہیں ہے جو اس کتاب سے چھوٹ گیا ہو۔ ترکی زبان سیکھنے والے طلبہ کے لیے یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جس سے انہیں بڑی مدد ملے گی۔ طلبہ کے علاوہ کوئی شخص بھی جو ترکی زبان سے دلچسپی رکھتا اور اردو جانتا ہو وہ اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ کتاب ہر اردو لائبریری کی زینت بننے کے لائق ہے۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستان میں ترکی زبان سکھانے کے لیے کیا انتظامات کیے گئے ہیں لیکن یہ جان کر افسوس بھی ہوا کہ جمہوریہ ترکیہ میں اردو زبان و ادب کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ یہ ایک

مستقل تکلیف دہ صورت حال ہے کہ ہند و پاک کے مسلمان، اسلامی ملکوں سے جتنی دلچسپی لیتے ہیں ان ملکوں کی حکومتیں اس کا خاطر خواہ جواب نہیں دیتیں۔ معاملہ کچھ یک طرفہ سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کتاب میں ترکوں کے ملی و قومی ترانہ آزادی کے ایک حصے کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ ترانہ ترکی شاعر محمد عاکف نے لکھا تھا۔ ہم وہ ترجمہ ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

"ڈرکیسا! یہ شفق رنگ فضاؤں میں تیرنے، چمکنے اور لہرانے والا پرچم (آل سنجاق) اس وقت تک شعلہ سرخ کی طرح جلتا اور چمکتا رہے گا جب تک وطن عزیز کے سب سے آخری خاندان کا چراغ حیات دگل ہو جائے۔

قوم کی آنکھوں کا تارا ہے۔ یہ ستارہ روشن ہے اور روشن رہے گا — یہ ہماری اور ہماری قوم کا سرمایۂ حیات ہے — ہم ازل سے آزاد رہے ہیں اور آزاد ہی رہیں گے — وہ کون جنونی ہے جو ہمیں زنجیروں میں جکڑنے کی جرات کرے گا۔

ہم سیل رواں سے زیادہ تند رو ہیں اور ہر بند کو توڑ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ ہم سر بفلک پہاڑوں کو چیر کر اور فضائے بسیط کی وسعتوں میں پھیلنا جانتے ہیں — اے معبود حقیقی! ہم اپنی روح کی گہرائیوں سے تیری بارگاہ عالی میں یہ التجا کرتے ہیں کہ ہماری عبادت گاہوں پر اجنبیوں کو دست رس نہ ملنے پائے اور یہ اذانیں جو شہادت دین کی بنیاد ہیں تا ابد ہمارے ملک کے طول و عرض میں گونجتی رہیں۔"

چراغ راہ شرق اوسط نمبر

صفحات ۱۹۶ قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر چراغ راہ یوسف منزل ہرمزجی اسٹریٹ۔ کراچی مغربی پاکستان۔

ادارۂ معارف اسلامی کراچی کے ترجمان چراغ راہ کا یہ خاص نمبر جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے۔ جون ۱۹۶۷ء کے المیہ کی یک سالہ المناک روداد۔ ابتدا میں جناب خورشید احمد صاحب کا ۴۰ صفحات کا پر حاصل افتتاحیہ ہے شرق اوسط ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۸ء تک "کے عنوان سے انھوں نے مسئلے کے تقریباً ہر پہلو پر گفتگو کی ہے۔ اس کو پڑھ کر شرق اوسط کی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور مسئلے کے حل کی راہ بھی دکھائی دینے لگتی ہے۔ مدیر چراغ راہ نے عبد الرحمٰن خلیفہ مراقب عام اخوان المسلمین اردن سے جو انٹرویو لیا تھا وہ بھی شریک اشاعت ہے۔ جناب چودھری غلام محمد امیر جماعت اسلامی کراچی کا ایک قیمتی اور معلومات افزا مقالہ بھی اس نمبر میں ہے۔ جناب قیصر قصری

کا ایک افسانہ " واپسی " شریک اشاعت ہے ۔ ۱۹۴۸ء کے " جہاد فلسطین اور اخوان " کی داستان بھی اس اشاعت خاص میں دہرائی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ بھی قیمتی مضامین شامل ہیں ۔ اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست اور عرب حکومتوں کے حالات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ اس نمبر میں سنجیدہ اور لائق مطالعہ چیزیں جمع کی گئی ہیں اور اس طرح یہ نمبر وہاں کے حالات کو سمجھنے کے لیے ایک قابل قدر دستاویز بن گیا ہے ۔

مقامِ صحابہؓ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی منتخب تحریروں کا مجموعہ مرتبہ عاصم نعمانی ۔ صفحات ۲۷ قیمت : ۶۰ پیسے ۔ ناشر ۔ مکتبۂ آئین ، نسیم مارکیٹ ۔ ریلوے روڈ ۔ لاہور

اس پمفلٹ کے مرتب اور ناشر دونوں ہی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مولانا مودودی مدظلہ کی ان تحریروں کا مجموعہ مرتب اور شائع کیا جن سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بلند مقام سامنے آجاتا ہے ۔

یہ پمفلٹ تین ہزار چھپا تھا اور اب اس کا دوسرا اڈیشن بھی چھپ گیا ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کے خلاف بدترین پروپگنڈے کے باوجود لوگ ان کے اصل موقف کو سمجھنا چاہتے ہیں اور اس پمفلٹ کا اصل مقصود بھی یہی ہے کہ ناواقفوں کو مولانا کا اصل موقف بتایا جائے ۔ باقی رہے وہ لوگ جو مختلف محرکات کے تحت مولانا پر توہین صحابہ کا الزام لگا رہے ہیں ، ان کو سمجھانا کس کے بس میں ہے ۔ اس طرح کے سو مجموعے بھی شائع کیے جائیں تو نہ ان کی زبان بند ہوگی اور نہ وہ خامہ فرسائی سے باز آئیں گے ۔ ان شاءاللہ یہ پمفلٹ بہت سے ناواقف لوگوں کی غلط فہمی دور کرے گا ۔

نزولِ قرآن مجید ، شمارۂ خاص مدیر مجلہ خاتون پاکستان ۔ صفحات ۱۸۴ ۔ ہدیہ :۔ دو روپیہ پچاس پیسے ملنے کا پتہ :۔ دفتر خاتون پاکستان ، ۵ گارڈن کراچی

ادارہ خاتون پاکستان نے ضخیم نمبر نکالنے میں اچھی شہرت حاصل کی ہے ۔ دینی موضوعات پر یہ ادارہ مفید نمبر شائع کرتا رہتا ہے ۔ نزول قرآن کی سالگرہ منانے کے موقع پر اس نے یہ ضخیم نمبر شائع کیا تھا اور کئی ماہ پہلے یہ ہمارے پاس آیا تھا لیکن تبصرے کا موقع نہیں نکل سکا ۔ اس میں جو مضامین ہیں وہ ہنگامی نوعیت کے نہیں ہیں اس لیے اس پر کسی وقت بھی تبصرہ پرانا نہیں ہے ۔ علماء اور ممتاز اہل قلم نے قرآن کے مختلف پہلوؤں پر مقالے لکھے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں ۔ فاضل مدیر نے ان میں سے انتخاب کرکے اس نمبر میں جمع کیے ہیں ۔ مولانا ابوالکلام علاؔ

حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ مولانا ابو سلیم محمد عبد الحی اور دوسرے ممتاز اہل قلم کے مقالے اس میں موجود ہیں اور سب پڑھنے کے لائق ہیں۔ حصہ نظم میں شیخ سعدی شیرازی، سید وصی احمد بلگرامی۔ علامہ تمنا عمادی۔ مولانا ماہر القادری اور دوسرے شعراء کے منظومات شریک اشاعت ہیں۔ (ع۔ ق)

حضرت اکبر کے روز و شب

محمد رحیم دہلوی۔ صفحات ۲۷۶، مجلد گرد پوش کے ساتھ، قیمت: پانچ روپیے
پتہ: مکتبہ رضیہ جناح ہاؤس لارنس روڈ کراچی ۳

یہ کتاب پہلے اکبر کا روزنامچہ کے نام سے ایک رسالے میں بالاقساط چھپی تھی اور جب یہ کتابی شکل میں شائع ہوئی تو اس کا نام حضرت اکبر کے روز و شب رکھا گیا۔ اس کے مرتب جناب محمد رحیم دہلوی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ بابائے اردو جناب عبد الحق مرحوم نے تقریظ میں لکھا تھا:۔

حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام اور زندگی کے حالات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر محمد عبد الرحیم دہلوی نے اس معاملہ میں بڑی جدت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اکبر کے خطوط اور تحریروں سے تاریخ وسنہ وار ان کے حالات وخیالات اس خوش اسلوبی سے جمع کر دیے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا اکبر اپنا روزنامچہ خود لکھا کرتے تھے۔ لائق مرتب نے اپنی طرف سے ایک لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔ البتہ کہیں کہیں کسی نام اور واقعہ کی توضیح یا تشریح حاشیے میں کر دی ہے۔

مرتب کی جدت کی وجہ سے یہ روزنامچہ بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ حضرت اکبر کے دل و دماغ اور جسم و روح تو مسلمان تھے ہی ان کی شاعری بھی مسلمان تھی اور ان کے مکاتیب میں بھی ان کے اسلام و ایمان کی جھلکیاں موجود ہیں اصل کتاب سے پہلے مرتب نے ۵۵ صفحات کا پیش لفظ لکھا ہے اور ان کے خطوط کی عبارتوں سے ان کے حالات و خیالات اور طنز و مزاح کا ایک مرقع تیار کر دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی گئی ہوگی اور پڑھی جاتی رہے گی۔

دار السلام

ناشرین: طلبہ جامعہ عربیہ دار السلام عمر آباد۔ ضلع شمالی آرکاٹ (مدراس)

مدراس کا جامعہ عربیہ دار السلام عربی کا کوئی غیر معروف مدرسہ نہیں بلکہ علوم دینیہ کی ایک ممتاز و معروف درس گاہ ہے۔ بجا طور پر اس کا شمار ہندوستان کے عربی مدارس کی صف اول میں (باقی صفحہ ۵۹ پر)

(بقیہ صفحہ ۳۷) اور ان کے ساتھ دعائیں اور التجائیں خود بھوت پریت اور خود بیماری سے بھی کی جاتی ہیں۔ اس سے اس زمانے کے طرز عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان جادوؤں میں خود جادو کا اثر ہے اور ان کے ذریعہ التجا کم کی جاتی ہے اور دیوی دیوتا یا مخفی طاقتوں کو مدد کے لئے مجبور زیادہ کیا جاتا ہے۔ "تلفظ کی صحت اور رسم کی ادائگی سب سے اہم ہے۔ اور اسی میں ساری تاثیر ہے۔ اتھرو وید میں جنگ میں فتح مباحثے میں کامیابی، دولت کے حصول، گھر میں خوش حالی، کسی لڑکے، لڑکی کی محبت حاصل کرنے، جوئے میں کامیابی، بیماری اور پاگل پن سے نجات حاصل کرنے کے لئے مدد مانگتے ہیں. اسی طرح دشمن، چڑیل، جانور اور کیڑے مکوڑوں کے خلاف یہ منتر ہیں۔ ورن، برہمن، بادشاہ، گائے، قربانی کے بیل اور بکری کی شان میں حمد یہ نظمیں بھی ہیں۔ اتھرو وید سے قدیم زمانے کا طرز معاشرت ان کا سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر اور ان کے خانگی حالات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۴) گھوڑے اپنے مجازی مالک کی وفاداری میں وہ سب کچھ کر گذرتے ہیں جس کا ایک سنسنی خیز نقشہ مندرجہ بالا آیات میں کھینچا گیا ہے۔ لیکن عقل و دانش اور فہم و شعور کا مدعی انسان اپنے مالک حقیقی کی وفاداری اور اس کی اطاعت و فرماں برداری میں کیا کچھ کرتا ہے۔ اگر عالم انسانی کا جائزہ لیا جائے تو قرآن کریم کی یہ آیت انسانیت کی ضمیر کی آواز بن کر بول اٹھتی ہے کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ — بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے

کوئی شخص ایک مومنانہ سیرت اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف تو سیرت و کردار پر اثر انداز ہونے والے خارجی عوامل یعنی غلط ماحول اور بگڑے ہوئے معاشرے کے برے اور اخلاق سوز اثرات سے اپنے دامن کو بچائے رکھے اور دوسری طرف داخلی طور پر عام انسانی کمزوریوں کو بھی پیش نظر رکھے جو غیر محسوس طریقے سے انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اسے ہلاکت کی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔ اگر کوئی انسان پوری بصیرت اور مکمل شعور کے ساتھ ان کمزوریوں کو محسوس کرکے بالارادہ ان پر قابو پانے کی کوشش نہیں کرتا ہے تو اس کا حال بالکل اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو تیرنا نہیں جانتا اور اسے اٹھا کر طوفانی موجوں میں پھینک دیا گیا ہے۔

Monthly 'ZINDGI' Rampur, Sept. 1968, Regd. No. L--688

اگر جلد ھی ھندی میں دینی لٹریچر تیار نہیں کیا گیا

تو

نئی نسل دین سے ناواقف رہ جائیگی

اور

غیر مسلموں تک دین کی دعوت نہ پہونچ سکیگی

اِسی مقصد کو سامنے رکھکر جماعت اِسلامی ھند نے

ھفتہ روزہ کانتی دھلی کا اجراء کیا ھے

اِس کے علاوہ

کانتی کا ماھانہ خصوصی ایڈیشن بھی نکلتا رھیگا

اگر آپ

ھندی نہیں جانتے صرف اُردو جانتے ھیں تو بھی اِس کام کی اھمیت سے واقف ھونگے

آپ اپنے حلقوں میں

- کانتی کی ایجنسیاں قائم کرائیں—
- زیادہ سے زیادہ خریدار بنا کر اُن سے چندے بھجوائیں—
- اپنے آپ اور دوسرے صاحب استطاعت لوگوں سے اعانتی رقوم بھجوائیں۔

شرائط ایجنسی کے لئے الگ لکھیں—

منیجر ھفتہ روزہ کانتی

۱۵۲۵ سوئی والان - دھلی - ٦

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اکتوبر ۷۹ء

اقامتِ دین کا داعی

سالانہ آٹھ روپے

فی پرچہ ۸۰ پیسے

ماہنامہ

زندگی رامپور

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/-
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-
فی پرچہ ستر پیسے (۷۰)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۲۴ شلنگ

جلد: ۴۱ | رجب المرجب ۱۳۸۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۸ء | شمارہ: ۴

اشارات

مقالات

تراجم و اقتباسات

رسائل و مسائل

اس دائرے میں ○ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے ایک مہینے میں چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو ان شاء اللہ اگلا پرچہ وی پی سے حاضر ہوگا امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔ منیجر ماہنامہ "زندگی" رام پور

مالک جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ افضل حسین۔ مطبع۔ روہیلا پرنٹرس خاص روڈ۔ رام پور یوپی
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی۔ رام پور یوپی

اشادات :— ۱

اسپوٹنک میں نماز اور روزہ

(سید احمد قادری)

تمہید

سائنٹفک ترقیوں نے شرعی اعتبار سے بعض مسائل پیش کر دیے ہیں منجملہ ان کے وہ مسائل ہیں جو ذرائع حمل و نقل کی تیزیِ رفتار کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔

طیاروں کی تیز رفتاری بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔۔۔ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرنے والے ہوائی جہاز اب بکثرت ہیں اور وہ دن دور نہیں جبکہ یہ طیارے عجائب خانہ کی زینت ہو جائیں گے اور گردش زمین کے مساوی رفتار سے پرواز کرنے والے طیارے ان کی جگہ لیں گے۔ موجودہ سرعت رفتار سے بھی بعض مسائل صوم و صلوٰۃ سے متعلق پیدا ہوئے ہیں اور متوقع تیز رفتاری نے تو اس قسم کے مسائل اور واضح کر دیے ہیں۔

اس کے علاوہ برسوں سے اہل یورپ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ دوسرے سیاروں تک پہنچ جائیں۔ سر دست قمر پر اترنے کی جان توڑ کوشش ہو رہی ہے اس لیے کہ زمین کے بہ نسبت دوسرے سیاروں کے قریب تر ہے اور ہیئت دانوں کی تحقیق کے مطابق زمین ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو ماضی بعید کے کسی نامعلوم حصہ میں زمین سے جدا ہو گیا ہے۔

قمر پر راکٹ اتارنے اور وہاں اس سے کام لینے میں کامیابی ہو چکی ہے امید ہے کہ عنقریب یہ خبر آ جائے گی کہ کرۂ قمر پر انسانی قوم پہنچ گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے سیارے کی باری ہو۔

خلا میں گردش کرنے والے حیرت انگیز تیز رفتار اسپوتنک، یا بالفاظ دیگر مخصوص قسم کے طیارے اب تنہا نہیں جاتے ہیں بلکہ انسانوں کو بھی اپنے دوش پر سوار کرکے لے جاتے ہیں۔ سفر کرنے والوں کے لیے دین و مذہب کی کوئی قید نہیں، مسلمان بھی اس خلائی سفر سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔ چاند پر جانے والے مسافر کو بھی اس عالم خلاء سے گزرنا لازم ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر جسم کشش ارض کے حدود سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے اسحاق نیوٹن کے اصول کے مطابق اس پر ایک کیفیت بے وزنی کی بھی طاری ہوتی ہے۔ کرۂ ارض کے زمانے کے اعتبار سے یہ سفر کئی کئی دن جاری رہتا ہے۔ اس زمان و مکان اور مسافر کی حالت کے اعتبار سے ایک مسلمان کے سامنے متعدد مسائل آجاتے ہیں

سوالات

۱۔ جب ہوائی جہاز پرواز کر رہا ہو تو اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ ہوائی جہازوں کی تیز رفتاری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ چند گھنٹوں میں ہزاروں میل کی مسافت طے ہو جاتی ہے اور آفتاب کے طلوع و غروب میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت صوم و افطار اور اوقات صلوٰۃ کا تعین کس مقام کے طلوع و غروب کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

(الف) جہاں سے سفر کی ابتدا ہوتی ہے یا

(ب) جہاں سفر ختم ہوگا۔ یا

(ج) مسافت شمسی تغیرات کے اعتبار سے؟

مندرجہ ذیل مثال اس اصولی مسئلہ کی وضاحت کرتی ہے۔

(الف) اگر رمضان میں لندن سے کلکتہ کے لیے صبح ۹ بجے پرواز کریں تو کلکتہ ۵ بجے شام کو پہنچ جائیں گے۔ یہ وقت غروب آفتاب کا ہوگا اور روزہ صرف ۸ گھنٹے کا۔

(ب) اس کے برعکس اگر کلکتہ سے لندن کے لیے اڑیں اور سات گھنٹہ کی پرواز کے بعد لندن پہنچیں تو کلکتہ میں ۱۰ بجے ہوں گے اور لندن میں ۴ بجے کا وقت ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر وہاں موسم بہار ہو اور غروب ۶ بجے شام کو ہو اور کلکتہ میں طلوع صبح صادق ہو تو روزہ میں مزید ۴ گھنٹے کا اضافہ ہو جائے گا۔

(نوٹ) یہ دونوں مثالیں محض وضاحت کے لیے تحریر کی گئی ہیں ورنہ علمائے فقہ پر ظاہر ہے کہ ان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ دوسرا مسئلہ (ب) اس لحاظ سے البتہ قابل غور ہے کہ اس طرح صائم پر مشقت بڑھ جاتی ہے۔ کیا اس میں تخفیف کی کوئی شرعی شکل نکل سکتی ہے۔

۳۔ خط استوا پر محیط ارض سب سے زیادہ طویل ہے۔ ہر ہزار میل پر طلوع و غروب آفتاب میں ایک گھنٹہ کا فرق ہو جاتا ہے۔ زمین کا محیط ۲۴ ہزار میل ہے اس لیے اگر کوئی شخص ہوائی جہاز پر مشرق سے مغرب کی جانب ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرے تو اس کے لیے آفتاب کبھی غروب نہ ہوگا ایسی حالت میں (الف) نماز کس طرح پڑھے گا؟ اس لیے کہ اوقات میں اختلاف نہ ہوگا۔ نیز اگر اس نے صبح کو طلوع آفتاب کے بعد پرواز کی ہے تو اس کے لیے کسی نماز کا وقت نہ آئے گا، اس لیے کہ وہ آفتاب کے برابر حرکت کر رہا ہے۔

(ب) صوم کی کیا صورت ہوگی؟ اس لیے کہ افطار کا وقت ہی نہ آئے گا۔

۴۔ اگر طیارے کی رفتار زمین کی رفتار سے تیز ہو جائے تو مسافر راستہ ہی میں مشرق کی طرف غروب شمس کا مشاہدہ کرے گا اور اگر مغرب سے مشرق کی جانب جائیں تو آفتاب مغرب سے طلوع ہوتا ہوا دکھائی دے گا۔ سوال یہ ہے کہ:۔

(الف) مشرق کی طرف غروب آفتاب اور مغرب سے طلوع آفتاب کو طلوع و غروب شرعی سمجھا جائے گا یا نہیں؟

(ب) نماز کے اوقات کا تعین اسی طرح صوم و صلوٰۃ کا تعین اس کے لحاظ سے ہوگا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس اعتبار سے ہوگا؟

۵۔ اسپوتنک پر خلائی سفر کرتے ہوئے تین گھنٹہ میں آٹھ مرتبہ طلوع و غروب شمس کا مشاہدہ ہوتا ہے ایسی صورت میں (الف) شرعاً کیا یہ آٹھ دن تصور کیے جائیں گے؟ اور ہر طلوع و غروب اور اس کے مابین اوقات میں نمازیں اور روزے حسب دستور ادا کیے جائیں گے یا نہیں؟

(ب) یا کرۂ ارض کے لحاظ سے؟ چونکہ یہ وقت صرف تین گھنٹہ کا ہے اس لیے طلوع و غروب کو غیر معتبر قرار دے کر اسی وقت کا لحاظ کیا جائے گا جو زمین کے اعتبار سے گزرے مثلاً تین گھنٹہ؟

۶۔ اگر یہ تین گھنٹہ آٹھ دن تصور کیے جائیں گے تو مسافر کو تین گھنٹے کے اندر چالیس وقت کی نماز

ادا کرنا پڑیں گی جو عادتاً بہت دشوار ہے اور جب بھی اس قسم کے سفر کے دوران "حرج" شرعی بھی لازم آئے گا اس لیے کہ زمین سے اتنی بلندی پر پہنچنے کے بعد مختلف اسباب کی بنا پر انسان کے لیے حرکت دشوار ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ممکن ہوتی ہے اور مسافر حرکت کرتے ہیں لیکن اس دشواری کی اس قدر برداشت کہ تین گھنٹہ میں چالیس وقت کی نمازیں ادا کی جائیں۔ اگر ناممکن نہیں تو اس کے قریب ضرور ہے۔

۷۔ صورت مذکورہ میں اگر سفر ماہ رمضان میں شروع ہوا ہے اور ان تین گھنٹوں کو طلوع و غروب آفتاب کے اعتبار سے ۸ دن تصور کیا جائے تو تین گھنٹہ کے اندر مسافر کو آٹھ روزے رکھنا ہوں گے اور ہر صوم صرف ۲۲½ منٹ کا ہو گا جو بالکل غیر معتدبہ مقدار ہے۔

۸۔ اگر صوم کے حق میں اس وقت کو تین گھنٹہ ہی سمجھا جائے اور اس کے بارے میں طلوع و غروب ارضی کا لحاظ کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ سفر حالت صوم میں شروع ہوا ہے تو مسافر افطار نہ کرے اور اگر وقت افطار میں یعنی رات کو شروع ہوا ہے تو روزہ نہ رکھے۔

۹۔ جب صورت مذکورہ میں خلا کے طلوع و غروب کا اعتبار نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مسافر کے لیے شہر رمضان باقی نہیں رہا۔ ایسی حالت میں روزہ اس پر فرض بھی ہو گا یا نہیں؟ اور خلا کے سفر میں جو وقت گزارے اس کے صیام کی قضا اس پر فرض ہو گی یا نہیں؟

۱۰۔ اس مسئلے کی دوسری صورت اس طرح فرض کیجیے کہ اگر مسافر شعبان میں روانہ ہوا تھا اور اس نے خلا سے طلوع قمر کو دیکھا زمین سے نہیں دیکھا تو شہر رمضان کا وجود اس کے حق میں ہوا یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس پر صوم کیسے فرض ہو گا؟ اور اگر ہوا تو صوم و افطار کے لیے طلوع و غروب ارض کا کیوں اعتبار کیا جائے گا؟ اس طرح یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلا کا مسافر اتنی مدت تک برابر پرواز کرتا رہا کہ زمین پر شہر رمضان گزر گیا اس کے بعد واپس آیا تو اس پر قضاء صیام واجب ہو گی یا نہیں؟

۱۱۔ خلا کا مسافر اپنے جہاز پر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ واضح ہو کہ خلا میں ہوا بھی نہیں ہوتی ہے جس کے واسطے سے وضع الجبھۃ علی الارض کے مصداق کیا جا سکے۔

۱۲۔ اگر مسافر نماز پڑھے گا تو سمت قبلہ کس طرح متعین کرے گا؟ یعنی جہت ارض کو قبلہ بنائے گا یا نہیں؟ سمت قبلہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا اس پر واجب ہو گا؟ اگر یہ کوشش ممکن نہ ہو یا اس کی کامیابی نہ ہو تو جہت ارض کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

۱۳۔ اگر کوئی مسلمان کرۂ قمر پر پہنچ جائے تو نماز میں رخ کس طرح کرے گا۔ (متعلق سوال ۱۲)

۱۴۔ کرۂ قمر پر رویت ہلال ہو گی یا نہیں ایسی صورت میں شہر رمضان اس کے حق میں کس طرح موجود ہوگا؟ اور اگر نہ ہو سکا تو اس پر روزہ کیسے فرض ہوگا؟

جواب کی تمہید

یہ مسائل جو بظاہر بالکل جدید معلوم ہوتے ہیں فی الواقع جدید نہیں ہیں، صرف ان کی صورت جدید ہے۔ ان کے پیچھے جو اصل مسئلہ ہے اس پر فقہائے کرام آج سے سیکڑوں سال پہلے بحث کر کے اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق اس کا حل پیش کر چکے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات لکھنے سے پہلے ہم کتاب و سنت کے چند نصوص پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نصوص ایسے قواعد کلیہ ہیں جن پر بہت سے جزئی احکام کا دارومدار ہے۔

پہلی آیت يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ر۲۳)
اللہ تمہیں سہولت دینا چاہتا ہے وہ تمہیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

دوسری آیت لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ[1] (البقرہ ر۴۰)
اللہ کسی شخص پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمے داری کا بوجھ نہیں ڈالتا وہ جو نیکی کمائے گا اس کا اجر اسی کو ملے گا اور جو برائی کرے گا اس کا وبال بھی اسی پر پڑے گا

تیسری آیت يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا (النساء ر۵)
اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

چوتھی آیت مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ (المائدہ ر۲)
اللہ نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں تنگی میں مبتلا کرے۔

پانچویں آیت مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ (طٰہٰ ر۱)
ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم محنت و مصیبت میں پڑو۔

چھٹی آیت وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ
اور اس نے تم پر دین میں کوئی مشکل

[1] سورۂ الطلاق میں فرمایا گیا ہے:۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

مِنْ حَرَجٍ (الحج، ر۱۰) نہیں رکھی۔

یہ تمام آیتیں تقریباً ہم معنی ہیں۔ چناں چہ مفسرین اور احکام القرآن پر کتابیں لکھنے والے علماء نے ان میں سے کسی ایک آیت کی تفسیر و تشریح میں ان میں کی متعدد آیتوں کا ذکر کیا ہے۔ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا کے تحت قاضی ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں:۔

ھذا اصل عظیم فی الدین ورکن من ارکان شریعۃ المسلمین شرفنا اللہ سبحانہ علی الامم بہا ¹	یہ دین کی ایک اصل عظیم ہے اور اسلامی شریعت کا ایک رکن ہے۔ اللہ پاک نے اس کے ذریعہ دوسری امتوں پر ہمیں فضل و شرف عطا کیا ہے۔

اس آیت کے تحت ان میں کی متعدد آیتوں کا ذکر کرکے امام ابوبکر جصاص رازی تحریر فرماتے ہیں:۔

فھذا حکم مستمر فی سائر اوامر اللہ و زواجرہ ولزوم التکلیف فیہا علی ما یتسع لہ یقدر علیہ ²	یہ حکم اللہ کے تمام اوامر و نواہی میں جاری ہے اور یہ انسان پر اس کی مقدرت کے مطابق ذمہ داری ڈالتا ہے۔

یہی اصل عظیم متعدد احادیث میں بھی بیان کی گئی ہے۔ ہم چند حدیثیں ذیل میں درج کر رہے ہیں:۔

پہلی حدیث	بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ (مسند احمد)	مجھے ایک ایسی شریعت کے ساتھ بھیجا گیا ہے جو ملت حنیفی سے منشا پا اور آسان ہے۔
دوسری حدیث	ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ (بخاری کتاب الایمان)	بے شک دین آسان ہے اور جو کوئی (اپنے اوپر تشدد کرکے) اس کا مقابلہ کرے گا وہ مغلوب ہوگا۔
تیسری حدیث	ان دین اللہ یسر (مسند احمد بحوالہ فتح الباری)	بے شک، اللہ کا دین آسان ہے۔
چوتھی حدیث	ان اللہ انما اراد بھذہ الامۃ الیسر ولم یرد بھم العسر (طبرانی)	اس امت کے ساتھ اللہ نے آسانی کا ارادہ کیا ہے اس کے ساتھ سختی کا ارادہ نہیں کیا

¹ ابن العربی: احکام القرآن ج ۱ ص ۲۳۱

² الجصاص: احکام القرآن ج ۱ ص ۵۲۹

پانچویں حدیث

اذا امرتكم بشيء فأتوا منه ما استطعتم واذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه (بخاری ومسلم)

جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو اور جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے پرہیز کرو۔

اس آخری حدیث پر حافظ ابن حجر نے لمبی گفتگو کی ہے۔ میں یہاں ان کے چند جملے نقل کرتا ہوں:۔

قال النووي هذا من جوامع الكلم وقواعد الاسلام ويدخل فيه كثير من الاحكام كالصلوٰة لمن عجز عن ركن منها او شرط فيأتي بالمقدور وقال غيره فيه ان من عجز عن بعض الامور لا يسقط عنه المقدور وعبر عنه بعض الفقهاء بان الميسور لا يسقط بالمعسور كما لا يسقط ما قدر عليه من اركان الصلوٰة بالعجز عن غيره و استدل به من امر بشيء فعجز عن بعضه ففعل المقدور انه يسقط عنه ما عجز عنه

فتح الباری، جلد ۱۳
کتاب الاعتصام

نووی نے کہا، یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے اور اسلام کے قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے اس کے تحت بہت سے احکام داخل ہیں جیسے نماز اس شخص کے لیے جو اس کے کسی رکن یا شرط سے عاجز ہو تو حسب مقدور اس کو ادا کرے۔ نووی کے علاوہ دوسرے فقہاء نے کہا کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص بعض امور سے عاجز ہو جائے تو اس کی مقدرت کے مطابق اس پر عمل ساقط نہیں ہوتا۔ اسی کی بعض فقہاء نے یوں تعبیر کی ہے کہ جو کچھ آسان ہو وہ کسی مشکل کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا جیسے نماز کے وہ بعض ارکان جن پر کوئی شخص قادر ہو بعض دوسرے ارکان سے عاجز ہونے کی بنا پر ساقط نہیں ہوتے اور اس سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس کو کسی چیز کا حکم دیا گیا ہو اور وہ اس کے بعض جز سے عاجز ہو گیا ہو تو حسب مقدور اس پر عمل کر لینے سے وہ جز اس سے ساقط ہو جاتا ہے جس پر وہ عمل نہیں کر سکا۔

مرض، سفر، خوف اور بعض دوسرے حالات میں اللہ تعالیٰ نے متعدد رخصتیں عطا فرمائی ہیں۔ مثال کے طور پر حالت سفر میں نمازوں میں قصر کی رخصت یا سفر و مرض کی حالت میں رمضان کے روزے ترک کرنے کی رخصت

قرآن میں ہے :۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ (النساء۔ ر۱۵)

اور جب تم سفر اختیار کرو تو مضائقہ نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کرو۔

رمضان المبارک میں رخصت افطار کی آیت یہ ہے :۔

وَمَنْ کَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (البقرہ: ر۲۳)

اور جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں کا شمار کرکے رمضان کی قضا رکھے

ان آیات واحادیث اور ان کی تفسیر و تشریح سے بہت سے قواعد کلیہ مستنبط ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں :۔

(۱) اللہ تعالےٰ نے کسی انسان پر بھی اس کی قدرت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔

(۲) وہ اپنے کسی فرماں بردار بندے کو خواہ مخواہ ناقابل برداشت مشقت و مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا بلکہ وہ اپنے بندوں کے لیے آسانی اور سہولت کو پسند فرماتا ہے۔

(۳) اس نے جو دین عطا کیا ہے اس میں تنگی نہیں ہے بلکہ وہ آسان اور کشادہ ہے۔

(۴) مرض، سفر، خوف اور بعض دوسرے حالات میں اس نے صراحۃً خود ہی متعدد رخصتیں عطا فرمائی ہیں

(۵) عاقل و بالغ مسلمان جب تک زندہ ہے اور اس کے ہوش و حواس سلامت ہیں وہ جہاں کہیں اور جن حالات میں ہو، حسب مقدور اللہ کی پرستش، بندگی اور اطاعت کا مکلف ہے۔

(۶) اگر کسی حکم کے بعض ارکان و شرائط پر عمل نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کی وجہ سے وہ حکم ساقط نہیں ہوگا بلکہ وہ جس حد تک عمل کر سکتا ہو اس کی تعمیل ضروری ہوگی۔

ان اصول و قواعد کی روشنی میں مذکورہ بالا سوالات کے جوابات زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ تھوڑے سے غور و فکر سے ان کے تشفی بخش جوابات مل جاتے ہیں۔ اب ہم نمبروار تمام سوالات کے جوابات عرض کرتے ہیں :۔

پہلے سوال کا جواب

ہوائی جہاز پرواز کر رہا ہو تو میرے نزدیک اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔

المسلم ملتزم بحکم الاسلام مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اسلام کے حکم کا

حیث مایکون (شرح السیر الکبیر جلد ۴ صفحہ ۱۲۵) پابند ہے۔

حالت پرواز میں ادائے نماز میں شبہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ نماز کا ایک رکن سجدہ ہے اور سجدۂ صلوٰۃ کی تعریف وضع الجبھۃ علی الارض (پیشانی کو زمین پر رکھنا) سے کی جاتی ہے، فضا میں ہوائی جہاز کا تعلق زمین سے نہیں ہوتا اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پر سجدہ کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟ اس کا یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ ہوائی جہاز چونکہ حدود ارض کے اندر اڑتا ہے اور ہوا کے واسطے سے اس کا تعلق زمین سے قائم رہتا ہے۔ اس لیے اس پر سجدہ کرنا صحیح ہوگا لیکن میرے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ علماء و فقہاء نے سجدہ صلوٰۃ کی تعریف، باشندگان زمین کو سامنے رکھ کر کی ہے

ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سجدہ کرنا، سجدے کی حقیقت میں داخل نہیں ہے۔ پیشانی جس جگہ بھی ٹک سکتی ہو اس پر سجدے کا اطلاق صحیح ہوگا وہ جگہ زمین ہو یا آسمان یا خلاء و فضا۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ آسمانوں پر بے شمار فرشتے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے سجدوں پر سجدۂ عبادت کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو برگزیدہ انسان اور اللہ کے رسول ہیں، آسمان پر اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں۔ قرآن میں حضرت عیسیٰ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا	اور اللہ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا
دُمْتُ حَیًّا (مریم ۲)	ہے میں جب تک زندہ ہوں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے جسد اطہر کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں اور زندہ ہیں۔ اس لیے وہ آسمان پر بھی نماز کے مکلف ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آسمان پر ان کی نماز نماز نہیں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جب تک مسلمان زمین پر ہے، زمین پر اپنی پیشانی رکھے گا اور اگر وہ زمین پر نہیں ہے تو ہر اس مقام پر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوگا جہاں پیشانی رکھی جا سکتی ہو —— جواز کی رائے کے ساتھ میں اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہوائی جہاز کا مسافر زمین پر نماز ادا کرنے کا وقت پائے تو اس کے لیے زمین پر نماز ادا کرنا بہتر ہوگا۔ لیکن اگر کسی نماز کے قضا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو بلا کراہت وہ ہوائی جہاز پر نماز پڑھ سکتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

غیر معمولی تیز رفتار سفر کی وجہ سے صوم و افطار اور نماز کے اوقات کے تعین کا فیصلہ حالات کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا اس کے لیے کوئی ایک بات طے کر لینا مناسب نہ ہوگا۔

اس سوال کی شاں میں دوسرے مسئلہ (ب) کے سلسلے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اس غیر معمولی صورت حال میں کلکتہ کے مسافر کو اپنے روزے کی ابتدا لندن کے مطلع سے کرنی چاہیے۔ کیونکہ میرا اندازہ ہے کہ کلکتہ سے پرواز کرنے کے بعد وہ راستے میں ایسی جگہ بھی پہنچے گا جہاں ابھی صبح صادق طلوع نہ ہوئی ہوگی بلکہ رات کا کچھ حصہ باقی ہوگا۔ اب اگر اس کو کلکتہ سے روزے کا پابند کیا جائے تو ابتدائے صوم اور انتہائے صوم میں رات حائل ہو جائے گی اور ایک مزید پیچیدہ سوال اٹھ کھڑا ہوگا۔ ایسی صورت میں اس مسافر کے کلکتہ کے طلوع صبح صادق کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس طلوع صبح صادق کا اعتبار کیا جائے گا جس کے بعد رات کا کوئی حصہ حائل نہ ہو

اور اگر صورت یہ ہو کہ سفر میں رات کا کوئی حصہ حائل نہ ہوتا ہو بلکہ سفر کا بہت بڑا حصہ صبح صادق ہی کے وقت میں طے ہو رہا ہو جب بھی اس کو یہ رخصت ملنی چاہیے کہ ہوائی جہاز میں سحری کھا کر اپنے روزے کی ابتدا لندن کے وقت سے کرے۔ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کے قانون کلی سے یہاں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور اس غیر معمولی صورت حال میں ان حدیثوں سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے جن سے طلوع صبح صادق کے بعد بھی سحری کھا لینے کی اجازت نکلتی ہے۔

یہ تفصیل اس صورت میں ہے جب وہ روزہ رکھنا چاہتا ہو ورنہ اس مسافر کو اس دن روزہ نہ رکھنے کی رخصت بہ نص قرآنی حاصل ہی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب

اس سوال کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ دن رات کی پانچ نمازوں کے لیے طلوع و غروب آفتاب کے لحاظ سے پانچ اوقات کی حیثیت و نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ کہ اوقات نہ آئیں تو نمازیں ساقط ہو جائیں یا یہ کہ ان اوقات کا لحاظ کیے بغیر پانچ نمازیں ادا کرنا فرض ہوگا اور اگر فرض ہوگا تو انہیں ادا کرنے کی صورت کیا ہوگی۔ اوپر تمہید میں جو اصول و قواعد پیش کیے گئے ہیں ان سے بھی اس بنیادی مسئلے کا جواب نکل آتا ہے لیکن حسن اتفاق سے اس جزئیے کا جواب احادیث میں صراحۃً مذکور ہے اور فقہاء اس بنیادی مسئلے پر بحث بھی کر چکے اور اس کا جواب بھی دے چکے ہیں ـــــ فقہاء کے سامنے ایک مقام بلغار کا یہ مسئلہ پیش کیا گیا تھا کہ وہاں موسم گرما کی سب سے چھوٹی راتوں کے زمانے میں سورج ڈوبنے کے بعد غروب شفق سے پہلے ہی فجر طلوع ہو جاتی ہے اس طرح وہاں عشاء کا وقت آتا ہی نہیں۔ اس صورت میں وہاں کے باشندے عشاء کی نماز کے مکلف ہوں گے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں فقہائے احناف دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نماز

کے اوقات اس کے اسباب ہیں اور جب سبب موجود نہ ہوگا تو مسبب بھی وجود میں نہیں آئے گا۔ لہٰذا جہاں عشار کا وقت نہیں آئے گا جو اس کا سبب ہے وہاں کے لوگ عشار کی نماز کے مکلف نہ ہوں گے۔ دوسرے گروہ (جس کی تائید صاحب فتح القدیر نے کی ہے) کی رائے یہ ہے کہ وہاں کے لوگ بھی نماز عشار کے مکلف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وقت، نماز کا سبب تو ہے لیکن سبب حقیقی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت محض علامت اور دلیل علی الشئے کی ہے۔ اس لیے حقیقۃً اس کا موجود ہونا ضروری نہیں بلکہ تقدیراً اس کا وجود کافی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر پانچ نمازیں روزانہ فرض کی ہیں اور دنیا کے ہر ملک، ہر خطہ اور ہر قطعہ کے رہنے والے مسلمانوں پر فرض کی ہیں اور اللہ کا یہ حکم ہی سبب حقیقی ہے۔ کسی نماز کے وقت کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ وہ نہ آئے تو نماز ہی ساقط ہو جائے۔ اس دوسرے گروہ نے اپنی رائے کی تائید میں حدیث دجال کو بھی پیش کیا ہے متعلقہ ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہے :۔

"حضور دجال کا ذکر فرما رہے تھے) صحابہ نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! دجال زمین پر کتنے دن مقیم رہے گا؟ آپ نے فرمایا۔ چالیس دن، اس کا ایک دن ایک سال کی طرح ہوگا اور ایک دن ایک مہینے کی طرح اور ایک دن ایک ہفتے کی طرح اور اس کے باقی ایام تمہارے عام دنوں کی طرح ہوں گے۔ صحابہ نے پوچھا۔ یا رسول اللہ وہ ایک دن جو ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں ہمارے لیے ایک دن کی نماز کافی ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ اس کے بقدر اندازہ کرو۔"

(شامی، جلد ۱ صـ۳۳۷)

یہ حدیث پیش کرکے امام ابن ہمام لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن میں جو ایک سال کے برابر ہوگا، سایہ کے ایک مثل یا دو مثل ہونے سے پہلے عصر کی تین سو نمازیں واجب قرار دی ہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے ہم نے یہ استفادہ کیا کہ فی الواقع ہر چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ اوقات اگر موجود ہوں تو ان پانچ نمازوں کی تقسیم ان اوقات پر کی جائے گی لیکن اگر یہ موجود نہ ہوں تو نمازوں کی فرضیت ساقط نہ ہوگی اور یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی نکلتی ہے۔ خمس صلوٰت کتبھن اللہ علی العباد" (پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں)

علامہ شامی نے مختار کی شرح میں تفصیل سے ان دونوں گروہوں کے دلائل لکھے ہیں۔ ان کا اپنا میلان صاحب فتح القدیر کی رائے کی طرف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ سے بھی یہی رائے منقول ہے

اور اس سے اس رائے کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے —— حقیر راقم الحروف کے نزدیک بھی یہی دوسری رائے کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہے اور امام مسلم کی مذکورہ حدیث تو گویا اس مسئلے کے لیے نص صریح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حدیث میں "اقدروا لہ" (اس کے بقدر اندازہ کرو) کا مطلب امام نووی شارح مسلم نے یہ لکھا ہے کہ معتدل ایام کے لحاظ سے دو نمازوں کے درمیان کا اندازہ کرکے پانچوں وقتوں کی نمازیں ادا کی جائیں گی۔ مثلاً اگر فجر اور ظہر کے درمیان ۶ گھنٹوں کا فرق ہو تو فجر کی نماز ادا کرنے کے چھ گھنٹوں کے بعد ظہر کی نماز ادا کی جائے گی اور اسی طرح پانچوں نمازوں کے اوقات اندازے سے مقرر کیے جائیں گے ——

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اب اعلیٰ درجہ کی گھڑیاں اور دوسرے ذرائع ایسے موجود ہیں کہ کسی معتدل خطّے کے اوقات صحت کے ساتھ معلوم ہوسکتے ہیں۔ اندازہ لگانے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔

اس بنیادی مسئلے کے حل کے لیے راقم الحروف کا ذہن حضرت ابن عباس رضؓ کی اس متفق علیہ حدیث کی طرف بھی جاتا ہے جس میں ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازیں جمع کرکے ادا فرمائیں۔ مسلم میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابن عباس قال صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الظہر والعصر جمیعا بالمدینۃ فی غیر خوف ولا سفر وفی روایۃ صلی الظہر والعصر جمیعاً والمغرب والعشاء جمیعاً فی غیر خوف ولا مطر (جلد۱ باب جواز الجمع بین الصلوتین فی السفر)	حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں بایں حال کہ نہ کوئی خوف تھا نہ سفر ظہر وعصر کی نمازیں جمع کرکے پڑھیں اور ایک روایت میں ہے کہ ظہر وعصر ایک ساتھ اور مغرب وعشاء ایک ساتھ پڑھیں بایں حال کہ نہ کوئی خوف تھا نہ بارش

بخاری شریف میں الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی بالمدینۃ سبعا وثمانیا الظہر والعصر والمغرب والعشاء وفی روایۃ سبعا جمیعا وثمانیا جمیعا (بخاری باب تاخیر الظہر الی العصر)	حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں سات اور آٹھ رکعتیں یعنی ظہر وعصر اور مغرب وعشاء پڑھیں اور ایک روایت میں صراحت ہے کہ سات رکعتیں ایک ساتھ اور آٹھ رکعتیں ایک ساتھ پڑھیں۔

اس حدیث پر جو مباحث ہیں اس سے قطع نظر راقم الحروف کا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ حضور نے مدینہ میں جمع بین الصلوتین یہ ذہن نشین کرنے کے لیے کیا ہوگا کہ اوقات، نمازوں کے حقیقی اسباب نہیں ہیں۔ میدان عرفات میں عصر کی نماز ظہر کے وقت میں ادا کرنا تمام ائمہ دین کے نزدیک صحیح ہے اور یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وقت سبب حقیقی نہیں ہے ورنہ وہاں بھی ظہر کے وقت میں عصر کی نماز صحیح نہ ہوتی۔ اس تفصیل کے بعد سوال ۳ کا جواب یہ ہے

(الف) اس صورت میں وہ آفتاب کا لحاظ نہیں کرے گا بلکہ قریب ترین معتدل خطہ ارض کے اوقات کے مطابق اپنی نمازیں ادا کرے گا۔ مثلاً اگر معتدل خطہ میں فجر کے بعد ظہر کا وقت چھ سات گھنٹوں کے بعد آتا ہو تو وہ اسی کے لحاظ سے نماز ظہر ادا کرے گا اور اسی طریقے پر بقیہ نمازیں بھی پڑھے گا۔

(ب) روزہ بھی قریب ترین معتدل خطے کے حساب سے رکھے گا۔ وہاں صبح صادق کے طلوع کا جو وقت ہوگا اس سے صوم کی ابتدا کرے گا اور وہاں گھڑی کے اعتبار سے جتنے بجے آفتاب غروب ہو اسی وقت افطار کرے گا

چوتھے سوال کا جواب

(الف) اس مسافر کا مشاہدہ طلوع و غروب، صوم و صلوٰۃ کے اوقات متعین کرنے کے لیے شرعاً طلوع و غروب نہیں سمجھا جائے گا۔ جو لوگ زمین کے ان معتدل خطوں میں رہتے ہیں جہاں باقاعدہ طلوع، استوار، زوال اور غروب آفتاب کے تغیرات موجود ہوتے ہیں۔ انہیں کے لیے پانچ نمازوں اور صوم و افطار کے اوقات ان تغیرات شمسی کے مطابق تقسیم کیے گئے ہیں جو لوگ فضا و خلا میں پرواز کر رہے ہوں یا ایسے غیر معتدل خطوں میں آباد ہوں جہاں یہ تغیرات شمسی جزئی یا کلی طور پر موجود نہیں ہیں، یا معتدل خطوں کے برعکس ہیں وہ لوگ اپنی نمازوں اور صوم و افطار کے اوقات، معتدل خطوں ہی کے اعتبار سے متعین کریں گے ورنہ بہت سی صورتوں میں لازم آئے گا کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے مکلف ہی باقی نہ رہیں اور یہ بات صحیح نہیں ہے۔

(ب) اس کا جواب (الف) کے جواب میں آ گیا میرا خیال یہ ہے کہ جس معتدل خطے سے مسافر نے پرواز کی ہے وہیں کے لحاظ سے وہ اپنے صوم و صلوٰۃ کے اوقات متعین کرے گا۔

سوال ۵ سے ۷ تک کے جوابات

۵۔ (الف) شرعاً وہ آٹھ دن متصور نہ ہوں گے۔ (ب) وہ وقت تین ہی گھنٹہ شمار ہوگا۔

۶۔ وہ تین گھنٹے آٹھ دن متصور نہیں ہوں گے۔ اسپوتنک کا خلائی مسافر اس مقام کے لحاظ سے اپنی نمازوں کے اوقات متعین کرے گا جہاں سے اس نے پرواز کی ہے۔

۷۔ اوپر کہا جا چکا کہ وہ تین گھنٹے آٹھ دن متصور نہیں ہوں گے۔

۸۔ وہ روزے کی ابتدا و انتہا آفتاب کے طلوع و غروب سے نہیں کرے گا۔ صوم و صلوٰۃ کے اوقات متعین کرنے کی جہت سے اس کا مشاہدہ طلوع و غروب نا قابل اعتبار سمجھا جائے گا جب گھڑی سے وہ یہ معلوم کر رہا ہے کہ تین گھنٹہ میں اس نے آٹھ بار طلوع و شمس کا مشاہدہ کیا ہے۔ اسی گھڑی کے حساب سے وہ روزے کی ابتدا کرے گا اور اسی کے حساب سے افطار کریگا اور یہ حساب اس مقام کے اوقات کے لحاظ سے ہوگا جہاں سے وہ خلا میں داخل کیا گیا ہو۔ اس صورت میں نہ تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ افطار نہ کرے اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔

۹۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو احکام اسلام کا حسب مقدور پابند ہے۔ خلار کا مسافر اگر مسلمان ہے تو اس کو بھی بحد مقدور پابند ہونا چاہیے۔ خلار کے مسافر کا تعلق زمین سے منقطع نہیں ہوتا۔ اس لیے زمین پر ماہ رمضان کی آمد کا علم اسے روزے کا مکلف بنانے کے لیے کافی ہے۔ اگر مسافرت کی وجہ سے وہ روزے نہ رکھ سکے تو اس پر قضا واجب ہوگی۔ اس مسئلے کا جواب بھی حدیث دجال میں موجود ہے۔ اگرچہ صوم کی اس میں صراحت نہیں ہے لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کے لوگوں کو پنج وقتہ نمازوں کا مکلف قرار دیا تو اس پر قیاس کر کے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ صوم رمضان کے بھی مکلف ہوں گے حالانکہ وہاں نہ رمضان کے چاند کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ حقیقۃً ماہ رمضان کے وجود کا ـــــ جس طرح اس دن نمازوں کے اوقات تقدیراً تسلیم کیے گئے ہیں اسی طرح ماہ رمضان بھی تقدیراً موجود مانا جائے گا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو خلار کے مسافر کا حال ان لوگوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس صورت میں زمین پر رمضان حقیقۃً موجود ہوگا اور خلار کے مسافر کو اس کا علم بھی ہوگا اس لیے اس کو بدرجہ اولیٰ صوم رمضان کا مکلف ہونا چاہیے

۱۰۔ صوم و افطار کے لیے زمین کے طلوع و غروب کا اس لیے اعتبار کیا جائے گا کہ وہ اصلاً باشندہ زمین ہی ہے بلکہ وہ اپنے تمام حقوق و معاملات میں اس مملکت کا شہری ہے جہاں سے وہ خلا میں داخل کیا گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کا شوہر بھی ہوگا اور اپنی جائداد کا مالک بھی۔ وہ خلا میں داخل ہونے کی وجہ سے نہ مردہ تسلیم کیا گیا ہے اور نہ بشریت و آدمیت سے خارج ہوا ہے ـــــ اس کے علاوہ وہ جب اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ اور کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کا مخاطب ہے تو ان احکام پر عمل کرنے کے لیے جو آسان طریقہ ہوگا وہ اسی کا مکلف ہوگا اور اس کے لیے سب سے آسان طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ معتدل خطۂ زمین کے طلوع و غروب سے اپنے صوم و صلوٰۃ کے اوقات متعین کرے۔

اگر مسافرت کی رخصت سے فائدہ اٹھا کر اس نے پورے رمضان کے روزے ترک کر دیے تو زمین پر واپس آنے کے بعد اس پر قضا واجب ہوگی

۱۱۔ اس سوال کا جواب سوال ۵ کے تحت گزر چکا۔

۱۲۔ خلا کا مسافر اینما تولوا فثم وجہ اللہ پر عمل کرے گا اس کے لیے جہت قبلہ، اس کی جہت قدرت ہوگی یعنی جس طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھنے پر قادر رہو گا وہی اس کی جہت قبلہ ہوگی۔

۱۳۔ کرۂ قمر پر پہنچنے کے بعد وہاں قیام کی کچھ تفصیلات معلوم ہو جائیں تو اسی وقت صحیح جواب دیا جائے گا ویسے قیاساً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر وہاں جہت کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممکن ہو تو وہی اس کی جہت قبلہ ہے کیونکہ کعبہ سے نیچے تحت الثریٰ تک اور اس کے اوپر عرش تک سبھی جہت قبلہ ہے۔

۱۴۔ ابھی یہ سوال ہی فرضی ہے، وہاں جا کر لوگ آباد ہو لیں تو صحیح صورت حال معلوم ہوگی، ویسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب سائنس داں کرۂ قمر کو کرۂ ارض ہی کا ایک حصہ کہتے ہیں تو اس کے باشندے بھی باشندۂ ارض ہی ہوں گے۔ اس لیے زمین پر وجوب رمضان، کرۂ قمر پر بھی رمضان تسلیم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ، وہاں جب کسی مہینے کا چاند نظر نہیں آئے گا تو پھر صرف ماہ رمضان ہی کے چاند کی فکر کیوں ہے؟ صرف روزہ ہی کیوں بہت سے شرعی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

بات یہی ہے کہ وہاں سال مہینے اور ہفتے کے ایام کی تعیین کا طریقہ اسی وقت معلوم ہوگا جب لوگ وہاں آباد ہو چکے ہوں گے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے نظریے کی لغویت

عورت کے لیے کھیتی کے قرآنی استعارے نے ان لوگوں کے نظریے کی تو جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ جو خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیمیں چلاتے ہیں۔ اس لیے کہ کھیتی سے متعلق یہ رہنمائی تو معقول قرار دی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ اور اچھی سے اچھی پیداوار کس طرح حاصل کی جائے لیکن یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ لوگوں کو اس بات کے سبق پڑھائے جائیں کہ وہ بیج زیادہ سے زیادہ ڈالیں لیکن فصل کم سے کم حاصل کریں اس قسم کی نامعقول منطق صرف نادانوں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔ (تدبر قرآن)

مقصدِ زندگی کا جامع تصور

(ڈاکٹر عبدالحق انصاری)

اس مقالہ میں اب تک مقصدِ زندگی کے اسلامی نظریہ کے مختلف تصورات علیحدہ علیحدہ مطالعہ میں آئے ہیں۔ یہ مطالعہ انھیں تصورات تک محدود رکھا گیا ہے جو قرآن مجید میں آئے ہیں۔ ان کے مفہوم کی تعیین و تشریح میں قرآن مجید کی تصریحات اور بیانات ہی اولاً اور اصلاً پیش نظر رہے ہیں۔ مزید تائید و توضیح کے طور پر احادیث اور کسی قدر آثارِ صحابہ اور پھر علماء فقہ و حدیث اور اکابر صوفیہ کے اقوال سے استشہاد کیا گیا ہے۔ اب ان علیحدہ علیحدہ بحثوں کو ملا کر مقصدِ زندگی کے جامع اسلامی نظریہ کی تشکیل پیش نظر ہے۔

ضروری توضیحات

مگر اس کام کے آغاز سے پہلے چند الفاظ و اصطلاحات کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ آئندہ بحث زیادہ مفید ہو سکے اور حتی الامکان کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

سب سے پہلا لفظ مقصد ہے۔ ہم مقصد کو ہر اس شے کے لیے استعمال کر رہے ہیں جس کے حصول کے لیے شعوری کوشش کی جائے۔ مقصد خارجی ہوتا ہے اور داخلی بھی۔ خارجی مقصد کی مثال دولت ہے۔ داخلی مقاصد کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے جیسے علم، دل سے ہوتا ہے جیسے اخلاص، توکل، جسمانی فعل سے ہوتا ہے جیسے امر بالمعروف۔ اکثر مقاصد کا تعلق ذہن، قلب اور جسم سبھی سے ہوتا ہے۔ مثلاً اقامت صلوٰۃ — اور خارجی اشیاء تک وسیع ہوتا ہے۔ جیسے عدل، ایثار، انفاق اور مجاہدہ فی سبیل اللہ۔

ایک شے بذاتِ خود مقصود رہتے ہوئے دوسری شے کے لیے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ دو فرق حیثیں دو اعتبار سے ہوں تو ان میں کوئی تناقض نہیں۔ خدا کی یاد بذاتِ خود مقصود ہے اور تزکیہ اخلاق کا ذریعہ بھی، نماز خدا کا ذکر ہے اور فی نفسہ مقصود ہے۔ مگر نماز فحش و منکرات سے روکنے کے لیے ایک ذریعہ

بھی ہے۔

دو چیزوں کو بذات خود مقصود قرار دینے سے لازم نہیں آتا کہ دونوں کی مقصودیت یکساں درجہ کی ہو مقاصد میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق جائز ہے، مگر یہ تفریق اسی وقت معقول ہوتی ہے جب کہ اس تفریق کے کچھ متعین معیار ہوں اور قابل فہم ہوں۔

کسی چیز کو بذات خود مقصود قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر صورت حال میں اس کو اختیار کیا جائے۔ مقاصد میں درجہ بندی کا ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان ایک اعلیٰ مقصد کو ادنیٰ مقصد پر ترجیح دے سکتا ہے کسی مخصوص فعل کے پیش نظر ایک سے زیادہ مقاصد ہو سکتے ہیں۔ نکاح کی مثال پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ ان مقاصد میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تقسیم صحیح ہو سکتی ہے۔ بعض چیزیں اصلاً مقصود ہوتی ہیں اور بعض تبعاً اصلی اور تبعی مقاصد کا امتیاز فقہ اسلامی میں مسلم ہے اور شریعت کی توجیہ اور تفہیم میں اس امتیاز کو بڑی اہمیت حاصل ہے

تبعی مقاصد

تبعی مقاصد کا تصور تشریح طلب ہے۔ بعض مقاصد تبعی اس لیے کہے جاتے ہیں کہ وہ دوسرے مقاصد کے مقابلہ میں کمتر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مقاصد نکاح میں مثلاً پیدائش اولاد کو جنسی اور نفسیاتی تسکین پر مقدم تصور کیا جاتا ہے پہلے مقصد کو اصلی اور دوسرے مقاصد کو تبعی کہا جاتا ہے۔ اس مثال میں دوسرے مقاصد کو تبعی کہنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ بذات خود مقصود نہیں ہیں۔ جنسی تسکین اور نفسیاتی سکون فی نفسہ مقصود ہیں۔ ان کی حیثیت مقصد اول کے لیے محض ذریعہ کی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں یہ مقاصد بھی اسی طرح صراحۃً بیان ہوئے ہیں جس طرح کہ پہلا مقصد اور قرآن وسنت میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ یہ مقاصد فی نفسہ مقصود نہیں ہیں بلکہ پہلے مقصد کے لیے محض ذریعہ اور معاون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس مثال سے واضح ہوا کہ تبعی مقصد کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ لغیرہ مقصود ہے۔ تبعی مقصد کے یہ معنے بھی نہیں ہیں کہ وہ اصلی مقصد کے مقابلہ میں لازماً ادنیٰ درجہ کا ہو۔ نکاح کے مقاصد میں سے ایک مقصد زوجین کے درمیان محبت و رحمت کا ہے۔ یہ مقصد اگرچہ تبعی مقاصد میں شمار ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ پیدائش اولاد کے مقصد کے مقابلہ میں زیادہ بلند اور برتر مقصد ہے۔ پیدائش اولاد کا مقصد اول اور بنیادی مقصد ہے اس مقصد کا تحفظ ہر دوسرے مقصد کے تحفظ پر مجموعی حیثیت سے مقدم ہے۔ اجتماع اور معاشرے کے نقطہ نظر سے

اس کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ شریعت میں اس کا مطالبہ اول مطالبہ ہے۔ لیکن جس طرح ہر ابتدائی، بنیادی اور اول چیز لازماً سب سے بلند، برتر آخری اور تکمیلی نہیں ہوتی اسی طرح پیدائش اولاد کا مقصد سارے دوسرے مقاصد کے مقابلہ میں بلند اور اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔

اگرچہ تبعی مقاصد ہمیشہ کم تر درجہ کے مقاصد نہیں ہوتے لیکن اصلی مقاصد کے مقابلہ میں کم تر درجہ کے ہو سکتے ہیں اور بسا اوقات ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز کا اصل مقصود خدا کی یاد، اظہار بندگی، اخبات، خشوع اور دعا ہے۔ اس کا تبعی مقصد فواحش و منکرات سے بچاؤ اور اس کے خلاف قوت دفاع کی تقویت ہے اور یہ مقصد پہلے مقصد کے مقابلہ میں کم تر درجہ کا مقصد ہے۔ مگر یہ مقصد بھی بذات خود مطلوب ہے۔

تبعی مقاصد کا اطلاق کبھی لغیرہ مقصود چیزوں پر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ اطلاق صحیح نہیں ہے لیکن اگر کسی جگہ لغیرہ مقصود چیز ہی مراد ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ چیز فی نفسہ مطلوب نہ ہو گی۔

تبعی مقصد کا اطلاق بسا اوقات ان چیزوں پر کیا جاتا ہے جن کا ارادہ اصلاً نہیں کیا جاتا۔ بلکہ جو اس چیز کے ساتھ جو اصلاً مراد ہوتی ہے اتفاقیہ طور پر شامل ہو جاتی ہیں یا جن سے اس مطلوبہ چیز کی تحصیل میں اجتناب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شے فی الواقع اس معنے میں مراد ہو تو نہ تو وہ بذاتہ مقصود ہو گی اور نہ ہی لغیرہ مقصود کی اصطلاح اس پر پوری طرح صادق آئے گی۔

بذاتہ مقصود چیز کی پہچان یہ ہے کہ اس کی ساری قدر و قیمت کسی دوسری چیز کے ذریعے اور معاون کی حیثیت سے نہ ہو جس حد تک کسی چیز کی قدر و قیمت دوسری چیز کی قدر و قیمت سے مستخرج نہیں ہے، اس حد تک وہ بذاتہ مقصود ہے۔

مقصد اور ذریعہ

مقصد کا وجود ذریعے کے وجود سے مختلف ہوتا ہے۔ وضو نماز کے لیے ذریعہ ہے اور نماز کے وجود سے اس کا وجود مختلف ہے۔ بعض ذرائع اپنے مقاصد کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں، بعض نہیں ہوتے، اقامت حدود کے لیے حکومت کا اقتدار ناگزیر ہے۔ مگر نماز کے لیے وضو ناگزیر نہیں ہے۔ تیمم اس کا بدل ہو سکتا ہے۔ مگر اقامت حدود کے لیے اقتدار حکومت کا کوئی بدل نہیں ہے۔

ذریعہ بذات خود کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ذریعہ کسی مقصد کے ذریعہ ہونے کی حیثیت کے علاوہ بھی قدر و قیمت رکھتا ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک اعتبار سے

وہ ذریعہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ خود مقصود ہے۔

کسی مقصد کے حصول کے لیے ہر وہ شرط جس کا وجود شعوری کوشش کا نتیجہ ہو، ذریعہ ہے۔ نماز کے لیے وضو یا تیمم شرط ہیں۔ چونکہ ان کا وجود شعوری کوشش چاہتا ہے اس لیے نماز کے لیے ان کی حیثیت ذرائع کی ہے۔ مگر وہ شرط جو شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں شرط تو ہے، ذریعہ نہیں ہے جیسے زکوٰۃ کے لیے ایک سال کے گزر جانے کی شرط۔

مقصد اور ذریعہ میں جو تعلق ہے وہ کسی شے اور اس کی مخصوص شکل کے درمیان تعلق سے مختلف ہے۔ خدا کی یاد مقصود ہے۔ مگر نماز اس یاد کے لیے ذریعہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ اس یاد کی ایک مخصوص صورت ہے۔ کیونکہ نماز جن چیزوں سے عبارت ہے ان میں حمد و ثنا، تسبیح و تکبیر، تلاوت قرآن، دعا اور تشہد سب خدا کی یاد ہیں نہ کہ یاد کے ذرائع۔ حج بھی نماز کی طرح خدا کے ذکر کی ایک مخصوص شکل ہے۔

پھر ذریعہ کی طلب مقصد کے لیے ہوتی ہے اور اس کی قدر و قیمت مقصد کی قدر و قیمت سے مستخرج ہوتی ہے۔ ذریعہ بذات خود کسی قدر کا حامل نہیں ہوتا۔ مگر اگر کوئی شے مقصود ہے تو اس کی مختلف صورتیں بھی مقصود ہوتی ہیں۔ بلکہ اس شے کی مقصودیت کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس کی مختلف صورتیں فرداً فرداً اور مجموعی حیثیت سے مقصود ہیں۔ ان صورتوں سے علیحدہ اس شے کی مقصودیت کے کوئی معنے نہیں ہوتے۔

ظاہر و باطن

اخلاقی اور دینی فضائل کے داخلی پہلو اور خارجی مظاہر میں جو تعلق ہوتا ہے وہ مقصد اور ذریعہ کا تعلق نہیں ہے۔ اخلاقی فضائل سے عفت، شجاعت، فیاضی، ہمدردی جیسی فضیلتیں مراد ہیں جن کا سیاق انسانی ہے۔ دینی فضیلتوں سے مراد اخلاص اور توکل جیسی فضیلتیں ہیں جو خدا کے سیاق میں وجود میں آتی ہیں شکر کا شمار دونوں قسموں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے شکر کی مثال کے پیش نظر ہم اس بات کی وضاحت کریں گے۔

شکر کا داخلی پہلو اولاً انسان کے اس علم و شعور کا نام ہے کہ اس کو ایک ایسا عطیہ ملا ہے جو اس کا حق نہیں تھا۔ دینے والا کسی قانونی اور اخلاقی ضابطے کے تحت اسے عطا کرنے کا پابند نہیں تھا۔ اور یہ کہ عطیہ اس کے لیے مضر نہیں بلکہ مفید ہے۔ یہی ذہنی شعور دو شخصیتوں کو شاکر اور مشکور کے رشتے میں جوڑ دیتا ہے یہ شکر کا آغاز ہے۔ شکر کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ذہن کا یہ مجرد شعور گہرے قلبی اعتراف میں تبدیل ہو جائے۔ دل احسان

کا وزن محسوس کرے اور محسن کی طرف احترام و خشوع، پسندیدگی اور محبت کے جذبات پیدا ہوں۔

شکر کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ زبان احسان کا اعتراف کرے، اس کے اثر سے آواز پست ہو جائے۔ آنکھیں نیچی ہو جائیں۔ چہرہ پر احسان شناسی کا تخشع طاری ہو جائے۔ گردن جھک جائے۔ رکوع اور سجود بھی اسی مرحلہ کی چیزیں ہیں۔

شکر کا چوتھا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ جسم کے ساتھ انسان کے عمل میں بھی خشوع پیدا ہو۔ محسن کو خوش کرنے کے لیے کوشش ہو۔ اس کا حکم بجا لایا جائے۔ اس کی مرضی پوری کی جائے۔ اس کے عطیہ کو اس کام میں لگایا جائے جو اس سے مطلوب ہو۔ اور اس طریقے پر اس کا استعمال کیا جائے جس سے اس کی رضا حاصل ہو[1]

شکر کے یہ چار مراحل ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق ذہن و قلب سے ہے اور دو کا جسم اور عمل سے۔ پہلے دو داخلی ہیں اور آخری دو خارجی۔ شکر ان چاروں چیزوں سے عبارت ہے۔ اور ان چاروں سے مل کر مکمل ہوتا ہے۔ شکر کے مستحسن ہونے کے معنے ہیں کہ یہ چاروں مراحل مستحسن ہیں اور شکر کو مقصود قرار دینے کے معنے یہ ہیں کہ احسان کے احسان ہونے کا شعور، قلب میں اس کا گہرا اعتراف، محسن کے لیے احترام و محبت کا جذبہ، سر، آنکھوں، آواز، چہرے اور پورے جسم کا خشوع اور عطیہ کا صحیح استعمال اور محسن کی خوشنودی کے اعمال سبھی مقصود ہیں۔ ان چیزوں کے درمیان کہیں بھی ایسا خط نہیں کھینچا جا سکتا کہ اس سے پہلے کی چیزیں تو مقصود ہیں اور بعد کی چیزیں مقصود نہیں ہیں۔ یا فلاں چیزیں زیادہ اور بلند تر درجہ میں مقصود ہیں اور فلاں کم تر درجہ میں۔ ان مراحل چہارگانہ میں داخل اور خارج، باطن اور ظاہر کا فرق ایک بیانی اور واقعاتی فرق تو ضرور ہے لیکن وہ قدر و قیمت کا فرق کسی اعتبار سے نہیں ہے۔

کبھی شروع کے دو مراحل کو شکر کی حقیقت کہا جاتا ہے اور بعد کے دو مراحل کو اس حقیقت کا مظہر قرار دیا جاتا ہے۔ اس تعبیر میں کوئی برائی نہیں۔ اگر اس سے ان مراحل کے درمیان قدر و قیمت کا فیصلہ کرنے کے لیے کوئی اصول نہ تلاش کیا جائے اور اس تقسیم کو جو ایک نری واقعاتی تقسیم ہے قدر یا اہمیت کا معیار نہ بنا لیا جائے لیکن اس کے باوجود اکثر ہوتا یہی ہے کہ باطن و ظاہر اور حقیقت اور مظاہر کے واقعاتی فرق کو بآسانی

---

[1] شکر کا یہ تجزیہ امام غزالی کے اس تجزیے کے خطوط پر کیا گیا ہے جو انھوں نے احیاء العلوم میں توبہ، صبر، شکر، رجاء اور خوف وغیرہ فضائل کی بحث میں اختیار کیا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ امام موصوف کے تجزیہ میں ہر فضیلت کے تین مرحلے ہیں۔ علم، حال اور عمل۔ ہم نے اپنے تجزیہ میں ایک مرحلے کو دو مرحلوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

قدری فرق سمجھ لیا جاتا ہے اور باطن و ظاہر اور حقیقت اور مظاہر کے درمیان فرق کی خلیج بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر صرف باطن ہی مطلوب اور محض حقیقت ہی مقصود رہ جاتی ہے۔

ایک عام غلط فہمی ہے کہ ہر باطن ظاہر کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ گوہر و صدف مغز و استخواں کی مثالیں عام ہیں۔ انہیں شعراء ہی استعمال نہیں کرتے، اہلِ فکر بھی بسا اوقات ان مثالوں سے دلیل کی کمی پوری کرتے رہیں۔ مگر مثالیں دلیلوں کا بدل نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ مخالف مثالوں کی کمی اس دنیا میں ہرگز نہیں ہے۔ آم اور گٹھلی کی مثال بہت نمایاں ہے۔ پہلی مثالوں کے برخلاف یہاں باطن کے بجائے ظاہر مطلوب ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ظاہر تو باطن کے لیے ہی مقصود ہوتا ہے۔ بذاتِ خود اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ نماز میں اصلاً تو خدا کا ذکر ہی مقصود ہے۔ جو ایک باطنی شے ہے۔ نماز کی دوسری ساری چیزوں کی قدر و قیمت اس لیے ہے کہ وہ اس مقصود کے لیے ذریعہ ہیں۔ اس استدلال میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک یہ کہ نماز جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ ذکر کی ایک مخصوص صورت ہے۔ اس میں اور خدا کے ذکر میں مقصد اور ذریعہ نہیں بلکہ ایک شے اور اس کی مختلف صورتوں کا تعلق ہے۔ دوسری بات یہ کہ ذکر کو صرف ایک ذہنی اور قلبی چیز قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ذکر ذہنی اور قلبی شعور کے ساتھ لسانی عمل کا نام بھی ہے اور دونوں أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي کی آیت سے مراد ہیں اور دونوں ہی مقصود ہیں۔ پھر ذکر اس پورے معنے میں بھی نماز کا واحد مقصد نہیں ہے۔ اگر ذکر ہی نماز کا واحد مقصد ہوتا تو رکوع اور سجود کی کیا ضرورت تھی۔ کیا قرآن کی تلاوت کا واحد مقصد خدا کی یاد ہی ہے؟ خدا کا حکم اور اس کی مرضی کا علم اور اس کی روشنی میں اپنی زندگی کا احتساب اور اس کے مطابق اپنے اعمال کو درست کرنے اور ڈھالنے کا عزم و ارادہ یہ سب کچھ کیوں مقصود نہیں

ظاہر باطن کے لیے مقصود ہوتا ہے۔ یہ کوئی بدیہی صداقت نہیں ہے۔ شجاعت ایک اخلاقی فضیلت ہے۔ اس کا باطن بے خوفی اور جرأت کا جذبہ ہے۔ شجاعت کے خارجی مظاہر میں سے ایک مظہر جنگ میں صبر و ثبات، حملہ اور اقدام ہے۔ یہ کہنا کس قدر غلط ہو گا کہ صبر و ثبات اور حملہ اور اقدام اس لیے مطلوب ہیں کہ دل میں بے خوفی اور جرأت کا جذبہ پیدا ہو، یا یہ کہ دشمن کے حملہ کا پوری قوت سے مقابلہ کرنا اور اس پر غلبہ پانا تو فی نفسہٖ قابلِ تعریف چیز نہیں ہیں۔ قابلِ تعریف اگر کوئی چیز ہے تو وہ محض جرأت اور بے باکی ہے۔ اس مثال سے واضح ہے کہ ظاہر اور باطن میں سے ایک کو مقصود اور دوسرے

کو ذریعہ قرار دینے کا خیال کس قدر بے بنیاد خیال ہے۔

حقیقت اور مظاہر

فضائل کے داخل کو حقیقت اور خارج کو مظہر کہنے سے غلط فہمی کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں۔ اگر حقیقت سے مراد ماہیت ہو جو ایک جنس کے مختلف افراد میں مشترک ہوتی ہے تو اول اس معنے میں حقیقت کا اطلاق فضائل کے داخلی پہلو پر صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ماہیت اپنے افراد سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ درآں حالیکہ کسی ایک فضیلت کا داخلی پہلو اپنا وجود رکھتا ہے۔ اور اگر داخل کو ماہیت کہنا صحیح بھی ہو تو اس سے یہ کہاں نتیجہ نکلتا ہے کہ تنہا ماہیت ہی مقصود ہے۔ خارجی مظاہر مقصود نہیں ہیں۔ کسی جنس کے افراد میں جو چیزیں مشترک ہوتی ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ہر فرد میں تنہا وہی مقصود ہوں، اور غیر مشترک چیزیں جو افراد کی انفرادیت اور تشخص کے لیے انتہائی ضروری ہوتی ہیں وہ مقصود نہ ہوں اہل منطق جس چیز کو ماہیت کہتے ہیں اور جسے یہاں حقیقت کہا جا رہا ہے محض اس کو مقصود و مطلوب قرار دینا نرا مغالطہ ہے اور پھر تنہا اس چیز کو حقیقت قرار دینا اور غیر مشترک اجزاء کو غیر حقیقی کہنا اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ پہلے مغالطہ سے زیادہ بڑا مغالطہ ہے۔

بعض اوقات حقیقت کا دائرہ اور محدود کر دیا جاتا ہے۔ کسی جنس کی ساری مشترک چیزوں کے بجائے صرف اس مشترک چیز کو حقیقت، کہا جاتا ہے جو اس جنس کو اس کی نوع کے تمام اور اجناس سے ممتاز کرتی ہے۔ یعنی منطقی اصطلاح میں جسے جنس کی فصل کہا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جنس انسان کو دوسرے اجناس سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ اس کی عقل ہے۔ یہی عقل انسان کی اصل حقیقت ہے عقل کے علاوہ اس کی ساری چیزیں اس کی حقیقت کا جز نہیں ہیں۔ اور پھر ایک قدم آگے بڑھا کر کہا جاتا ہے کہ حقیقت ہی مقصود ہوتی ہے۔ اس لیے انسان کا آخری اور واحد مقصود تکمیل عقل ہے یعنی حقیقی علم و معرفت کی تحصیل۔ یہ تیسرا مغالطہ ہے جو پہلے دو مغالطوں سے ہزار گنا زیادہ مہلک ہے جنس اور فصل کی تقسیم منطقی تعریف (DEFINITION) کی چیزیں ہیں اور بیانی اور واقعاتی (Descriptive and factual) تحلیل کا کام انجام دیتی ہیں۔ ان سے قدری (valuational) نتائج اخذ کرنا اصولاً غلط ہے۔

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک گروہ کے نزدیک انسان کی فصل (Differentia) ان

منطقی عقل ہے۔ یہ ارسطاطالیسی فلاسفہ کا گروہ ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک کشفی وجدان ہے۔ اس گروہ میں کچھ فلاسفہ اور کچھ صوفیا شامل ہیں۔ ایک تیسرا خیال بھی بعض حلقوں میں رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کی ممتاز ترچیز عقل (منطقی یا کشفی) نہیں بلکہ اس کے جذبات وکیفیات ہیں[1]۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

زندگی کا مقصد جامع

اگلے صفحات کی تفصیلی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے زندگی کی غایت ومقصد کا کوئی ایک طرفہ اور جزئی نظریہ پیش نہیں کیا ہے۔ زندگی کا کوئی ایک جز یا ایک پہلو ایسا نہیں ہے جو تنہا مقصود ہوا اور دوسرے اجزا اور شعبے اس کے لیے صرف ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہوں۔ عبادات کو دین میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ دین کے ارکان اور ستون ہیں۔ ان کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ تزکیہ باطن اور تصقیل قلب کا ذریعہ ہیں اور انسان کو حقائق دنیویہ یا کونیہ کی معرفت شہود کے لیے تیار کرتی ہیں۔ ان کی قدر وقیمت اس لیے بھی نہیں ہے کہ وہ تعمیر سیرت، اصلاح معاشرہ اور نظام اسلامی کے قیام کی راہ ہموار کرتی ہیں بلکہ وہ زندگی کے دوسرے مقاصد کی طرح فی نفسہٖ مقصود ہیں اور ان کی قدر وقیمت اس لیے ہے کہ مقاصد دین کی فہرست میں ان کا مقام سب سے اونچا ہے۔

بعض لوگ تعلق باللہ کے معنے عبادات لیتے ہیں۔ اور تعلق باللہ کی مقصودیت سے تنہا عبادات کی مقصودیت مراد لیتے ہیں لیکن تعلق باللہ کے معنے خدا کی اس مخلصانہ رضاجوئی کے ہیں جس کے ساتھ دلی جذبات شامل ہوں۔ اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ خدا کی رضاجوئی ساری زندگی پر حاوی ہے اور کسی ایک شعبہ میں محدود نہیں ہے۔ اللہ سے بندے کا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ معبود ہے اور اس کی تعظیم، پرستش، یاد اور عبادات کرنی ہے۔ وہ رب اور آقا بھی ہے۔ اس کی بندگی اور اطاعت بھی کرنی ہے۔ وہ بادشاہ حقیقی ہے اور ہم اس کے نائب ہیں۔ ہمیں ایک نائب کی طرح اس کا ہر حکم نافذ کرنا اور اس کی ہر مرضی پوری کرنی ہے اور دوسروں پر اس کی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد

---

[1] یہ تیسرا خیال حال ہی میں جناب وحیدالدین خاں صاحب نے پرزور الفاظ میں اپنی کتاب تعبیر کی غلطی میں پیش کیا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹۹) پہلے دو خیالوں کے حاملین نے تو اپنے اپنے خیال کے حق میں کچھ دلائل بھی دیے ہیں مگر موصوف نے اپنے خیال کے حق میں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں سمجھی ہے۔

بھی کرنی ہے۔ دل کی لگن اور قلب کا خشوع عبادات ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری زندگی میں جاری اور ساری روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ تعلق باللہ، ایک شعبہ کی چیز نہیں، ساری زندگی کی چیز ہے۔

عبادات کی طرح تزکیۂ اخلاق اور تعمیر سیرت بھی مقصود ہیں۔ مقاصد دین میں انھیں بھی بہت بلند مقام عطا کیا گیا ہے۔ مگر یہ بھی تنہا مقصود نہیں ہیں۔ بعض حلقوں میں یہ رجحان ہے کہ مذہب کا تمام تر حاصل، اخلاق ہے۔ یہ رجحان مغرب میں زیادہ عام اور بہت واضح ہے۔ اس رجحان کی بنیاد پر عیسائیت اور یہودیت میں مستقل فرقے وجود میں آچکے ہیں۔ تنظیمیں اور ادارے قائم ہو چکے ہیں اور مختلف الٰہیاتی اور دینی نظریات تشکیل پا چکے ہیں۔ مشرق میں بھی اس طرح کے رجحانات کی کمی نہیں۔ بعض ادیان تو بنیادی طور پر اخلاقی مذاہب ہی ہیں۔ بعض دوسرے حلقوں میں بھی جو مغربی فکر اور تہذیب سے خاصے متاثر ہیں یہ رجحان نمایاں ہو رہا ہے کہ ایمان و عقیدہ، پرستش اور عبادت کا سارا حاصل اخلاق اور سیرت کی تعمیر ہے۔ ایک دور تھا جب کہ اخلاق و سیرت کی تعمیر کو روحانی مقاصد کے لیے تیاری کے نصاب میں داخل کیا جاتا تھا اور اب یہ رجحان ہے کہ روحانی کاوشیں تزکیۂ اخلاق اور تعمیر سیرت کی تیاریاں سمجھی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں رجحانات ناقص ہیں۔ قرآن و سنت سے نہ اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے نہ اس نظریہ کی —— اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ عبادات و اخلاق دونوں بجائے خود مقصود ہیں اور دونوں مستقل اہمیت و قدر و قیمت کے حامل ہیں۔

یہی حال دین کے اجتماعی مقاصد اور اجتماعی احکام کا ہے۔ میری زندگی کا مقصد فقط میرا ہی ایمان و یقین، میری ہی عبادات، میرا ہی تزکیۂ اخلاق اور تعمیر سیرت اور میری ہی زندگی کی تشکیل نہیں ہے۔ بلکہ ہر اس فرد کا ایمان و یقین، تزکیہ و تعمیر، اصلاح و تکمیل میری زندگی کے مقاصد میں شامل ہے جس کا مجھے راعی، قوام اور مسئول بنایا گیا ہے۔ جسے میری خلافت و نیابت میں دیا گیا ہے۔ جو میرے حلقۂ اثر و نفوذ، اختیار و اقتدار میں ہے۔ پھر دوسروں کی اصلاح و تعمیر کی کوشش میرے لیے صرف اس لیے مطلوب نہیں ہے کہ وہ بالواسطہ میری اصلاح و تعمیر، تزکیہ و تکمیل کا ذریعہ ہے۔ بلکہ وہ بذات خود مطلوب ہیں۔ خدا کی عبادت اور حجت کا ایک جز اپنی اصلاح و تعمیر ہے۔ دوسرا جز دوسروں کی اصلاح و ترقی ہے۔ ہر فرد کی یہ دونوں ذمہ داریاں مستقل ہیں اور دونوں مقصود ہیں۔ شریعت کے اجتماعی احکامات اس وقت تک ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کیے جا سکتے جب تک کہ دوسرے کی اصلاح و ترقی اپنی اصلاح و تکمیل کی طرح زندگی کا مقصد نہ بن جائے۔

مقصد زندگی کا اسلامی نظریہ روح اور جسم کے مقاصد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ نہ تنہا روح کی بالیدگی مقصود ہے اور نہ تنہا جسم کی۔ کسی کی ترقی صرف اس لیے مقصود نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اور وہ خود ہر قدر و قیمت سے خالی ہے۔ اسلامی نظریہ روح اور جسم کے مقاصد کے درمیان کسی غیر مختمل تضاد کا قائل نہیں۔ ان میں توافق ممکن ہے اور مناسب حدود کے اندر دونوں کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ جسم و روح کی ہم آہنگ تکمیل اسلامی نظریہ کے مطابق زندگی کا مقصود ہے۔

اسی طرح اسلام کی نظر میں زندگی کا ظاہر و باطن یکساں مقصود ہیں۔ علم و معرفت، جذبۂ احساس یقین و ارادہ قول و عمل سب کچھ مقصود ہیں۔ بعض فقہاء نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ علم فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ مقصدیت تو صرف عمل کو حاصل ہے۔ خواہ وہ قلب کا عمل ہو یا جوارح کا۔ یہ خیال یک طرفہ ہے۔ بلاشبہ علم کا ایک حصہ وہ ہے جو عمل کے لیے ہی مقصود ہے لیکن سارا علم ایسا نہیں ہے خدا کی ذات و صفات اور دین کے دوسرے حقائق کا علم و یقین بذات خود مستحسن اور مطلوب ہے اس فقیہانہ خیال کے خلاف اہل فلسفہ اور اہل تصوف کا ایک گروہ تنہا علم و معرفت کو آخری غایت قرار دیتا ہے اور سارے اعمال حتیٰ کہ اخلاق و عبادات کو اس کے لیے ذرائع و وسائل اور تیاری میں شمار کرتا ہے۔ یہ خیال بھی یک طرفہ ہے۔ کچھ لوگ جذبات و احساس کو انسان کی حقیقت ٹھیرلتے ہیں اور خدا کے ساتھ گہرے جذباتی تعلق اور اس کی کیفیات کو حاصل دین اور مقصد زندگی بتلاتے ہیں۔ ان کے خیال میں تمام اعمال یا بیشتر اعمال مقصد کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ خیال بھی پہلے دونوں خیالوں کی طرح یک طرفہ ہے۔ یہ تینوں خیالات دین اور انسان کے ناقص فہم اور حقیقت کے بارے میں کوتاہ نظری کا نتیجہ ہیں۔

(باقی)

(جناب احمد خضر زبیری ایم۔اے۔سی)

برہمن ویدکی حمدوں کے بعد برہمن یا نذروں کے متعلق لٹریچر کا زمانہ آتا ہے۔ یہ دونوں عہد واضح ہیں اور دونوں کا مخصوص مزاج ہے لیکن اس کے باوجود دونوں آپس میں ملے جلے ہیں کیونکہ یجر اور سام وید برہمن کی رسوم کو بطور ایک امر واقعہ کے قبول کر لیتے ہیں۔ لہذا یہ اس کے بعد کے نہیں ہو سکتے۔ برہمن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو ازم کا واحد مقصد نذر و نیاز چڑھانا ہے۔

اس طریقہ عبادت پر بدھ ازم نے زبردست تیشہ چلایا تھا جس کے حملے سے وہ پوری طرح سنبھل نہیں سکا نذر چڑھانے کا طریقہ جو کہ برہمن سے معلوم ہوتا ہے وہ اس قسم کا ہے گویا کہ یہ سائنٹفک طریقہ ہے حیات جاوداں اور دنیا کی شان و شوکت حاصل کرنے کا۔ نذر ابتدا میں تو ایک معمولی چڑھاوا تھا لیکن بعد کو اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی — برہمن سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتا بھی ابتدا میں فانی تھے اور انھوں نے بھی دوام انھیں نذروں کے ذریعہ حاصل کیا اور جو کوئی آدمی اسی طرح نذریں چڑھائے وہ بھی دیوتاؤں کی طرح غیر فانی بن سکتا ہے۔ نذر چڑھانا محض دیوتاؤں کی خوشنودی کا ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کی جادوگری ہے جس کا ساری دنیا پر اثر ہے۔ یہ رجحان اب بھی مختلف ہندو فرقوں میں موجود ہے گو کہ دوسرے روپ میں ہے۔ ویدک رسموں میں جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے ان میں اناج کی ٹکیاں، پگھلا ہوا مکھن، جانور اور کبھی کبھی آدمی بھی شامل ہوتے تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت سوم رس کی تھی۔

تپسیا — جس طرح کہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ساری دنیا کے اندر ایک مخفی روح جاری و ساری

ہے جس کو برہمن کے طریقہ عبادت کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے اور جس کے ذریعے ساری کائنات پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح تپسیا کرنے والا اپنے تپسیا کے زور سے سب دیوتاؤں اور نظام قدرت پر قابو حاصل کر لیتا ہے۔ تپسیا اپنی خواہشات کو فنا کر دینے اور اپنی خوشی سے اپنے آپ کو تعذیب دینے کا نام ہے۔ اس عقیدے کے مطابق نفس کشی کی شدت اور استقلال سے بڑی قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ دیوتاؤں نے تخلیق کا عمل تپسیا کے زور سے کیا ہے۔ یہ طرز فکر و عمل ویدک طرز کے فکر و عمل سے مختلف ہے۔ کیونکہ ویدک زمانے کے لوگوں کے سامنے دنیا کی خوشی اور دنیا کے غم، الغرض کہ ہر طور پر دنیا کی زندگی تھی اور دنیا میں اپنے آپ کو عذاب دے کر کوئی اور چیز حاصل کرنا ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ بہر حال بعض محققین نے تپسیا کے تصور کی ابتدا ویدک عہد ہی سے کی ہے۔

اپنشد اور علم برہمن کے بعد اپنشد کا دور ہے۔ پرانے اپنشد وید کے یا برہمن کے ضمیمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنشد کا مضمون نذر و نیاز کے بجائے فلسفیانہ مباحثہ ہے۔ مغربی محققین اپنشد کو مختلف لوگوں کا فلسفہ سمجھتے ہیں لیکن ہندوؤں کے نزدیک چونکہ یہ الہامی ہیں۔ اس وجہ سے وہ ان کو ایک ہی فلسفہ کا پیغامبر سمجھتے ہیں اور ان کی اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ ایک مستقل نظام فلسفہ کی بنیاد اٹھائی جا سکے۔

اپنشد کا ایک دلچسپ مضمون یہ ہے کہ آتما اور پرماتما کا تعلق معلوم کیا جائے۔ آتما انسان کی حقیقت ہے جو کہ نہ انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، نہ مرتی ہے بلکہ وہ ایک مستقل غیر فانی ہستی ہے۔ انسان کو اس کا ادراک کسی قدر خواب میں اس سے زیادہ بے خواب نیند میں اور اس سے بھی زیادہ ایک اور کیفیت میں ہوتا ہے جو کہ اس سے بھی ایک درجہ آگے ہے۔ آتما کو محسوس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ خود آتما ہی ہے جو کہ حواس خمسہ کے ذریعے سے خارجی دنیا کو محسوس کرتی ہے۔ آتما کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ یہ خود آتما ہی ہے جو کہ دماغ کے ذریعہ سوچتی ہے۔ آتما خود حواس اور دماغ کو استعمال کرتی ہے لیکن خود ان کی گرفت سے بالاتر ہے۔

دوسرا اہم مضمون ہے وجود حقیقی یا برہمن کے وجود کی حقیقت کے متعلق ـــــ اپنشد میں اس کا تعلق دیومالا سے نہیں ہے بلکہ فلسفہ سے ہے کبھی اس کا ذکر بطور ایک متشخص ہستی کے کیا جاتا ہے کبھی غیر متشخص۔ کبھی اس کو عیاں کہا جاتا ہے کبھی نہاں۔ اپنشد کے نقطہ نظر سے کائنات برہمن سے

وجود میں آتی ہے اور برہمن ہی پر اس کا وجود منحصر ہے ۔
ایلیٹ کا خیال ہے کہ برہمن کو خدا کہا جا سکتا ہے ۔ مگر ایسا جب ہی کہا جا سکتا ہے جب وحدۃ الوجود کا نظریہ قبول کیا جائے ۔ اپنشد کی تعلیم میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ آتما اور برہمن میں کیا تعلق ہے اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں اصل میں ایک ہیں جیسے کہ برہند ۲ آکیہ اپنشد میں ہے" یہ عظیم غیر مخلوق اتم لافانی جاودانی غیر متشکل آتما درحقیقت برہمن ہے"
آتما اور برہمن کی وحدت چندوگا اپنشد میں اور واضح طور پر بیان کی گئی ہے ۔ اس میں ایک شخص اپنے لڑکے کو سمجھاتا ہے " جیسے کہ ایک مشت خاک اور سب چیزیں جو خاک سے بنی ہوئی ہیں ایک ہی جوہر ہیں اور ان کی شکلیں یا عرض محض ظاہری الفاظ ہیں اس طرح حقیقت یا جوہر اصل میں ایک ہے ......
یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے حقیقت کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے " باپ پھر سمجھاتا ہے " سب مخلوقات کی بنیاد ایک ہی حقیقت میں ہے اور سب اس حقیقت میں محصور ہیں ۔ یہی حقیقت آتما ہے اور سوئی ٹا کیتو تمہاری بھی یہی حقیقت ہے " وہ اپنے بیٹے کو مزید سمجھاتا ہے " کہ جس طرح نمک پانی میں تحلیل ہو جاتا ہے اسی طرح آتما برہمن میں تحلیل ہو جاتی ہے ۔ اپنشد کی اور انتہا پسندانہ تعلیم میں آتما برہمن کا جزو چیز اور ہیولی یا شکل متبادل نہیں ہے بلکہ خود برہمن ہے ۔ دونوں ایک ہی ہیں ان کا اختلاف محض ظاہری ہے
تناسخ کا عقیدہ اپنشد میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ یقین کیا جاتا ہے کہ آدمی جس کے کہ نیک یا برے اعمال ہوں وہ مرنے کے بعد اپنے اعمال کے لحاظ سے جنت یا جہنم میں جاتا ہے اور جب اس کی جزا یا سزا ختم ہو جاتی ہے ــــ جو کہ بالآخر ختم ہو ہی جاتی ہے تو وہ پھر دنیا میں پیدا ہو جاتا ہے ۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ خود بر سر بازار خریدار بر آید

اور یہاں پر نباتات اور حیوانات وغیرہ کے روپ دھارتا رہتا ہے لیکن اگر کسی کو آتما اور پرماتما کی حقیقت کا عرفان ہو جاتا ہے تو اس کو آواگون کے چکر سے نجات مل جاتی ہے ۔

ویدانت سوتر اپنشد کے بعد ویدانت سوتر کا دور ہے ۔ ان میں دینیات اور مذہبی رسوم کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ہے لیکن ساری معلومات نکتوں کے طور پر جمع کر دی گئی ہیں ۔ ان کی تعلیم میں زبانی تشریح کا بڑا دخل ہے ۔ اور اس تشریح کے بغیر ان کو سمجھنا محال ہے ۔
پروُ سما سوتر جو کہ جیمنی کے نام کے ساتھ منسوب ہے اس میں ان رسوم کا ذکر ہے جن کے ذریعے علم اور

معرفت حاصل ہوتا ہے۔ جیمنی کی خصوصیت یہ ہے کہ خدا کا انکار تو نہیں کرتا مگر اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ رسوم کی پابندی سے جلد یا بدیر مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس زندگی میں نہیں تو اس کے بعد کسی دوسری زندگی میں۔ رسوم کے مطابق نذر نیاز چڑھانے سے انسان کو جنت مل سکتی ہے لیکن اعمال کی ان جزا میں خدا کا کچھ دخل نہیں ہے۔ اعمال اور ان کے نتائج لازم و ملزوم کے طور پر ہیں اور ان میں کسی خدا کی مداخلت کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک دوسری سوتر بندر یاس کی ہے اس کا مفہوم بہت مبہم ہے۔ بہرحال اہل علم کے نزدیک تعلیم یہ ہے کہ برہمن (خدا) ہی دنیا کی غایت ہے۔ اس لیے سب علم اور مذہب کا تعلق بھی برہمن ہی سے ہونا چاہیے۔

برہمن پر دھیان جمانے سے آتما کو نجات حاصل ہو جاتی ہے اور وہ کسی طرح برہمن میں ضم ہو جاتی یہ سب نظریے ہندو فلسفے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

مغربی انداز فکر

(جناب فرحت قمر، لکچرر ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن، دہلی)

مغربی تہذیب کی آندھی نے موجودہ انسان کی آنکھوں میں دہریت کی دھول جھونک کر اسے حقیقت کو دیکھ سکنے کے ناقابل بنا دیا ہے۔ علم جو قربتِ الٰہی کا ذریعہ تھا اب خدا سے دور کرنے میں معاون ہو رہا ہے۔ مغرب دہریت کی راہ پر بہت دور نکل چکا ہے اور وہاں کے سنجیدہ انسان، مفکر فلاسفہ حقیقت آشنا افراد یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ یہ راہ غلط سمت میں لے جا رہی ہے لیکن مشرق کا حال عجیب ہے نہ تو وہ پوری طرح مادی ترقی کی راہ پر گام زن ہو سکا ہے اور نہ مذہب کی قدیم اقدار و روایات کا حامل رہا ہے۔

مذہب انسان کی فطرت ہے یہ ایک حقیقت ہے لیکن موجودہ دور کا انسان غیر فطری زندگی میں فطرت و حقیقت کی آگاہی سے بہت دور ہو گیا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبا تو خیر ناپختہ ذہن کے مالک ہوتے ہیں، خیالات کی دنیا میں عبوری دَور سے گزرنے والے مسافر ہوتے ہیں، افسوس ان لوگوں کے طرزِ فکر پر ہے جو عمر کی بہت سی منزلیں گزار کر بالغ نظری کے دَور میں ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی مذہب کے نام سے اس طرح چونکتے ہیں جیسے کسی نے ان کے سامنے کسی قابلِ نفرین شے کا نام لے دیا ہو۔ تعلیم کا جھکاؤ خالصتہً مادی سمت میں ہے اور تعلیم یافتہ انسان اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سائنس اور مذہب میں فرق کیوں ہے؟ یہ بات اسی وقت تک پوچھی جا سکتی ہے جب تک کوئی حقیقت سے آگاہ نہ ہو۔ فی الحال سائنس کی معلومات، اہلِ نظر کی معلومات کے مقابلہ میں ایک لاکھواں حصہ بھی نہیں ہیں لیکن اہلِ سائنس کو زعمِ باطل ہے کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ اپنی صدیوں کی کاوشوں کے بعد سائنس داں اپنے نظامِ جسمانی کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ پایا ہے۔ اس کائنات میں سائنس نے جتنا کچھ

جان لیا ہے وہ بادی النظر میں بہت کچھ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایک ذرہ سے زیادہ اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ چاند پر کمند علمیت پھینکنے والے اپنی کوششوں پر نازاں ہو سکتے ہیں لیکن وہ ذرا سا غور کریں تو اپنی بے مائیگی کا احساس ان کو ہو ہی جائے گا۔ چاند کی دوری زمین سے اوسطاً دو لاکھ تیس ہزار میل ہے اتنی دور کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لینا واقعی حیرت انگیز ہے لیکن ذرا ان ستاروں اور سیاروں کی دوری کا اندازہ بھی تو کیجئے جن سے نکلی ہوئی روشنی کی شعاعیں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے ہزاروں سال میں پہنچتی ہیں۔

اگر آج کا انسان سائنس کے اس تخمین و ظن کو صحیح سمجھتا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے کہ قرآن و حدیث میں مذکور جنت و دوزخ کی دوری اور وسعت کو بھی صحیح مان لے ___ مگر مشکل تو یہی ہے کہ آج کا مغرب زدہ ذہن سائنس کی بتائی ہوئی باتوں کو تو باوجود ان کے کھوکھلے پن کے صدق دل سے مان لیتا ہے اور اس صاحب بصیرت انسان ؐ کی ان باتوں کو جو آج کے سائنس کی ہزار تحقیقات پر بھاری ہیں۔ ماننے سے ہچکچاتا ہے۔ یہ ہچکچاہٹ کیوں ہے؟ یہ جھجک کیوں ہے؟ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی ان کے یقین و اعتقاد میں بے انتہا کمزوری ہے اور دماغوں میں خطرناک حد تک کجی۔

برسوں کی تحقیق کے بعد ماہرین نفسیات نے ایک نتیجہ نکالا ہے کہ ایک شخص اگر چاہے تو اپنے دماغ کو یکسو کر کے اور اپنی قوت خیال کو مرتکز کر کے کسی دور افتادہ مقام پر رہنے والے شخص کو کوئی پیغام پہنچا سکتا ہے اور اس بات کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ دماغ سے کچھ برقی لہریں نکلتی ہیں جو ریڈیو کی لہروں کی طرح فضا میں پھیل جاتی ہیں اور اپنے مرکز پر پہنچ کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کر سکتی ہیں اس عمل کا نام وہ ٹیلی پیتھی دیتے ہیں۔ طالب علم لکچرر کی زبان سے یہ بات سنکر پوری طرح یقین کر لیتا ہے لیکن جب اسی طالب علم کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے مدینہ میں بیٹھے بیٹھے ایران میں مارچ کرتی ہوئی سپاہ کے سالار کو ایک پیغام بھیج دیا تھا تو وہ اس میں شک کرتا ہے۔ بات وہی ہے لیکن سائنس کے نام پر اس کو مان لیا جاتا ہے۔ مذہب کے نام پر اس میں شک کیا جاتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کی سنت کو لوگ مذاق سمجھتے ہیں لیکن جب ڈاکٹر کہتا ہے کہ کھانا کھانے کے بعد دماغی یا جسمانی کام کرنے سے اعصابی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں تو اس بات کو صحیح سمجھ کر مان لیا جاتا ہے۔ آج دنیا اس بات کو مانتی ہے کہ مسمریزم کا ماہر اپنی قوت خیال کو مجتمع کر کے اپنی آنکھوں کی مقناطیسی طاقت سے اپنے معمول میں اپنی مرضی کے مطابق رد عمل کرا سکتا ہے

بیماروں کو آرام پہنچا سکتا ہے، محیر العقول کارنامے انجام دے سکتا ہے، ہزاروں میل دور کے حالات معلوم کرسکتا ہے لیکن اس بات کو ماننے کے لیے لوگ آسانی سے تیار نہیں ہوئے کہ ایک وہ شخص جس نے برسوں کی ریاضت سے اپنی روح کو لطیف اور اپنی نظر کو راز آشنا بنا لیا ہے خفیہ باتوں کا پتہ بتا سکتا ہے، کسی کے دماغ کو اپنی مرضی کے مطابق متاثر کرسکتا ہے، کسی بیمار کو شفا دے سکتا ہے۔ آج کا تعلیم یافتہ آدمی اس فیضانِ نظر کو نہیں مانتا جس نے اسمعیل کو "آداب فرزندی" سکھائے تھے آج تو لوگ "مکتب کی کرامت" میں ہی یقین رکھتے ہیں لیکن یہ سب اسی لیے ہے کہ آج کا تعلیم یافتہ انسان علامہ اقبال کی طرح صحیح العقیدہ نہیں ہے۔ سائنس کے نام پر کسی بات کو ماننا اور مذہب و روحانیات کے نام پر اعتراض کرنا بے زاری کے علاوہ اور کیا ہے؟

لیکن مذہب کے نام لیواؤں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ـــ حقیقت ہمیشہ حقیقت رہتی ہے آج فلاسفر، ماہرین نفسیات، قومی مصلح، ڈاکٹر، عالم اور مفکر جو مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن سے آگاہ ہو چکے ہیں اسی طرف لوٹ رہے ہیں جس کو مذہب کہتے ہیں۔ مذہب عین فطرت ہے اور واحد راہ نجات ہے ـــ دنیا جلد یا بدیر اس طرف آنے کے لیے مجبور ہوگی۔ آج نفسیات میں ایک نئی شاخ 'پیرا سائیکولوجی' کے نام سے ابھر رہی ہے جو بتاتی ہے کہ روح کیا ہے اور ما فوق الفطرت باتوں کی ماہیت کیا ہے تعلیم اگر واقعی تعلیم ہے تو وہ ایک دن انسان کو ضرور صحیح راستے پر لے آئے گی۔

جولائی ۷۸ء کے ریڈرس ڈائجسٹ شمارے میں ایک اونچے درجے کے ریاضی داں مسٹر وارن ویور اپنے مضمون "کیا ایک سائنس داں خدا پر یقین کرسکتا ہے" میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر مذہب اور سائنس کو صحیح طریقے سے سمجھا جائے تو ان میں کوئی ٹکراؤ معلوم نہیں ہوگا۔ سائنس کے نام سے مذہبی عقائد رکھنے والے اور مذہب کے نام سے سائنسی نقطۂ نظر رکھنے والے اس لیے چونکتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھتے نہیں۔ اپنے مضمون میں وہ ایک دلچسپ بات لکھتے ہیں کہ اہل سائنس اور اہل مذہب اگر زن و شوہر کی طرح ایک دوسرے کی بات کو برداشت کرنا سیکھیں، ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کریں، ایک دوسرے سے ہمدردی کریں تو کچھ عرصہ بعد دونوں ایک ایسی منزل پر آسکتے ہیں جہاں پہنچ کر ایک دوسرے کو سمجھنے لگیں۔ ان کے مضمون کا آخری جملہ ہے:

"مانا کہ سائنس نے اس زمین بلکہ اس سے ماورا کائنات کے بہت سے راز انسان پر کھول دیے ہیں اور یہ سائنس کی عظمت کا ثبوت ہے لیکن خدا اس سے عظیم تر ہے۔"

چند علمی اور تاریخی واقعات

امام ابو یوسف کی فقہی بصیرت

امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے دربار میں متعدد فقہاء جمع تھے اور ان میں امام یوسف بھی تھے۔ اتنے میں ایک شخص اس دربار میں لایا گیا۔ ایک دوسرے شخص نے اس پر یہ دعویٰ کیا کہ اس نے رات میرے گھر سے بہت سا مال لے لیا ہے۔ جب مدعا علیہ سے دریافت کیا گیا تو اس نے اس کا اقرار کر لیا۔ یہ سنکر امام ابو یوسف کے سوا تمام فقہاء نے بالاتفاق کہا کہ مدعا علیہ کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ امام ابو یوسف نے کہا کہ اس کو یہ سزا نہیں دی جائے گی۔ فقہاء نے پوچھا کیوں انھوں نے جواب دیا کہ اس نے صرف مال لینے کا اقرار کیا ہے اور اس اقرار سے قطع ید واجب نہیں ہوتا جب تک صراحۃً چوری کرنے کا اقرار نہ کرے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ یہ جواب سنکر تمام فقہاء نے امام ابو یوسف کی تصدیق کی۔ پھر فقہاء نے آخذ (مال لینے والے) سے پوچھا۔ کیا تو نے چوری کی تھی؟ اس نے جواب دیا۔ ہاں میں نے چوری کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا۔ اب اس کے ہاتھ کاٹنے میں کوئی شبہہ نہ رہا کیونکہ اس نے چوری کا اقرار کر لیا لیکن امام ابو یوسف نے کہا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے پہلے اقرار سے اس پر تاوان واجب ہو چکا ہے۔ چوری کا یہ دوسرا اقرار اس لئے رہا ہے کہ اس پر جو تاوان واجب ہو چکا ہے وہ ساقط ہو جائے۔ اب اس کا یہ اقرار قابل تسلیم نہیں ہے۔ یہ جواب سنکر تمام فقہا حیران رہ گئے۔

نوٹ:۔ فقہ حنفی میں چوری کی سزا صرف ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ چور پر چوری کیے ہوئے مال کا تاوان واجب نہیں ہوتا۔

قرآن فہمی کی ایک نادر مثال

امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس بیٹھا تھا کہ بلخ کے فقیہ یحییٰ بن یعمر زنجیروں میں جکڑے ہوئے حاضر کیے گئے۔ ان کو دیکھ کر حجاج نے پوچھا۔ کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ حسن اور حسین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں تھے؟ انھوں نے کہا: میں یہی خیال رکھتا ہوں۔ حجاج نے کہا: میرے سامنے قرآن سے کوئی واضح دلیل پیش کرو۔ ورنہ میں تمہاری بوٹی بوٹی کٹوا دوں گا۔ انھوں نے کہا: اے حجاج! میں تمہیں قرآن ہی سے واضح دلیل دوں گا۔ شعبی کہتے ہیں کہ مجھے فقیہ بلخ کی اس جرأت پر کہ انھوں نے نام لے کر حجاج کو مخاطب کیا تعجب ہوا۔ حجاج نے یحییٰ سے کہا کہ میرے سامنے ندع ابناءنا و ابناءکم والی آیت پیش نہ کرنا۔ انھوں نے کہا: میں کتاب اللہ سے واضح دلیل پیش کرتا ہوں۔ پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی:۔ ونوحا ھدینا من قبل ومن ذریتہ داؤد وسلیمٰن وایوب ویوسف

وموسٰی وھارون وکذالک نجزی المحسنین وزکریا ویحییٰ وعیسٰی

یہ آیت پڑھ کر انھوں نے حجاج سے پوچھا کہ بتلایئے عیسیٰ علیہ السلام کے والد کون تھے؟ حالانکہ اس آیت نے انہیں حضرت نوح کی ذریت میں داخل کیا ہے۔ تھوڑی دیر حجاج سر جھکائے رہا اور پھر سر اٹھا کر اس نے کہا۔ گویا میں نے آج تک کتاب اللہ کی یہ آیت پڑھی ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ ان کی زنجیریں کھول دو اور انہیں ایک خطیر رقم عطا کرو۔

نوٹ:۔ یہ واقعہ امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔ حجاج کا خیال یہ ہوگا کہ ذریت بیٹے کی اولاد کو کہتے ہیں اور حضرت حسن اور حسین چونکہ بیٹی کی اولاد تھے اس لیے وہ ذریت رسول میں داخل نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ذریت کا اطلاق صرف بیٹے کی اولاد پر نہیں ہوتا بلکہ بیٹی کی اولاد پر بھی ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی ذہانت کے چند واقعات

پہلا واقعہ کہا جاتا ہے کہ اہل مدینہ کی ایک جماعت امام ابو حنیفہ کے پاس اس ارادے سے پہنچی کہ ان سے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ پر مناظرہ کرکے ان کی زبان بند کر دے۔ انہیں جب ان

جماعت کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے کہا: میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں آپ سب لوگوں سے مناظرہ کروں اس لیے آپ اپنے میں سے سب سے زیادہ علم رکھنے والے شخص کو مناظرہ کا معاملہ سپرد کر دیں تاکہ میں صرف ان سے مناظرہ کروں۔ انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا اس کے بعد امام ابوحنیفہ اور اس جماعت کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ یہ تھا:۔

"کیا یہ آپ لوگوں میں سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں؟

جماعت: ہاں۔

امام ابوحنیفہ:۔ کیا ان کے ساتھ مناظرہ آپ سب لوگوں سے مناظرہ تسلیم کیا جائے گا؟

جماعت:۔ ہاں۔

امام ابوحنیفہ:۔ ان پر جو الزام عائد ہوگا وہ آپ لوگوں پر بھی ہوگا۔

جماعت:۔ ہاں۔

امام ابوحنیفہ:۔ — گر میں ان سے مناظرہ کروں اور ان پر حجت قائم کر دوں تو وہ حجت آپ لوگوں پر بھی قائم ہو جائے گی؟

جماعت: ہاں:۔

امام ابوحنیفہ:۔ وہ حجت آپ پر کیوں قائم ہوگی؟

جماعت:۔ چونکہ ہم نے اس معاملے میں ان کو اپنا امام مان لیا ہے اس لیے جو قول ان کا ہوگا وہی ہمارا بھی ہوگا۔

امام ابوحنیفہ:۔ ٹھیک ہے تو اب یہ مناظرہ ختم ہوگیا۔ اس لیے کہ جب ہم نے نماز کے لیے کسی کو اپنا امام چن لیا تو اس کی قرات ہماری قرات بھی ہوگی اور وہ ہمارا نائب قرار پائے گا۔

یہ سنکر اس جماعت نے مناظرے میں امام ابوحنیفہ کی فتح کا اقرار کر لیا۔

دوسرا واقعہ امام رازیؒ نے دوسرا واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ایک دن امام ابوحنیفہ کو خلیفہ منصور عباسی نے اپنے دربار میں طلب کیا۔ اس کا وزیر ربیع امام صاحب کا مخالف تھا۔ اس نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔ یا امیرالمومنین! یہ آپ کے دادا (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما) کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے دادا استثنار منفصل کو جائز کہتے ہیں اور یہ اس کا انکار

کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک استثنار منفصل جائز نہیں ہے۔ یہ سن کر امام صاحب نے فرمایا۔ یہ ربیع اس بات کے قائل ہیں کہ لوگوں کی گردنوں میں آپ کی بیعت کا قلادہ نہیں ہے۔ (یعنی لوگ آپ کو دل سے امیرالمومنین تسلیم نہیں کرتے) منصور نے پوچھا یہ کیسے؟

امام صاحب نے فرمایا۔ یہ اس طرح کہ لوگ آپ کے سامنے آپ کی خلافت کا اقرار کرتے ہیں اور اپنے گھروں کو واپس جا کر ان شاء اللہ کہہ لیتے ہیں اور ان کا اقرار باطل ہو جاتا ہے۔ یہ سنکر منصور ہنس پڑا اور اس نے ربیع سے کہا۔ خبردار! تم ابوحنیفہ سے چھیڑ چھاڑ نہ کرو۔ جب امام صاحب باہر آئے تو ربیع نے کہا۔ آج تو آپ نے مجھے مروا ہی ڈالا تھا۔ امام ابوحنیفہ نے جواب دیا۔ مجھ پر حملے کی ابتدا تم نے کی تھی۔ میں نے تو صرف اپنی مدافعت کا فریضہ انجام دیا۔

نوٹ: فقہ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنے کسی اقرار یا طلاق وغیرہ کے معاملہ میں ان شاء اللہ کا جملہ کہہ دیا تو اس کے پہلے کہے ہوئے جملے کا حکم باطل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا۔ میں نے تجھے طلاق دی اِن شاء اللہ تو یہ طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ اِن شاء اللہ کہتے ہی اس کا پہلا جملہ "میں نے تجھے طلاق دی" باطل ہو جائے گا۔ فقہاء کے درمیان اختلاف یہ ہے کہ پہلا جملہ کب باطل ہوگا؟ ان شاء اللہ کو پہلے جملے سے ملا کر فوراً کہنے سے یا اس کو پہلے جملے سے الگ کر کے کچھ دیر رک کر کہنے سے بھی۔ ملا کر بلا تاخیر کہا جائے تو اس کو استثنار متصل کہتے ہیں اور کچھ دیر رک کر کہا جائے تو اس کو استثنار منفصل کہتے ہیں۔ امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ صرف استثنار متصل ہی موثر ہے منفصل استثنار سے حکم باطل نہ ہوگا اور حضرت عبداللہ بن عباس کا مسلک یہ ہے کہ استثنار منفصل بھی موثر ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو واضح کرنے کے لیے اسی قدر لکھنا کافی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ ان شاء اللہ سے کون سے احکام اور جملے باطل ہوتے ہیں اور کون سے باطل نہیں ہوتے یا اسی طرح کی دوسری تفصیلات فقہ کی کتابوں میں دیکھنی چاہییں۔

تیسرا واقعہ

رات کے وقت ایک شخص کے گھر میں چند چور داخل ہوئے اور اس کا سامان اکٹھا کرنے کے بعد ڈرا دھمکا کر اس شخص سے یہ قسم بھی کھلوائی کہ اگر تم نے کسی کو چوروں کے نام بتلائے تو تمہاری بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ دن کے وقت وہ شخص یہ دیکھ رہا تھا کہ چور اس کا سامان بیچ رہے ہیں لیکن اپنی قسم کی وجہ سے زبان کھولنے سے مجبور تھا وہ کسی کو ان چوروں کے نام نہیں بتا سکتا تھا آخر گھبرا کر امام ابوحنیفہ کے پاس پہنچا اور اپنی مشکل ان کے سامنے پیش کی۔ امام صاحب نے اس سے

کہا کہ اپنے محلے کے مسجد کے امام اور چند دوسرے معزز افراد کو میرے پاس لے آؤ۔ جب وہ لوگ آگئے تو انھوں نے ان سے کہا کیا آپ لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ اس شخص کو اس کا سامان مل جائے۔ انھوں نے کہا ہاں تب آپ نے یہ تدبیر بتائی کہ محلے کے لوگوں کو ایک گھر میں جمع کرو اور پھر ایک ایک کر کے ان کو باہر نکالو اور اس شخص سے پوچھو۔ کیا اس نے تیرے گھر میں چوری کی؟ جو چور نہ ہو اس کے بارے میں یہ شخص کہے کہ نہیں اس نے چوری نہیں کی اور جب چور باہر نکلے تو تمہارے سوال پر یہ شخص خاموش رہے جس جس کے بارے میں یہ جواب نہ دے اس کو پکڑ لو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام چور پکڑ لیے گئے اس شخص کو اس کا سامان بھی واپس مل گیا اور اس کی قسم بھی نہ ٹوٹی۔

چوتھا واقعہ امام ابوحنیفہ کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص نے یہ قسم کھائی کہ ماہ رمضان میں دن کے وقت اپنی بیوی سے جماع کرے گا۔ اس قسم کے بعد وہ پریشان ہوا لیکن کسی فقیہ کی سمجھ میں اس کا جواب نہ آیا۔ جب امام ابوحنیفہ سے اس مشکل کا ذکر آیا تو آپ نے فوراً کہا اس سے کہو کہ وہ بیوی کو لے کر سفر کرے اور مسافرت میں اپنی قسم پوری کرلے (سفر میں رمضان کا روزہ ترک کرنے کی رخصت ہے اس لیے اس کو اپنی قسم پر عمل کرنے کا موقع مل جائے گا)

امام شافعیؒ کی حاضر جوابی اور ذہانت

ہارون الرشید کے دربار میں ایک معتزلی نے امام شافعی سے کہا: آپ کسی مسئلے پر اجماع کا دعویٰ کس طرح کرتے ہیں جب کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی ایک چیز پر تمام اہل مشرق واہل مغرب کے اتفاق کا علم ہو سکے۔ امام شافعیؒ نے خلیفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا کیا تمہیں اس کا علم ہے کہ ان کی خلافت پر تمام لوگوں پر اتفاق ہے؟ ڈر کے مارے اس معتزلی کو اس کا اقرار کرنا پڑا اور اس کا منہ بند ہوگیا۔

فرزدق کی ذہانت

عربی کے مشہور شاعر فرزدق نے کسی کی ہجو میں یہ شعر کہا

لقد ضاع شعری علی بابکم کما ضاع دُرّ علی خالصہ

(ترجمہ) تمہاری مدح میں میرا شعر ضائع ہوا جس طرح موتی خالصہ کے جسم پر
خالصہ، اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی محبوبہ اور بڑی ادیبہ و ظریف تھی۔ جب اس نے فرزدق کا یہ شعر سنا تو اسے سخت ناگوار ہوا اور اس نے سلیمان سے فرزدق کی شکایت کی سلیمان نے حکم دیا کہ اس کو زنجیروں میں جکڑ کر حاضر دربار کیا جائے۔ وہ جب لرزتا کانپتا دربار میں حاضر ہوا تو خلیفہ نے اس سے پوچھا کیا یہ شعر تم نے کہا ہے؟ فرزدق نے جواب دیا: میں نے یہ شعر اس طرح نہیں کہا تھا میرے دشمن نے اس میں تحریف کر کے آپ تک پہنچایا ہے۔ یہ گفتگو پردے کے پیچھے خالصہ سن رہی تھی۔ فرزدق نے کہا یہ شعر میں نے یوں کہا تھا۔

لقد ضاء شعری علی بابکم　　کما ضاء در علی خالصہ

تمہاری مدح میں میرا شعر چمک اٹھا جس طرح موتی خالصہ کی گردن میں چمک اٹھتا ہے
یہ سن کر خالصہ خوشی کے مارے اچھل پڑی اور اتنی بے قابو ہوئی کہ باہر نکل آئی اور اس کے جسم پر جو زیورات تھے وہ سب اس نے فرزدق کو دیدیے۔ ان زیورات کی قیمت دس ہزار درہم تھی۔ جب وہ زیورات لے کر دربار سے باہر آیا تو سلیمان نے اس کے پیچھے اپنے ایک افسر کو بھیجا اور اس نے وہ زیورات فرزدق سے ایک لاکھ درہم میں خرید لیے اور اس طرح خلیفہ نے وہ زیورات پھر خالصہ تک پہنچا دیے۔
نوٹ:۔ یہ واقعات امام رازی نے علم وفہم کی فضیلت پر دلائل دیتے ہوئے اپنی تفسیر کبیر میں نقل کیے ہیں اور ہم ان کے ترجمے قارئین زندگی کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

(ادارۂ زندگی)

اشاعت قرآن

(جناب محمد عبداللہ منہاس)

تراجم قرآن مشرقی زبانوں میں

ابتدا میں مسلمانوں کی یہی کوشش اور خواہش رہی کہ قرآن دنیا میں اپنی اصلی زبان یعنی عربی میں رائج ہو۔ اور اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والی قومیں اسے عربی ہی میں پڑھیں۔ یہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ جب موحدین کی سلطنت کے زمانے (۵۲۴ھ تا ۶۶۷ھ) میں جوالجزائر سے اندلس تک پھیلی ہوئی تھی۔ قرآن کا ترجمہ بربری زبان میں کیا گیا۔ تو علماء نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس کو ناجائز قرار دیا حتے کہ اس ترجمے کا نشان بھی نہیں رہنے دیا۔

ہندوستان میں قرآن کریم کا ترجمہ سب سے اول شاہ ولی اللہؒ نے فارسی زبان میں 'فتح الرحمٰن' کے نام سے کیا جس کا ایک قلمی نسخہ مکتبہ مشرقیہ دارالعلوم اسلامیہ پشاور میں موجود ہے اور متعدد مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اس زمانے کے علماء نے ان کی بھی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور مسجد فتح پوری (دہلی) میں ان کے قتل کے منصوبے سوچنے لگے مگر رفتہ رفتہ یہ تعصب کم ہو گیا۔ اور اب ہر زبان میں ترجمے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن فارسی زبان میں قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ وہ ہے جو شیخ سعدی شیرازیؒ نے کیا۔ اس کے بعد اس زبان میں قرآن کے متعدد ترجمے شائع ہوئے۔

برونٹ نے اپنی تالیف میں ایک اور فارسی ترجمے کا ذکر کیا ہے جو اصفہان میں چھپا تھا۔ دہلی کے فاروقی پریس نے ۱۲۱۵ھ میں متعدد زبانوں میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا' اور اسے قرآن مجید ترجمۂ الثلثہ کے نام سے موسوم کیا۔ تمہید اردو زبان میں ہے اور اصل قرآن کی ترتیب اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اول سطر میں عربی زبان' اس کے بعد دوسری سطر میں اس کا ترجمہ فارسی زبان میں' تیسری سطر میں لفظی اردو ترجمہ اور چوتھی سطر میں سلیس و بامحاورہ ترجمہ ہے۔ فارسی ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ہے۔ متن کے علاوہ

حاشیہ پر قرآنی مطالب کی توضیح اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کی گئی ہے۔ قرآن کے اور فارسی ترجمے بھی موجود ہیں، جن میں متن کی شرح حواشی میں کی گئی ہے۔ قرآن کا ایک ترجمہ ریورنڈ ڈاکٹر امام الدین امرتسری نے کیا تھا۔ یہ پہلا اردو ترجمہ ہے جو رومن اردو میں شائع ہوا۔ کرسچن مشن پریس الہ آباد سے اسے طبع کرا کر ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے مقاصد کے لیے اشاعت دی۔

قرآن کریم کے جو ترجمے اردو میں کیے گئے ان میں مولانا شاہ عبدالقادرؒ ابن شاہ ولی اللہ کا ترجمہ موضح القرآن مطبوعہ ۱۷۹۰ء اولین بہترین اردو ترجمہ ہونے کا امتیاز رکھتا ہے۔ عربی متن کے تحت اردو کا ترجمہ دیا ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشنوں میں ایک ایڈیشن جو دو جلدوں پر مشتمل ہے ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں ہگلی میں شائع کیا گیا اور ایک ایڈیشن جس میں فارسی ترجمہ بھی شامل ہے۔ ۱۸۳۱ء میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت مستند، مقبول عام اور تمام اردو تراجم کا ماخذ ہے۔ اردو زبان میں دوسرا ترجمہ شاہ ولی اللہؒ کے فرزند اکبر مولانا شاہ رفیع الدینؒ نے کیا مگر وہ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

اسی زمانے کے لگ بھگ سید شاہ حقانی نبیرہ شاہ برکت اللہ مارہرویؒ نے ایک اردو ترجمہ تفسیر کیا دلی کے نامور طبیب حکیم محمد شریف خاں مرحوم کا کیا ہوا قلمی ترجمہ حکیم محمد احمد خاں دہلوی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں جن میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب (مرحوم) اور مولوی فتح محمد صاحب جالندھری (مرحوم) کے ترجموں کو خاص وقعت حاصل ہے۔ اول الذکر ترجمہ میں بہت سے ایسے محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔ جن سے عام اردو داں ناواقف ہیں۔ موخرالذکر ترجمہ نہایت صاف سلیس اور شستہ ہے۔

سیٹھ یعقوب حسن صاحب نے زنداں میں بیٹھ کر قرآن مجید کی ایک ہی مضمون کی ان تمام آیتوں کو جو مختلف مقامات اور سورتوں میں آئی ہیں، یک جا کر کے ان کا ترجمہ بھی اردو میں بالمقابل دیا ہے۔ ترجمہ بڑی کدوکاوش اور غایت درجے کی احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے

یہ بات عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ بیضاوی کی تفسیر قرآن کا ترجمہ ملایا کی زبان میں مع اصل عربی کے شائع کیا گیا ہے۔

اس تفسیر کے دو تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں سارا دیہ ڈچ ایسٹ افریقہ میں کثرت سے فروخت ہوتا ہے

زیمر کے قول کے مطابق قرآن کا ترجمہ پشتو میں بھی ہو چکا ہے۔ گجراتی زبان میں قرآن کا ترجمہ حاجی غلام علی حاجی اسمٰعیل رحمانی ایڈیٹر "راہ نجات" بھاؤنگر نے اس طریق پر کیا ہے کہ ایک صفحہ پر اصل عربی اس کے سامنے وہی آیتیں گجراتی حروف میں اور اس کے تحت میں گجراتی ترجمہ درج ہے۔ ہندی میں قرآن کا پہلا ترجمہ الور کے راجہ ہر سنگھ نے ایک عراقی عالم سے [illegible] میں کرانا شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ سورۂ یٰسین تک مکمل ہوا تھا۔ راجہ اس ترجمے کو سنکر دل سے مسلمان ہو گیا تھا۔ ہندی زبان میں ایک ترجمہ ریورنڈ ڈاکٹر احمد شاہ مشنری مشن میر پور نے شائع کیا۔ زبان محاورہ بیان کی جاتی ہے۔ ایک ہندی ترجمہ چھپا ہے جو خواجہ حسن نظامی [illegible] نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع کلاں میں شائع ہوا ہے۔ ایک صفحہ میں پہلے حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قلمی قرآن مجید کا ایک صفحہ ہے اور اس کے سامنے ہندی حروف میں اردو ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا ہے۔ اس کے بعد پورے صفحہ میں [illegible] اور ہندی زبان میں تفسیر ہے۔ کل حجم [illegible] صفحات کے قریب ہے۔ یہ ترجمہ چار سال میں پانچ سنسکرت دان عالموں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ ایک اور ہندی ترجمہ شیخ محمد یوسف ایڈیٹر اخبار "نور" نے شائع کیا ہے۔ وہ اس سے پہلے گورمکھی ترجمہ بھی شائع کر چکے ہیں۔ گورمکھی ترجمہ میں حضور سرور کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ بھی شامل ہے۔ یہ ہر دو تراجم ہندوؤں اور سکھوں کے مذاق کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔

فرانس کے رسالہ "ریویو دو موند مزلمان" کی جلد چہارم صفحہ ۳۴۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا ترجمہ تامل [illegible] زبان میں بھی شائع کیا گیا ہے

اس جلد کے صفحہ [illegible] میں ایم ایف فرجانلی اور ایم ایل ہوٹ نے ایک تفسیر کی پوری کیفیت بیان کی ہے جو چینی زبان میں چھاپی گئی ہے۔ چینی ترجمہ عربی متن کے بعد دیا گیا ہے اور اس کے بعد مطالب کی تشریح کی گئی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ عربی متن کا ترجمہ فی نفسہٖ نہیں دیا گیا بلکہ صرف تفسیر کی گئی ہے۔ ایک عربی جملے کے بعد چینی زبان میں اس کا مطلب واضح کیا گیا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد آیات قرآنی کو عامۃ الناس کی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

۱۹۲۷ء میں ایک غیر مسلم چینی نے راڈویل کے انگریزی قرآن کو چینی لباس پہنایا جو بالکل غلط تھا علماء نے مسلمانوں کو اس کے خریدنے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد چھ سال کا عرصہ ہوا شنگھائی میں

کسی یہودی نے خود چینی زبان میں ترجمہ کیا جس میں مرزا محمد علی لاہوری کے انگریزی ترجمے سے مدد لی گئی علمائے حق نے اسے بھی ناپسند کیا۔ آخر ۱۹۳۳ء میں جدید چینی ترجمہ قرآن۔ چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے مترجم وو جید عالم اور دیگر مسلم اور غیر مسلم چینی کتابت کے ماہر ہیں۔ ان ہر دو عالموں میں سے ایک جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ترجمے میں عربی متن نہیں ہے، آیات پر نمبر دیے گئے ہیں۔ ہر آیت کا لفظی ترجمہ پہلے جلی عبارت میں ہے۔ اس کے بعد اسی آیت کی سلیس عبارت یا ایک دو سطری تفسیر مسلسل مضمون سمجھنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس کے بعد پھر ویسے ہی دوسری تیسری آیت۔ یہ ترجمہ تمام ملک میں مقبول ہوا ہے اور یہ پہلا چینی ترجمہ قرآن ہے جو چینی مسلمانوں نے شائع کیا ہے۔

۱۹۲۱ء میں منتخبات قرآن مع ترجمہ ایک دیدہ زیب مجلہ کی صورت میں پیکن سے شائع کیے گئے۔

جاپانی زبان میں سب سے پہلے ترجمہ قرآن کی سعادت شیخ عبدالرحیم ابراہیم کے حصہ میں آئی ہے جو جاپانی علماء کی مدد سے اس ترجمے کو مکمل کر رہے ہیں۔

جاوی زبان میں قرآن کا ترجمہ سمارنگ ڈکری این بوکھنڈل (بٹیویا) نے ۱۹۱۳ء میں سو [illegible] حصوں میں شائع کیا تھا۔ اس کی طباعت اور عربی متن غیر معمولی طور پر نفیس ہے۔ جاوی زبان میں جو [illegible] حاشیے دیے گئے ہیں وہ خاص متن کے متعلق ہیں تشریحی نہیں ہیں

یہ ترجمہ مسٹر [illegible] نے جو [illegible] سلطان ترکی کا خادم [illegible] تھا، کیا تھا [illegible] ایک [illegible] کیتھولک مذہب اختیار کر [illegible] سلطان [illegible] زہر [illegible] مذہب یہ ترجمہ دکھایا گیا تو انھوں نے [illegible]

[illegible] زبان میں قرآن [illegible] ترجمہ [illegible] نام [illegible] اور اسے پچاس ہزار کی لاگت سے [illegible] تقسیم کیا [illegible] زبان میں ایک [illegible] ترجمہ [illegible] نے مسلم مشنری [illegible] جمعیۃ العلماء بہار [illegible] پاروں کی صورت میں [illegible]

[illegible] زبان میں [illegible] ایک [illegible] قرآن کا بھی [illegible] کیا ہے۔

۱۹۲۰ء میں [illegible] نے [illegible]

قرآن کا [illegible]

[illegible]

ہز اگزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ شہریار دکن نے مترجم کو ایک گراں قدر انعام مرحمت فرمایا۔ ترجمہ کی کئی سو جلدیں قطر و نظام کے مرہٹی مدرسوں کے لیے خریدی گئیں اور مترجم کے لیے ماہانہ منصب تاحیات مقرر رہا۔

مسٹر نرائن راؤ ایم اے ایل ٹی نے جو راج مندری ضلع گوداوری کے گورنمنٹ آرٹس کالج میں تلیگو و سنسکرت کے لکچرار ہیں، قرآن کریم کا ترجمہ تلیگو زبان میں کیا ہے۔ انھوں نے مرزا محمد علی صاحب ایم اے ــــــ لاہور کے انگریزی ترجمے سے مدد لی ہے

مدراس کے ایک اور مرہٹہ بزرگ مسٹر ونکٹا رتن (۶۶ ہائی روڈ اگمور مدراس) نے مولوی محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ قرآن سے تلیگو میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے۔ مسٹر موصوف لکھتے ہیں کہ "ترجمہ میں سیل، راڈویل، پامر اور نیز مرزا افضل الہ آبادی اور ڈاکٹر حکیم خاں کرنالی کے ترجموں سے مدد لی گئی ہے۔

مسٹر ایس این کرشن راؤ بی اے نے جو ریاست کوچین واقع جنوبی ہند کے ملیالم زبان کے ایک ماہواری رسالہ "سدگرو" کے ایڈیٹر ہیں، قرآن کا ترجمہ ملیالم زبان میں کیا ہے۔ دار الاشاعت بنگلور سٹی نے قرآن کا ترجمہ کناری زبان میں کیا ہے۔ جو جنوبی ہند کی عام زبان ہے۔

سلطان عبد الحمید مرحوم کے عہد حکومت میں ترکی زبان میں اگرچہ قرآن کے کثیر التعداد تراجم شائع نہیں ہوئے تاہم عربی متن کے ساتھ ترکی زبان میں تفسیریں اکثر شائع ہوئی ہیں۔ اس قسم کا ایک خوب صورت قرآن ۱۳۰۴ھ میں قسطنطنیہ کے بخاریہ پریس سے شائع ہوا تھا۔ دستوری حکومت کے اعلان کے بعد کئی مصنفوں نے مشترکہ طور پر قرآن کا ترجمہ ترکی زبان میں کرنا شروع کیا جس کی قدیم خیالات کے لوگوں نے مخالفت کی۔ تقریباً تئیس برس کا زمانہ ہوا کہ سب سے اول ابراہیم حلیمی کی طرف سے قرآن کا ایک ترجمہ "ترجمۃ القرآن" کے نام سے شائع ہوا۔ ایک اور ترجمہ ترکی کے ایک اور پانزدہ روزہ رسالہ "اسلام مجموعہ سی" میں چھپا۔ یہ رسالہ زیر ادارت حلیم ثابت نکلتا ہے۔

ترکی میں جدید طرز حکومت کے ظہور نے قرآن کریم کے صحیح ترجمے کے امکان کو آسان بنا دیا ہے۔ ترکی میں اس سے پہلے جس قدر تراجم شائع ہوئے وہ ناکافی، ناقص اور نا تمام تھے۔ اب محکمہ معارف کے زیر ادارت ایک مکمل ترجمہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں قرآن کی اصل عبارت اور ترکی ترجمہ دونوں شامل ہیں ترجمہ مختصر ہے۔ حاشیہ پر ضروری علمی اور فقہی تشریحات ہیں۔ حکومت ترکی نے مشہور ترکی شاعر محمد عاکف

کو اس خدمت پر مامور کیا جو ترکی کے "اقبال" ہیں۔ ترجمہ ترکی علماء کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہوا جس نے آخری فیصلہ صادر کیا۔

احمدی آفندی آغا ئف اخبار "جون ترک" میں رقمطراز ہیں کہ "مذہبی اصلاح کے لیے ان تراجم کی واقع میں ضرورت ہے اور صرف اسی ذریعہ سے اسلام کی صداقتیں عوام تک پہنچائی جا سکتی ہیں۔

مشرقی افریقہ کی سواحلی زبان میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ عیسائیوں نے شائع کیا۔ یہ ترجمہ نہیں بلکہ اسلام پر ایک معاندانہ تنقید ہے اس لیے قرآن مجید کا ایک ترجمہ انجمن اسلامیہ کی طرف سے نیروبی میں ہوا ہے۔ اور دوسرا ترجمہ زنجبار میں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں ترجمے عیسائیوں کی کوششوں کو باطل کرنے میں مدد دیں گے۔

اور شلیم کی عبرانی یونیورسٹی کے زیر نگرانی ڈاکٹر جوزف ریولن قرآن کا ترجمہ عبرانی زبان میں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف عربی اور عبرانی دونوں زبانوں کے ماہر ہیں اور ان کی محنت تجسس اور احتیاط کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن کی پہلی چار سورتوں کے ترجمے میں انھوں نے بیس سال کا زمانہ صرف کیا ہے۔

حکومت مصر نے ایک خاص ادارہ قرآن کریم کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں کرنے کی غرض سے قائم کیا ہے۔ اس امر کے پیش نظر کہ مصری علماء ترجمے سے قرآن پاک کے ترجمہ ہی کے خلاف تھے، حکومت مصر کے نقطۂ نگاہ میں یہ تغیر نہایت خوش گوار ہے اور اس سے قرآن کریم کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔

قرآن میں ایک وسیع قوت موجود ہے

یہ زیادہ تر قرآن ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ایک بے آب و علف جزیرہ نما کے باشندے جن کے افلاس کی برابری صرف ان کی جہالت ہی کر سکتی تھی، نہ صرف نئے مذہب کے پر جوش اور سچے پیرو بن گئے، بلکہ حضرت عمرؓ اور بہت سے اور لوگوں کی طرح اس کے بزور شمشیر پھیلانے والے ہو گئے۔ وہ لوگ مملکتوں کے بانی، شہروں کے آباد کنندہ اور جتنے کتب خانے انھوں نے خراب کیے تھے ان سے زیادہ کتب خانوں کے جمع کرنے والے ہو گئے۔ فسطاط، بغداد، قرطبہ اور دہلی کو وہ قوت حاصل ہوئی کہ عیسائی یورپ کو کپکپا دیا اور اس طرح سے قرآن جس میں یہ وسیع قوت پائی جاتی ہے اور جس میں ایسے اصول ہیں کہ جو اس قوت کے

تہذیب کا منبع ہیں، اس قابل ہے کہ اس کی قدر ہمیشہ بہ لحاظ ایک مجموعہ قوانین اور سلسلہ تعلیم مذہبی کے ان تبدیلیوں کے اندازہ سے ہونی چاہیے جو اس نے ان لوگوں کی عادات و اعتقادات میں کیں، جنھوں نے اس کو طوعاً خواہ کرہاً قبول کیا۔

قرآن ہمیشہ مسلمانوں کا ملجا و ماوٰی رہا ہے

پروفیسر اڈورڈ مونٹے اپنی تالیف عیسائی مذہب کی اشاعت اور اس کے مخالف مسلمان مطبوعہ پیرس ۱۸۹۰ء میں لکھتے ہیں :۔

اگر لفظی و تاریخی اعتبار سے شائستگی و معقولیت کے معانی کو بہت زیادہ وقعت دی جائے تو اسلام یقیناً ایک معقول مذہب ہے۔ اس قاعدے کے مطابق جو دلائل کی رو سے قائم کردہ اصولوں پر مذہبی اعتقادات کی بنیاد رکھتا ہے۔ اسلام پر "معقولیت" کی تعریف ہو بہو صادق آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ (حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پیکر ذوق و سیل جذبہ تھے اور حضور کا آئینۂ قلب جوش ایمان کی ضیا اور یقین کامل کے لمعات سے روشن تھا۔ آں حضرت نے اس بیش بہا وصف کی جلوہ باریوں سے اپنے کثیر تعداد پیروؤں کے سینوں کو منور کر دیا۔ حضور نے اپنے اس آئین اصلاح کو الہام کے طور پر دنیا کے پیش کیا لیکن اس قسم کا الہام ایک قسم کا کشف ہے۔ حضور کا مذہب تمام کا تمام ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو معقولیت کے امور مسلمہ پر مبنی ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک عقیدۂ اسلام کو مجملاً یوں بیان کیا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کا رسول برحق ہے اور ہم جب ٹھنڈے دل سے حضور کی تعلیم و اصول پر نہایت دقت نظر سے غور کرتے ہیں۔ اس مذہب کے عقیدے کو مختصراً ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں "توحید و رسالت کا یقین" اور خدا و عاقبت کا ایمان" یہ دو اصول جو مذہبی عقیدے کی اساس اور مذہبی افراد کے نزدیک استدلال و معقولیت کے سنگ بنیاد پر قائم ہیں۔ قرآن کریم کی مقدس تعلیم کا لب لباب ہیں۔ اس تعلیم کی سادگی اور صفائی فی الواقع وہ زبردست قوتیں ہیں جو مذہب اسلام اور اس کی تبلیغ و ترقی میں برابر عمل کر رہی ہیں لیکن پیغمبر عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقدس تعلیم و تلقین کے پھیلنے میں عالمگیر ترقی کے باوجود قرآن کریم مسلمانوں کا ہمیشہ ملجا و ماویٰ رہا ہے اور رہے وہ کتاب جس میں [illegible] کا مت [illegible] اور [illegible] جلال [illegible] اور کمال تیقن کے ساتھ [illegible]

[illegible]

ایسا مکمل، روحانیت کی تمام پیچیدگیوں سے اس قدر مبرا اور ایسا آسان ہو کہ ہر شخص اس کے مسائل فوراً سمجھ سکتا ہو۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس میں لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کی معجزانہ طاقت ہوگی اور حقیقتاً اسلام میں ایسی طاقت موجود ہے۔

قرآن پر عمل کرنے سے سارے جہان کی حکمرانی مل سکتی ہے

موسیو لیون روشن فرانسیسی حکومت کے ایک معتمد کارندے اور جاسوس کی سطور ذیل خاص طور پر قابل غور ہیں۔ موسیو موصوف کو حکومت فرانس نے امیر عبدالقادر الجزائری پر جاسوس مقرر کیا اور یہ بھی اشارہ کر دیا تھا کہ اس کے پاس بظاہر مسلمان بن کر رہے اور کوئی ایسی سبیل نکالے کہ اس پر اس کا پورا پورا اعتماد جم جائے۔ اس نے ایسا کیا اور کامیاب ہوا اور مسلمانوں کے ملک میں تیس برس اقامت رکھی۔ اس اثنا میں عربی زبان اور اس کے فنون اسلام اور اس کے علوم کی تعلیم حاصل کی اور الجزائر تونس، مصر، حجاز اور قسطنطنیہ جیسے عظیم الشان اسلامی ملکوں کے حالات اچھی طرح معلوم کیے۔ پھر ایک کتاب لکھی جس کا نام "اسلام میں تیس سال" ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے:-

"میں طویل زمانے تک اسلام کو اس واسطے گلے سے لگائے رہا کہ امیر عبدالقادر کو حکومت فرانس کی کسی چال میں پھنسا لوں۔ میں اس حیلے میں کامیاب ہوا اور امیر نے پورے وثوق کے ساتھ مجھ کو اپنا سکریٹری بنا لیا۔ میں نے اس دین کو جس کو ہم میں بہت لوگ معیوب کہتے ہیں۔ جہاں تک میرا عرفان ہے، ہر دین سے افضل دیکھا۔ یہ ایک انسانی طبیعی اقتصادی اور ادبی دین ہے۔ ہمارے قانون وضعیہ میں کوئی ایسا قانون مجھ کو یاد نہیں ہے جو قرآن میں مشروح موجود نہ ہو۔ میں نے اس قانون کی طرف بھی رجوع کیا جس کو سیمون "شریعت طبیعیہ" کہتا ہے تو اس کو بھی ایسا ہی پایا کہ گویا سرسبر قرآن کی شریعت اسلامی سے ماخوذ ہے۔ پھر میں نے یہ دریافت کیا کہ مسلمانوں کے نفوس میں اس دین کی تاثیر کیا ہے تو دیکھا کہ اس نے ان کو شجاعت و شہامت، حلم و خاکساری اور جمال و کرم سے بھرپور کر رکھا ہے۔ بلکہ میں نے ان کو بھلائی، مہربانی اور احسان میں ان نفوس کے نمونے پر پایا جن کا تصور فلسفی لوگ کسی ایسے عالم میں کیا کرتے ہیں جو شرارت، بیہودگی اور ناراستی سے ناآشنا سمجھا جاتا ہے۔

پس مسلمان ایک ایسا سادہ مسلمان ہے جو کسی سے بدگمانی نہیں کرتا۔ پھر روزی کی طلب میں کسی حرام

حلال نہیں سمجھا کرتا۔ اسی لیے وہ اسرائیلیوں اور بعض مسیحیوں سے مال و دولت میں کمتر رہتا ہے۔

میں نے اسلام میں دو ایسے اجتماعی مسئلوں کا حل دریافت کیا ہے جنھوں نے سارے جہان کو مشغول کر رکھا ہے

(۱) پہلا قرآن کے اس قول میں ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ایمان دار بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ یہ اشتراکیت کا بہترین قاعدہ ہے۔

(۲) دوسرا زکوٰۃ کے ہر مال دار پر فرض ہونے اور مفلسوں کو (اگر مال دار بہ رغبت ادا نہ کریں) تو زبردستی اس کے وصول کر لینے کا حق بخش دینے میں (یعنی مسلمان حاکم کی وساطت سے) یہ فوضویت یعنی بر چھا گردی کا درمان ہے۔

اسلام محامد و فضائل کا دین ہے۔ اگر اس کو کہیں ایسے اشخاص مل جاتے جو لوگوں کو جیسی کہ چاہیے اس کی تعلیم دیتے اور اس کی پوری پوری تفسیر کرتے، تو مسلمان آج سارے جہان سے اچھے اور ہر میدان میں اسبق ہوتے لیکن ان کے درمیان ایسے شیوخ پیدا ہو گئے ہیں جو اس کے کلمات کو تحریف، اس کے جمال کو مسخ اور اس میں نئی نئی باتیں شامل کر رہے ہیں۔ میں قیروان، اسکندریا اور مکہ میں ایسے ایسے کئی مولویوں اور مرشدوں کو بہکانے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ ان لوگوں نے الجزائر کے مسلمانوں کو اس مضمون کے فتوے لکھ لکھ کر بھیجے کہ ان پر فرانسیسیوں کی اطاعت واجب اور ان کے برخلاف شورش کرنا حرام ہے اور یہ بھی لکھا کہ فرانسیسی حکومت خلق کے لیے خدائے پاک کی بہترین نعمت ہے اور اس مطلب کو نکالنے کے لیے مجھ کو اس سے زیادہ کوئی کلفت نہیں ہوئی کہ چند سونے کے برتن نذر کرنے پڑے۔

قرآن ضرور الہامی کتاب ہے ریو نڈر آر ریکسویل کنگ اپنی تقریر "دین اسلام" میں جو ۱۷ جنوری ۱۹۱۵ء کو قدیم پرسبی ٹیرین چرچ نیو ٹورنا راونز میں کی گئی، فرماتے ہیں:۔

"اسلام کی آسمانی کتاب قرآن ہے۔ جو (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کے الہامات کا مجموعہ ہے۔ اس میں نہ صرف مذہب اسلام کے اصول و قوانین مندرج ہیں بلکہ اخلاق کی تعلیم روزمرہ کے کاروبار کے متعلق ہدایات اور تمدن بھی ہیں۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کو عیسائیوں پر فوقیت ہے کہ اسلام کی مذہبی تعلیم و تمدن علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔"

قرآن نے یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے مذاہب پر پوری پوری روشنی ڈالی ہے۔

جس طرح خدا نے یہودیوں کی تورات سے عیسائیوں کی انجیل سے رہنمائی کی اسی طرح مسلمانوں کو قرآن سے صراط مستقیم دکھائی۔

مذہب اسلام کی بنا جمہوریت پر ہے۔ وہ تمام بنی نوع بشر کو برابر سمجھتا ہے اور انسانی روح کو اس ذات پاک سے اور بھی پیوستہ کرتا ہے جس سے وہ آگے ہی گہرا تعلق رکھتی ہے نیز جو اس کا منبع ہے۔

اسلام کی جمہوری تعلیم میں ایک حصہ عورتوں کے متعلق بھی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں عورتوں کا ذکر آیا ہے تعظیمی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ماں کے ساتھ محبت رکھنے اور اس کی تعظیم کرنے اور بیوی کے ساتھ محبت و شفقت کرنے پر پورا زور دیا ہے۔

پیروان اسلام کا حسن اخلاق قابل تعریف ہے۔ ان کا طرز عمل خدا کے احکام کے تابع ہے تسلیم و رضا یعنی اپنے تمام امور خدا کے سپرد کر دینا مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی ایک لازمی شرط ہے۔

جو مذہب رضائے الٰہی پر راضی رہنے کی ایسی عمدہ تعلیم دے اس کے پیرو یقیناً صداقت دوست اور انصاف پسند، دادو ستد کے کھرے اور عہد کے پکے ہوں گے۔ یہ قرآن سے ثابت ہو سکتا ہے اگر ہم اس کے برخلاف ثابت کرنا چاہیں تو ہماری اپنی عقل ہی انکار کر دے گی

اکثر کہا جاتا ہے کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب توریت اور انجیل وغیرہ سے لیا گیا ہے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ اگر الہامی دنیا میں الہام کوئی شے ہے اور الہام کا وجود ممکن ہے تو قرآن شریف ضرور الہامی کتاب ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ سچے نبی نہ تھے اور قرآن ان کی ذاتی تصنیف ہے۔ اگر یہ ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کتاب کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اپنے کو خود ہی ملامت کرتے اور پھر اس سرزنش کو قرآن میں رہنے بھی دیتے۔

قرآن کا نزول ضرور وحی الٰہی سے ہوا ہے

ڈاکٹر معزینیہ سابق ممبر مجلس شوریٰ فرانس نے استاد محمود بک عالم سے اپنے قبول اسلام کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

"میں ایام شباب میں بحری طبیب تھا اور ہمیشہ جہازوں میں ارد سما کے مابین دن گزارتا تھا۔ ایک دفعہ مجھ کو قرآن کا ایک نسخہ موسیو ساقاری کے قلم سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہوا دستیاب ہوا۔ اس میں میں نے سورۂ نور کی ایک آیت کا ترجمہ پڑھا جس میں یہ ذکر تھا کہ وہ اپنے انکار کی حالت میں اسی طرح دیوانہ وار

ہاتھ پاؤں مارتا ہے جیسے کہ ڈوبنے والا جاڑوں کے دن جب کہ گھٹا ٹوپ بادل چھا رہا ہو، لہروں کی تاریکیوں میں بیہودہ تگ و دو کرتا ہے اور وہ آیت یہ تھی ۔

(ترجمہ) "یا جیسے کہ تاریکیاں کسی گہرے سمندر میں، جس کو ڈھانپے ہوئے ہو ایک لہر اس کے اوپر سے ایک اور لہرا اور اس کے اوپر سے بادل تاریکیاں بھی کیسی کہ ایک کے اوپر دوسری، جب وہ اپنا ہاتھ نکالے تو اس کو کچھ دکھائی دیتا نظر نہ آئے اور وہ شخص جس کے لیے اللہ کوئی روشنی نہ کرے اس کے لیے کچھ روشنی نہ ہوگی ۔

جس زمانے میں یہ آیت میں نے پڑھی تھی ابھی ہدایت اسلام سے مشرف نہ ہوا تھا اور نہ مجھے مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ حال معلوم تھا ۔ ہاں اس سے میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ضرور کوئی ایسا شخص ہے جس نے اپنی ساری زندگی سمندروں میں گزاری ہے ۔ لیکن باوجود اس کے بھی مجھے حیرت تھی کہ کسی شخص سے یہ کیسے ممکن ہے کہ گمراہیوں کی آوارگی کا ایسا مختصر حال بیان کر دے جس کے تھوڑے سے لفظوں میں سمندروں کے تمام خطرات اور طبعی حالات اس جامعیت کے ساتھ آ جائیں گویا ان کو انسان اپنے حواس سے مشاہدہ کر رہا ہے اور پھر اس اسلوب سے کہ سمندروں کے خطرات کا کوئی بلیغ ترین ماہر بھی اس طرح بیان نہ کر سکے ۔

پھر جب اس کے بعد مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی سمندر پر سواری نہیں کی اور علاوہ بریں وہ امی بھی تھے تو میں نے قرآن کو پھر ہاتھ میں لیا اور سورۂ نور اور اس کتاب کی باقی آیتوں میں خوب غور کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کسی بشر کا کلام تو ہو نہیں سکتا ۔ ضرور اللہ تعالےٰ کی وحی ہی سے اس کا نزول ہوا ہے ۔ پس میں مسلمان ہو گیا اور ہمیشہ اس اسلام پر فخر کرتا رہوں گا جو میری نگاہ میں ایک معقول فطری دین ہے اور جو تثلیث دیگر مذاہب میں بت پرستی کی باقی ہیں ان سب سے پاک ۔

قرآن ایک عظیم الشان ملکی اور تمدنی نظام پیش کرتا ہے

موسیو ادجین کلافل نامور فرانسیسی مستشرق جنہوں نے یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے مذہبی مسائل و عقائد کی تحقیق و تدقیق میں اپنی تمام عمر صرف کر دی ۔ اپنے ایک مضمون کے تحت میں جو ۱۹۰۱ء میں فرانسیسی اخبارات میں شائع ہوا رقمطراز ہیں :-

قرآن مذہبی مسائل و عقائد ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اجتماعی (سوشل) احکام بھی ہیں۔ جو نوع انسان کے لیے زندگی کی ہر حالت میں مفید ہیں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے تمدن کے قوانین۔ جرائم اور ان کی سزاؤں کے قوانین اور وہ قوانین جن میں دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان تعلق کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حفظان صحت کے قوانین بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اس نظام کو جس کا دائرہ وسیع ہے، دنیا کی تمام قوموں کے درمیان پھیلانا چاہتے تھے، بلکہ ان کو مجبور کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس نظام کو قبول کریں پس ان کا مقصد اعظم تھا کہ مسلمانوں کو مادی ترقی کا بلند ترین درجہ حاصل ہو۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے قومی اتفاق کا مسئلہ جو آج کل یورپ میں زیر بحث ہے کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ مذہب اسلام کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی گئی ہے اور اس کی غرض ہی یہ ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں اسلام کے علم کے نیچے جمع ہوں۔ مسلمانوں کے اتفاق کا مسئلہ سلافی اور جرمن اقوام کے خیالات سے بالکل مختلف ہے اور دونوں کی ایک غرض نہیں ہے۔

جب ہم اس زمانے پر خیال کرتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت اور رسالت کا علم بلند کیا اور جس میں ایک ایسا کامل مجموعہ قوانین تیار کیا گیا جو دنیا کی ملکی مذہبی اور تمدنی ہدایتوں کے لیے کافی ہے تو ہم نہایت حیران ہوتے ہیں کہ ایک ایسا عظیم ملکی اور تمدنی نظام جس کی بنیاد کامل اور سچی آزادی پر ہے کس طرح قائم کیا گیا۔ پس ہم دل سے اقرار کرتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مجموعہ قوانین ہے جو ایک بلند ترین انسانی دماغ کا نتیجہ ہے۔

ماہنامہ "آئینہ" لاہور

رسائل و مسائل

چند زراعتی مسائل

خط

زراعت سے متعلق چند مسائل پیش خدمت کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ آپ ان کے جوابات عنایت کریں گے۔

(۱) ایک شخص قرض لے کر اپنی زمین قرض دینے والے کے پاس رہن رکھ دیتا ہے تا وقتیکہ راہن مرتہن کو قرض کی رقم واپس نہ کردے۔ اس وقت تک کے لیے قرض لینے والا اپنا حق کاشت اس کو دے دیتا ہے۔ قرض دینے والا زمین کی پیداوار سے فائدہ حاصل کرتا رہتا ہے۔ سرکاری لگان اور سینچائی وغیرہ کے اخراجات مرتہن ہی برداشت کرتا ہے۔ اس صورت میں کیا مرتہن کا فائدہ حاصل کرنا جائز ہے؟

(۲) ایک کاشتکار زمیندار سے نصف حصہ کاشت پر زمین حاصل کرتا ہے لیکن خود کاشت نہیں کرتا بلکہ دوسرے کاشتکار کو چوتھائی حصے پر دے دیتا ہے۔ پیداوار میں نصف حصہ مالک کا اور نصف میں یہ دونوں شریک ہوتے ہیں۔ تمام اخراجات دوسرا کاشتکار برداشت کرتا ہے صرف بیج میں پہلا کاشتکار جزوی شرکت کرتا ہے۔ معاملے کی اس صورت کا حکم کیا ہے؟

(۳) ایک شخص اپنی زمین نصف حصہ کاشت پر کاشتکار کو بایں شرط دیتا ہے کہ وہ اس کو اتنی رقم بطور قرض دے اور جب تک قرض واپس نہ ہو وہ زمین کی کاشت کرتا رہے۔ کاشت کے اخراجات، کاشتکار ہی برداشت کرتا ہے وہ ہر سال مالک زمین کو نصف پیداوار دے دیتا ہے

اس معاملے میں کیا قباحت ہے؟

(۴) ایک شخص اپنی زمین کسی کو اس شرط پر دیتا ہے کہ کاشتکار کا کوئی بچہ یا بڑا آدمی اس کے یہاں کھیتی باڑی اور مویشی کی دیکھ بھال کا کام سال بھر تک مفت کرتا رہے گا اور سال بھر میں قرض واپس نہ ہو سکے تو جب تک قرض کی رقم واپس نہ ہو وہ اس کے یہاں مفت کام کرتا رہے گا کیا اس شکل میں مفت کرانے پر سود کی تعریف صادق آتی ہے؟

(۵) ایک زمیندار اپنی کھیتی باڑی کے لیے ایک نوکر اس شرط پر رکھتا ہے کہ اگر تم سال بھر کے لیے پانچ سو روپیے بطور قرض ہم سے لیتے ہو تو ہم خدمت کی مزدوری چار سو روپیے دیں گے اور اگر قرض نہیں لیتے ہو تو مزدوری پانچ سو روپیے دیں گے چونکہ اس شخص کو روپیوں کی ضرورت ہے اس لیے وہ ایک سو کم معاوضہ پر خدمت قبول کر لیتا ہے۔ اس بارے میں کیا حکم ہے؟

(۶) الف - ایک زمیندار غلے کے دام دو طرح کے رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی نقد لے تو ۲۵ روپیہ من اور ادھار لے تو تیس روپیے من۔ کیا اس طرح کی بیع جائز ہے؟

(ب) اس شرط پر غلہ دینا کہ میں اس وقت تمہیں ایک من باجرہ دیتا ہوں اور بیساکھ میں تم سے من بھر گیہوں لوں گا یعنی ایک جنس کے بدلے دوسرے جنس کا غلہ تو کیا یہ جائز ہوگا

(ج) اس طرح غلہ دینا کہ جس قدر چاہو غلہ لے لو۔ صرف غلہ کی مقدار طے ہوتی ہے قیمت طے نہیں ہوتی۔ صرف یہ طے ہوتا ہے کہ فلاں مہینے میں غلے کا جو بھاؤ ہوگا اسی کے حساب سے قیمت وصول کی جائے گی۔ کیا اس طرح سودا کرنا ٹھیک ہے

(۷) الف - ہندوستان اور خصوصاً راجستھان میں عشری زمین ہے یا نہیں؟ حکومت جب لگان لیتی ہے تو کیا پھر بھی عشر دینا ہوگا؟

(ب) ایک زمیندار جس کی آمدنی کا ذریعہ صرف کھیتی باڑی ہے جو سرمایہ بھی آتا ہے کھیت ہی سے آتا ہے۔ اب کیا وہ عشر بھی نکالے گا اور سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ بھی دے گا؟ وضاحت فرمائیں۔

(۸) سود جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں جاری و ساری ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ بلا سود قرض ملتا نہیں کھیتوں سے فصل حاصل کرنے کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ کاشتکار کے پاس ہے

نہیں اب وہ کیا کرے؟ یہ بھی بتائیے کہ سود لینے اور دینے میں کیا فرق ہے یا نہیں؟ احادیث میں تو دونوں کو شاید یکساں قرار دیا گیا ہے۔ سود لینے والے مسلمان کہتے ہیں کہ جب سود دینا بھی اسی درجہ کا گناہ ہے تو پھر ہم سود دینے والے ہی کیوں رہیں، خود سود کیوں نہ لیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تم سود دیتے ہو تو ہم سود لیتے ہیں۔

(۹) میرے قبضے میں پانچ بیگھے زمین ہے۔ میں صرف سرکار کو ۱۵ روپیے سالانہ لگان دیتا ہوں۔ اب اگر میں اپنی زمین کسی دوسرے کاشتکار کو اس سے زیادہ لگان پر دوں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب

پہلے چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لیجیے تو اس طرح کے مسائل کے جوابات سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ ایک بات تو یہ کہ قرض دے کر اس سے کسی بھی نوعیت کا نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ مقروض کی دعوت قبول کرنا بھی پسندیدہ نہیں ہے الّا یہ کہ دائن اور مدیون کے درمیان اس طرح کے تعلقات پہلے سے قائم ہوں۔ دوسری بات یہ کہ دو طرح کے معاملات کو ایک معاملے میں داخل کرنا صحیح نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ کسی معاملے میں ایسی شرط لگانا جو اس معاملے سے مناسبت نہ رکھتی ہو غلط ہے۔ چوتھی بات یہ کہ کوئی ایسی فروخت جائز نہیں ہے جس میں مبیع یا ثمن معلوم نہ ہو۔ مبیع وہ چیز ہے جو فروخت کی جا رہی ہو اور ثمن اس کے دام کو کہتے ہیں۔ پانچویں بات یہ کہ زراعت یعنی بٹائی پر کھیت دینا، لینا دراصل زمین کا اجارہ ہوتا ہے۔ اب آپ سوالات کے نمبروار مختصر جوابات ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) یہ صورت ناجائز ہے۔ اس لیے کہ یہ صریح طور پر سود خواری ہے۔ مرتہن جو پیداوار رکھائے گا وہ خالص سود ہوگا۔ سرکاری لگان اور سینچائی وغیرہ اخراجات کا مرتہن ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ راہن یعنی مالک زمین ہوتا ہے۔ اب اگر مرتہن لگان وغیرہ ادا کر رہا ہے تو اس کی دو صورت ہے۔ اگر مالک کی اجازت کے بغیر ایسا کر رہا ہے تو یہ اس کا اس پر احسان ہے اور اگر اجازت سے کر رہا ہے تو اس کو حق ہے کہ وہ لگان اور دیگر اخراجات کی رقم راہن سے وصول کرے لیکن اس کی وجہ سے وہ پیداوار کا مالک نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا استعمال اس کے لیے جائز ہو سکتا ہے۔ راہن کی اجازت سود کو حلال نہیں کر سکتی مرہونہ زمین (یعنی جو زمین رہن رکھی گئی ہے) سے فائدہ اٹھانے کی صرف ایک صورت جائز ہے اور وہ یہ کہ پیداوار کی قیمت لگا کر اتنی رقم اپنے قرض سے وضع کر دے اور جیسے ہی قرض کی پوری رقم وصول

ہو جائے زمین اس کے مالک کو واپس کر دے۔

(۲) یہ معاملہ جائز ہے۔ اس لیے کہ اجارے پر جو زمین لی جاتی ہے اس کو کسی دوسرے سے اجارہ کرنا صحیح ہے۔

(۳) یہ صورت جائز نہیں ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اجارے پر کھیت دینے کے معاملہ میں قرض لینے کی ایک ایسی شرط لگا رہا ہے جس کا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اس طرح وہ قرض لے کر اپنی زمین کاشتکار کو بطور رہن دے رہا ہے۔ اس معاملے کی علت یہ بنتی ہے کہ بیک وقت وہ اجارہ بھی ہے اور رہن بھی اور ان دونوں کو ایک معاملے میں جمع کرنا صحیح نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ جب وہ زمین رہن بھی ہوگی تو اس سے قرض دینے والے کے لیے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں رہے گا۔

(۴) اس معاملے کے سودی ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ سود صرف یہ نہیں ہے کہ قرض پر بطور نفع کسی سے روپیہ یا اناج حاصل کیا جائے بلکہ کسی کی قابل اجرت محنت و خدمت بھی سود ہو سکتی ہے۔ بچہ یا بڑا جو آدمی بھی اس کے یہاں سال بھر یا اس سے زیادہ مفت کام کرے گا۔ اس کے کام کی اجرت، قرض دینے والے کے لیے خالص سود ہوگی۔ ظلم و زیادتی کی یہی روح ہے جس سے بے گار اور غلامی جنم لیتی ہے۔

(۵) اس معاملے کے سودی ہونے میں بھی شبہہ نہیں ہے۔ قرض دینے کی صورت میں وہ اس کی اجرت کے سو روپیے جو ہضم کرے گا وہ سود ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ اجارے کے معاملے میں ایک ایسی شرط لگا رہا ہے جس کا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے۔ اس ناجائز شرط کی وجہ سے بھی یہ معاملہ غلط ہے۔

(۶) (الف) یہ بیع جائز ہے۔ دونوں صورتوں میں قیمت معلوم ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنی سہولت کے لیے ادھار قیمت پسند کرتا ہے تو اس کو اس کا اختیار ہے اور نقد قیمت پسند کرتا ہے تو اس کا بھی اسے اختیار ہے —————— ان دونوں صورتوں میں کوئی صورت طے کر کے خرید و فروخت ہو تو یہ جائز ہے البتہ اگر کوئی صورت طے نہ ہوا اور خرید و فروخت ہو جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔

(ب) یہ صورت جائز نہیں ہے۔ دونوں جنس کے غلوں کو کمی زیادتی کے ساتھ نقد فروخت کرنا جائز ہے لیکن ادھار کی صورت میں ناجائز ہے۔

(ج) یہ صورت بھی ناجائز ہے اس لیے کہ قیمت مجہول ہے اور جب بیع میں قیمت معلوم نہ ہو تو ناجائز

ہوتی ہے۔

(۷) ہندوستان میں عشری زمین ہے یا نہیں؟ اس کا مفصل جواب ماہنامہ زندگی، جولائی ۶۸ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ اس کو پڑھ لیں اس میں حکومت کے ٹیکس کا حکم بھی بیان کیا گیا ہے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں عشری زمینیں یقیناً ہیں نیز یہ کہ حکومت کو ٹیکس ادا کرنے کی وجہ سے عشر ساقط نہیں ہوتا۔

(۸) سود لینے اور دینے میں قباحت کے لحاظ سے ضرور فرق ہے۔ سود خوار، سود لینے والا ہی ہوتا ہے سود دینے والا نہیں ہوتا۔ احادیث میں سود دینے کی ممانعت سودی کاروبار کو ختم کرنے کے لیے کی گئی ہے کیونکہ سود دینے والا اس کاروبار کے لیے ذریعہ بنتا ہے۔ سود لینا جرم ہے اور سود دینا ذریعہ جرم ہے اس کے علاوہ انسان سود لینے کے لیے مجبور نہیں ہوتا بلکہ حرام طریقے سے اپنے مال میں اضافہ کرنے کے لیے سود لیتا ہے۔ - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - جب کہ سود دینے والا بسا اوقات سودی قرض لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی حالت میں سود پر روپیہ لیا جا سکتا ہے لیکن مسلمان کو یہ فیصلہ آخرت کے عذاب کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے کہ وہ سودی قرض لینے کے لیے واقعی مجبور ہے یا نہیں

(۹) آپ ایسا کر سکتے ہیں اس لیے کہ اجارے پر لی ہوئی زمین کسی دوسرے کو اجارے پر دی جا سکتی ہے جو زمیندار اپنے کھیتوں ہی سے سرمایہ حاصل کرتا ہے اس کی دو صورت ہے ایک یہ کہ وہ تمام غلے گھر منگوا لیتا ہے۔ اس صورت میں جس غلے پر وہ عشر ادا کر چکا ہے اس پر اس کو دوبارہ عشر ادا کرنا نہیں ہوگا یوں سمجھیے کہ جس غلے پر عشر ادا کیا جا چکا ہے اگر وہ گھر میں کئی سال بھی پڑا رہے تو اس پر دوبارہ عشر ادا کرنا نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عشر ادا کرنے کے بعد وہ غلہ فروخت کر کے اس کو روپیے یا چاندی سونے میں تبدیل کر لیتا ہے۔ اس صورت میں اگر روپیے یا چاندی سونا ایک نصاب یا اس سے زیادہ ہے تو سال گزرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ کسی کے کھیت میں بیس من گیہوں پیدا ہوا۔ اس نے دو من عشر نکال دیا اور اٹھارہ من گیہوں کو ایک ہزار روپیے میں فروخت کر دیا۔ اس ہزار روپے پر ایک سال گزر گیا تو اس کو اس کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی اس لیے کہ پیداوار کی زکوٰۃ کا حکم کچھ اور ہے

اور روپیہ یا چاندی سونا کی زکوٰۃ کا حکم کچھ اور ہے دونوں کی زکوٰۃ میں فرق ہے۔ ذریعہ آمدنی زراعت ہو یا تجارت یا ملازمت نصاب کے برابر اگر روپیے بچ رہے ہوں تو سال گزرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی کسی بھی حلال ذریعہ سے روپیہ ملا ہو زکوٰۃ میں اس روپیے کو دیکھا جائے گا اس کے ذریعہ کو نہیں

مشاعرے اور شعر و شاعری

سوال:۔ (۱) موجودہ مشاعرے جس نوعیت کے ہو رہے ہیں اور جو اس کی غرض وغایت ہے غالباً آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کیا دین اسلام ان مشاعروں میں شرکت کی اجازت دیتا ہے؟ کیا اس میں طرح اور بے طرح اپنا کلام پیش کیا جا سکتا ہے؟ خاص طور سے کیا رکن جماعت اس میں شرکت کر سکتا ہے اور اپنا کلام بھی پیش کر سکتا ہے

(۲) شعر و شاعری کا اسلام میں کیا مقام ہے؟

جواب

(۱) موجودہ مشاعرے اگر مردوں اور عورتوں سے مخلوط نہ ہوں، صرف مردوں کے ہوں تو ان میں شرکت کو ناجائز قرار دینا مشکل ہے۔ البتہ اس پر غور کر لینا چاہیے کہ ان مشاعروں میں شرکت پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ۔ میرا خیال ہے کہ اگر نیت محض تفریح اور لہو ولعب کی ہو تو ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے کہ موجودہ عام مشاعروں میں متعدد قسم کی ناگوار باتیں رواج پا گئی ہیں اور اگر نیت، اردو زبان کی ترقی کرنے یا اپنے اچھے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی ہو تو پسندیدہ ہے۔

(۲) شعر و شاعری بھی انسانی کلام کی ایک قسم ہے۔ نثر بھی کلام ہے اور نظم بھی کلام ہے۔ روایتوں میں آتا ہے: الشعر کلام حسنہ حسن وقبیحہ قبیح یعنی شعر بھی کلام ہے، اچھے اشعار اچھے ہیں اور برے اشعار برے۔ ٹھیک یہی بات نثر پر بھی صادق آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز وہ مضامین اور وہ باتیں ہیں جن کا اظہار انسان اپنی زبان و قلم سے کرتا ہے۔ اگر برے مضامین اور برے خیالات کا اظہار کیا ہے تو وہ کلام برا ہوگا اور اچھے مضامین اور اچھے خیالات کا اظہار کر رہا ہے تو وہ کلام اچھا ہوگا۔ یہ اظہار نثر میں ہو یا نظم میں۔ ادب و شعر دراصل ایک قوت ہے اس کو جس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا اسی کے لحاظ سے اس کا مقام متعین ہوگا۔ اگر اس کا مقصد دین کی خدمت ہو تو اس کو اسلام میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور اُن کی فقہ از ڈاکٹر حنیفہ رضی صفحات ۲۷۶ بڑا سائز کاغذ طباعت کتابت بہتر قیمت مجلد آٹھ روپے غیر مجلد سات روپے

ناشر:- ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

یہ کتاب ایک طویل مقالہ ہے جس پر ڈاکٹر حنیفہ رضی کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ یہ پورا مقالہ پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذاتی حالات اور سوانح حیات ہیں۔ دوسرے حصے میں آپ کی علمی فضیلت اور علمی خدمات کا تذکرہ ہے تیسرے حصے میں آپ کے اقوال اور خطبے جمع کیے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر اعتراضات کے جوابات ہیں۔ پانچویں حصے میں آپ کے فقہی مسائل اور فتاویٰ جمع کیے گئے ہیں (یہ حصہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے) لیکن اس پانچویں حصہ کی تمہید جو ۷۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے شائع کر دی گئی ہے

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس اہم موضوع کا یہ نقشِ اوّل اور وہ بھی ایک خاتون کے قلم سے ہر طرح قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ یہ مقالہ تین سال کی محنت شاقہ کے بعد تیار ہوا ہے اور اس کو ایک جامع مقالہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ زیر تبصرہ جلد کی فہرست مضامین بہت مکمل نہیں ہے۔ پھر بھی چار صفحات میں آئی ہے

راقم الحروف کو فقہ سے تھوڑی سی دلچسپی ہے اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فقہی مسائل و فتاویٰ کے مطالعے کا بڑا شوق تھا اور اسی شوق میں کتاب کے پانچویں حصے کو میں نے بالاستیعاب اور بڑے شوق سے پڑھا لیکن اخیر میں یہ عبارت ملی کہ یہ کتاب کا حصۂ اول ہے اور ان کے مسائل و فتاویٰ

کتاب کے دوسرے حصے میں ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوا۔ نہ تو اس کتاب کے ٹائٹل پر اس کو حصہ اول لکھا گیا ہے نہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے اپنی "تقریب" میں اس کا ذکر کیا ہے اور نہ خود مصنفہ نے اپنے دیباچے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب قاری کتاب کی آخری سطروں تک پہنچتا ہے تب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو کتاب کا صرف پہلا حصہ ہے ۔۔۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ راقم الحروف نے اس کتاب کے صرف پانچویں جز کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود اس کتاب میں پانچویں جز کو سب سے اہم جز کہا گیا ہے۔ چند باتیں لائق مصنفہ کی خدمت میں اس غرض سے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ طبع ثانی میں اس کا خیال کریں۔

پہلی بات یہ کہ حضرت ابن مسعودؓ کے فتاویٰ کی تمہید میں جو ۵۰ صفحات لکھے گئے ہیں وہ تبصرہ نگار کو اس کتاب کے لیے بالکل غیر ضروری محسوس ہوئے۔ اس میں قیاس و اجتہاد کے اثبات پر دلائل اور مواد جمع کیا گیا ہے اور یہ کام اردو زبان میں بہت کچھ کیا جا چکا ہے۔ اگر کتاب کی ضخامت بڑھانا مقصود نہ ہو تو اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ اس موضوع پر مستقل مضامین اور کتابیں تک لکھی جا چکی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پانچویں حصے کی تمہید تو کتاب کے پہلے حصے میں شائع کر دی گئی اور اصل حصہ کتاب کی دوسری جلد کے حوالے کر دیا گیا جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کیا ترتیب ہے۔ میرا خیال ہے کہ اثبات اجتہاد والے صفحات کو ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع کرنا بہتر ہوگا ۔۔۔ تیسری بات جس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ آیات قرآنی، احادیث اور دوسری عربی عبارتوں کے ترجموں پر نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے۔ بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ ایک کنارے آیتیں، احادیث اور دوسری عربی عبارتیں لکھی گئی ہیں، لیکن ان کے سامنے ترجمہ ندارد ہے۔ کہیں ترجمے ناقص ہیں اور کہیں غلط ہیں۔ عربی نہ جاننے والے ناقص اور غلط ترجمے پڑھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے۔ میں چند ناقص اور غلط ترجموں کی نشان دہی کرتا ہوں:۔

(۱) ص۳۶ پر کان عبد اللہ یشبہ بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ھدیہ و دلہ وسمتہ کا ترجمہ کیا گیا ہے "حضرت عبد اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھے"۔ یہ ترجمہ کتنا ناقص ہے (۲) ص۱۳۳ پر علامہ آمدی کی عبارت کا ترجمہ ناقص ہے۔ (۳) ص۲۲۲ پر حدیث کا ترجمہ بھی ناقص ہے۔ (۴) ص۲۱۵ پر علامہ شاطبی کی عبارت کا ترجمہ ناقص ہے۔ (۵) ص۲۳۳ پر تاریخ التشریع الاسلامی

کی عبارت کے آخری حصہ کا ترجمہ صحیح نہیں ہے (۶) ص ۲ پر وجاء فی القرآن نفسہ باحکام" کا ترجمہ غلط ہے۔ (۷) ص ۲ پر مذکور کی عبارت کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بہتر ہوگا۔ اس کتاب نے اردو زبان کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے

ہندوستان میں عربوں کی حکومت مولفہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی صفحات ۴۰۴ سائز بڑا۔ قیمت مجلد:۔ آٹھ روپیے غیر مجلد سات روپیہ۔ ناشر:۔ ندوۃ المصنفین۔ جامع مسجد دہلی ۶

جس تاریخی موضوع سے متعلق کتب تاریخ میں مواد اور معلومات جمع کر دیے گئے ہوں اس پر کوئی مقالہ یا کتاب تیار کر لینا مشکل کام نہیں ہے لیکن ایسے موضوع پر قلم اٹھانا آسان کام نہیں ہے جس پر یک جا مواد موجود نہ ہو بلکہ بیسیوں کتابوں میں بکھرا ہوا ہو مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے اسی دوسری قسم کے تاریخی موضوعات پر مقالے نہیں بلکہ ضخیم کتابیں مرتب کر دی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی طرح کی ایک کتاب ہے۔ اس موضوع پر نہ عربی میں کوئی کتاب موجود ہے' نہ فارسی میں قاضی اطہر صاحب کی محنت نے اردو زبان کے تاریخی ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ جناب مفتی عتیق الرحمن صاحب نے دیباچے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"فاضل مؤلف کے شوق جستجو اور ذوق تحقیق کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے عربی کی سیکڑوں تاریخی کتب کے سمندر میں غوطہ لگا کر یہ گوہر تاب دار فراہم کیے اور مہبط اول سندھ کی عظمت و سطوت کی ایک اعلیٰ درجے کی تاریخ مرتب کر دی۔"

اس کتاب میں ہندوسندھ کی پانچ عربی حکومتوں کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ سندان، ملتان، منصورہ مکران اور طوران۔ ان حکومتوں کا ایک نقشہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ یہ بات شاید اکثر ہندوستانی مسلمانوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہو کہ موجودہ بمبئی اور گجرات کے ایک علاقے پر بھی عربوں کی حکومت تھی سندان' جس کو اب سنجان کہا جاتا ہے آج بھی اس علاقے میں ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس کتاب میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس کتاب کے لائق مطالعہ اور قابل قدر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔

دلِ لخت لخت عروج زیدی ۔ صفحات ۴۰ ۔ قیمت ایک روپیہ ۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ جوہر، لال قبر رام پور ۔ یوپی ۔

جناب عروج زیدی کے کلام کا یہ مختصر مجموعہ جناب ایم ۔ ایم عابدی نے مرتب کر کے مکتبہ جوہر سے شائع کیا ہے ۔ عروج زیدی ہندوستان و پاکستان کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں ایک جانے پہچانے شاعر ہیں ۔ ان کا کلام دونوں ملکوں کے ادبی رسائل میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے ۔ چنانچہ یہ مجموعہ بھی رسائل و اخبارات ہی سے کر مرتب کیا گیا ہے ۔ جناب عروج زیدی ایک پختہ مشق شاعر ہیں ۔ ان کی عمر چون پچپن سال ہو انداز یہ ہے کہ انھوں نے اب تک بہت کچھ کہا ہوگا ۔ تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ اگر ان کے غیر مطبوعہ کلام سے کوئی مجموعہ مرتب ہوتا تو بہتر تھا ۔ کیونکہ جو چیزیں شائع ہو چکی ہیں ان کے ضائع ہو جانے کا احتمال کم ہے بہرحال ادھر ادھر منتشر غزلوں کا مجموعے کی شکل میں شائع ہو جانا بھی غنیمت ہی ہے ۔

عروج زیدی کی شاعری سنجیدہ اور زبان و بیان کے قواعد کی پابند شلوغ کی ہے ۔ تحریک ادب اسلامی کے رسائل و مجلات میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے ۔ وہ اپنے دینی خیالات اور دینی مزاج کی وجہ سے تعمیر پسند ادیبوں سے قریب تر ہیں ۔ کلام میں پختگی اور روانی ہے ۔ پڑھنے والے اس مجموعے میں اپنے پسند کے بہت سے شعر پائیں گے ۔ تبصرہ نگار کو بھی متعدد اشعار پسند آئے ہیں جن میں کے چند یہ ہیں ۔

دردِ دل عیش دو عالم سے پیارا ہے مجھے ۔۔۔ تم نے کس رنگ سے شیشے میں اتارا ہے مجھے

میری بھیگی ہوئی پلکوں نے بھرم کھول دیا ۔۔۔ ناز یہ تھا کہ ابھی صبر کا یارا ہے مجھے

شام نشاط ہے تو کبھی صبح غم عروج ۔۔۔ کٹتی نہیں کسی کی یہاں ایک حال میں

تری قربت میں جو گزرے وہ لمحے یاد آتے ہیں ۔۔۔ انہیں لمحوں کو جینے کا سہارا کر لیا میں نے

وفائے عشق کی دشواریاں ہیں میری نظروں میں ۔۔۔ مگر یہ زہر پینا بھی گوارا کر لیا میں نے

یہ نہ ہوگا خواہ گزریں موت کی منزل سے ہم ۔۔۔ زندگی کی بھیک مانگیں خنجر قاتل سے ہم

اپنی اس دنیا کے آگے کوئی دنیا ہی نہیں ۔۔۔ تو بتا اٹھ کر کہاں جائیں تری محفل سے ہم

جنہیں موجوں کا سینہ چیر کر بڑھنا نہیں آتا ۔۔۔ کبھی وہ ساحل مقصود تک پہنچا نہیں کرتے

جو ناگوار نہ گزرے تو ایک بات کہوں ۔۔۔ وفا پسند سہی تم وفا شعار نہیں

کیا نصیحت کا اثر ہو اہل محفل پر عروج ۔۔۔ آپ جو فرما رہے ہیں اس پہ خود عامل نہیں

جب نظر ظلمتوں میں گھر جائے کام دیتی ہے روشنی دل کی

عروج زیدی صحت الفاظ کا خیال رکھتے ہیں لیکن نہ معلوم کس طرح وہ حَرَج کو حَرَج لکھ گئے ہیں!
مثلاً یہ مصرعہ ہے۔ "وہ اگر ترک ستم کر دیں تو کوئی ہرج ہے" چھوٹی "ہ" سے یہ لفظ تو کاتب نے لکھا
ہے لیکن "ر" کو ساکن کاتب نے نہیں کیا ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق حضرات اس مجموعے کی قدر کریں گے
مکتبہ جوہر بھی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے تاکہ اس طرح کے دوسرے مجموعے بھی شائع ہو سکیں

نقش بقا
صفحات ۴۰۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ملنے کا پتہ: خانقاہ برہانیہ۔
بارگاہِ عشق۔ نمبر آئی ۱۵ ۲ پہاڑ پور روڈ۔ ٹیا برج۔ کلکتہ ۴۲

یہ جناب بقا نظامی کے مجموعہ کلام کا انتخاب ہے۔ اس کو جناب محمد بہاء الدین شاہ نظامی
نے مرتب کیا ہے اور جناب عباس علی خاں بیخود ایم اے نے تعارف لکھا ہے۔

جناب شاہ برہان الدین بقا نظامی عظیم آباد پٹنہ سٹی (صوبہ بہار) کے رہنے والے ہیں مگر
اب کلکتہ ہی ان کا وطن ثانی بن چکا ہے۔ وہ ابو البیان مائل لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اس مختصر سے
مجموعے میں غزلیں، نظمیں، نعت، منقبت، قطعات، رباعیات سب کچھ موجود ہے۔ بیخود ایم اے
نے یہ صحیح لکھا ہے کہ جناب بقا نظامی ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں اور ان میں شاعری کی پوری
صلاحیت موجود ہے۔ یہ مجموعہ پڑھنے کے لائق ہے اور اس میں بہت سے اشعار پڑھ کر مسرت حاصل
ہوتی ہے۔ اس مجموعے کی قیمت بہت رکھی گئی ہے۔ شاید اس کی کوئی خاص مصلحت ہو۔

ایک لمحۂ فکریہ
از جناب عبدالحمید صدیقی و جناب نعیم صدیقی۔ صفحات ۴۰۔ قیمت ۴۰ پیسے صرف
ناشر:۔ مکتبہ معاویہ بی ون ایریا ۱/۲ لیاقت آباد کراچی ۱۹

۵، ۶ فروری ۶۶ء کو لاہور میں مختلف سیاسی جماعتوں کی ایک مشترکہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی
اس کانفرنس میں جناب نعیم صدیقی صاحب نے پاکستانی دستور کو جمہوری معیار پر لانے کی قرارداد
کی حمایت میں ایک تقریر کی تھی اور اس کانفرنس ہی کے سلسلے میں جناب عبدالحمید صدیقی صاحب نے

ترجمان القرآن میں ایک اداریہ لکھا تھا۔ اس پمفلٹ میں ان دونوں کو شائع کیا گیا ہے۔ بات تو کچھ پرانی ہو چکی ہے لیکن اس اداریے اور تقریر میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آج بھی پاکستان کے حالات پر اسی طرح چسپاں ہے جس طرح ۶۶ء میں تھا۔ اسی لیے اس کو پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ کوئی بعد از وقت چیز پڑھی جا رہی ہے۔ پاکستان کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لیے اس پمفلٹ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

ایک ادبی تحریک صفحات ۱۶ کاغذ کتابت طباعت بہتر، قیمت ۲۵ پیسے۔ پتہ: مرکز ادارۂ ادب اسلامی ہند۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد۔ یوپی

یہ پمفلٹ تعارف، تاریخ، اپیل کے تین بڑے عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس میں "اسلامی ادب کی تحریک" اور "ادارہ ادب اسلامی" کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا گیا اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور ان لوگوں سے تعاون کی اپیل کی گئی ہے جو اس ادبی محاذ کی اہمیت کے معترف ہیں۔ ادارے کے ایک ادبی ترجمان کی ضرورت و اہمیت کا اظہار بھی کیا گیا ہے اور اب خدا کے فضل سے اس کا ترجمان "دوام" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ تبصرہ نگار کو ندامت ہے کہ اسلامی ادب کی تحریک سے ذاتی اور عملی دلچسپی کے باوجود اس تعارفی پمفلٹ پر تبصرے میں بہت تاخیر ہو گئی ہے۔ اس پمفلٹ کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے مفید ہوگا جو اس ادبی تحریک اور ادارۂ ادب اسلامی ہند سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

اقبال اور نظریہ پاکستان نعیم صدیقی۔ صفحات ۴۸۔ قیمت قسم اعلیٰ (سفید کاغذ) ۷۵۔ ۱ قسم ارزاں (نیوز پرنٹ) ۲۵۔ ۱ روپیہ۔ ناشر: مکتبہ سیارہ، اچھرہ۔ لاہور۔ مغربی پاکستان

اس مقالہ کا موضوع مصنف کے الفاظ میں یہ ہے:-

> اس مقالہ میں میں اس امر سے بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اقبال نے پاکستان کا تصور کیا پیش کیا ہے اور پاکستان کے لیے کیا نظریہ تجویز کیا ہے؟

یہ مقالہ ۸ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ علامہ اقبال کی قد آور شخصیت، ان کی لازوال شاعری ان کے مسلّمہ علم و دانش اور ان کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے یہ تو کسی "مسلمان اشتراکی" کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ انہیں نظر انداز کر سکے اس لیے جو لوگ نظام اسلامی کو پسند نہیں کرتے وہ اقبال کو بھی اپنی صف میں داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال نے پاکستان کا جو نظریہ پیش کیا تھا اس میں بھی اسی طرح کے لوگ بلکہ کہنا چاہیے کہ حکمراں طبقے کے لوگ، الحاد پیدا کرتے رہتے ہیں۔ فاضل مرتب نے خود اقبال کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ انھوں نے پاکستان کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ خالص اسلام پر مبنی تھا اور وہ پاکستان اسی لیے چاہتے تھے کہ اس میں اسلامی تہذیب اور اسلامی قانون پروان چڑھے۔ یہ پمفلٹ اس موضوع پر معقول بھی ہے اور مدلل بھی۔ اس کا مطالعہ ہر لحاظ سے مفید ہوگا۔

نقوش راہ از محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی صفحات ۲۱۳ کاغذ کتابت، طباعت بہتر قیمت مجلد ۵۰/۴ و غیر مجلد ۳/۳۰۔ ناشر: مکتبہ الحسنات رام پور۔ یوپی۔

یہ سید قطب شہیدؒ کی گراں قدر تصنیف معالم فی الطریق کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم ایک جواں سال اور صالح عالم دین ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تصنیف و تالیف اور ترجمے کی اچھی صلاحیت عطا کی ہے اور شکر کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنی اس صلاحیت کو دین کی خدمت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ مولانا جلیل احسن ندوی نے کلمۂ خیر میں لکھا ہے:۔

> مترجم تصنیف و تالیف کے میدان میں ابھی نو وارد ہیں لیکن تحریر میں بڑی پختگی اور روانی ہے چونکہ مصنف سے سچی محبت اور احیاء اسلام کا درد رکھتے ہیں۔ اس لیے اصل کتاب کا سوز و ساز بھی مجروح نہیں ہونے پایا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے۔ داعیان دین کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشے اور مترجم کو دنیا و آخرت کی سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے۔

تبصرہ نگار اس کلمۂ خیر اور دعا میں شریک ہے۔ پوری توقع ہے کہ عمر اور مشق میں اضافے کے ساتھ ساتھ مترجم کی تحریر میں مزید پختگی اور روانی پیدا ہوگی۔ اس کتاب کی اہمیت ہی کے پیش نظر ماہنامہ زندگی کے ستمبر کے اشارات میں متعدد اقتباسات شائع کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر تبصرہ نگار کے دل میں مصنف کی قدر بڑھ گئی ہے اور مترجم کے لیے دل سے دعا نکلی ہے۔

Monthly 'ZINDGI' Rampur, Oct. 1968, Regd. No. L--688

-* ایک ضروری اعلان *-

کانتی اکتوبر کے شمارے سے ھفت روزہ ھو رھا ھے

اور اب وہ رامپور کے بجائے

۱۵۲۵ - سوئیوالان - دھلی - ۶ سے شائع ھوگا

کانتی کے ایجنٹوں کے بقایا کی تفصیل یا اُن کی جو رقم ادارہ کے ذمہ تھی اُس کا حساب دھلی منتقل کر دیا گیا ھے - براہ کرم اب کانتی کے سلسلے میں براہ راست دھلی کو لکھیں-

منیجر ماہ نامہ "زندگی" رامپور

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اقامتِ دین کا داعی

سالانہ آٹھ روپے

فی پرچہ ۵۰ پیسے

ماہنامہ

زندگی رامپور

(مدیر: سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے =/۸
پاکستان سے =/۸
شش ماہی
ہندوستان سے =/۴
پاکستان سے =/۴
فی پرچہ: ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۱۴ شلنگ

جلد: ۴۱ | شعبان المعظم ۸۸ھ مطابق نومبر ۱۹۶۸ء | شمارہ: ۵

اس دائرے میں ○ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آیندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے اس مہینے میں چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو ان شاء اللہ اگلا پرچہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر: ماہنامہ زندگی رام پور یوپی

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: روہیلا پرنٹرس۔ [illegible] رام پور
مقام اشاعت: دفتر زندگی۔ رام پور یوپی

اشارات

(سید احمد محمد قادری)

یہ شمارہ جب قارئین زندگی کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو روزہ دار خاندانوں میں ہر طرف رمضان المبارک کی آمد آمد کا چرچا ہو گا۔ کاش ہمارے گھروں میں یہ چرچا شعور کے ساتھ ہوتا ہم یہ سمجھتے کہ جس مبارک مہینے کے ہم منتظر ہیں وہ تقوے کے حصول اور اس کی تربیت کا مہینہ ہے اور ہم اصل تیاری اسی کی کرتے۔ اس مہینے کی اہمیت ہی کا تقاضا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقدس ساتھیوں کو مختلف اسلوب اور مختلف انداز سے اس کی طرف متوجہ فرماتے تھے اور آپ کا اپنا حال یہ تھا کہ ماہ شعبان کے بھی اکثر ایام روزوں میں بسر کرتے اور جب رمضان آجاتا تو ہر ماہ سے زیادہ اس ماہ میں بندگیٔ رب کے لیے چست ہو جاتے۔ یہ اس گرامی وجود کا حال تھا جس کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیے گئے تھے اور جو خدا کا محبوب ترین اور مقرب ترین بندہ تھا۔ فداہ امی وابی۔

ماہ رمضان کے روزے حصول تقوے اور اس کی تربیت کا بہترین ذریعہ تو ہیں ہی وہ بندوں کی طرف سے اپنے رحمٰن و رحیم مالک کی اس نعمت عظیم کا شکر یہ بھی ہیں جو اس نے قرآن جیسی عظیم و کریم کتاب نازل کر کے عطا کی ہے۔ ایک ایسی کتاب جو سراپا نور ہدایت ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جو بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتی، اور جو سیدھی راہ پر آچکے ہیں انھیں اس پر ثابت قدم رکھتی ہے۔ اس دور میں جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کتاب ہدایت کی عظمت و وقعت کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ آج انسانی ذہن کے گھڑے ہوئے نظریات کے ہزاروں خاردار اور تاریک جنگل، بنی نوع انسان کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہدایت کا صرف یہی ایک چراغ روشن ہے۔ بارہا یہ خیال آتا ہے کہ اگر

میرے پاس یہ روشنی نہ ہوتی تو معلوم نہیں میں کن جنگلوں میں بھٹک رہا ہوتا، یہ خیال میرے دل کو تشکر و سپاس کے جذبے سے بھر دیتا ہے اور بے ساختہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کتاب کو چوموں، اس کو آنکھوں سے لگاؤں، اس کو اپنے سر پر رکھوں اور اس کی تعلیمات کو اپنے سینے میں اتار لوں، میرے سینے سے ایک ہوک اٹھتی ہے آہ، یہ کیسی عظیم نعمت ہے جس کی ہم بے قدری کر رہے ہیں ——— یہ مبارک مہینہ قرآن کو پڑھنے اور سننے کا مہینہ ہے تاکہ جو کچھ اس میں ہے اس کی یاد تازہ ہو جائے، اس کے مضامین اور اس کی ہدایات نگاہوں کے سامنے آجائیں، اس مہینے کا سب سے بڑا شرف اور اس کی سب سے بڑی فضیلت یہی ہے کہ اس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ	رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا
الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ	گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور
مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (البقرہ ۱۸۵)	حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ

بلاشبہہ یہ کتاب تمام انسانوں کے لیے ہدایت بنا کر اتاری گئی اور بلاشبہہ یہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ نازل ہوئی لیکن یہ کھلے دلائل انہیں لوگوں کے لیے مفید ہیں جن کے دل کھلے ہوئے ہوں، جنھوں نے اپنے دلوں کو بند اور انہیں مختلف قسم کے غلافوں میں لپیٹ رکھا ہو انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کاش مسلمانوں کے دل اس مبارک مہینے میں کھلیں اور قرآن کے کھلے دلائل ان میں اتر سکیں

تقویٰ انسان کے اندر ایک ایسی صفت اور ایک ایسی راسخ کیفیت کا نام ہے جو اس کو بندگیٔ رب کا پابند بناتی اور بندگیٔ نفس سے آزاد کرتی ہے وہ انسان کو سیدھی پگ ڈنڈی پر دو طرفہ اگی ہوئی خارزار جھاڑیوں سے دامن بچا کر چلنا سکھاتی ہے۔ اس صفت اور اس مستقل کیفیت کی تربیت کا روزے سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اس لیے کہ تقویٰ کی صفت، صبر کی قوت سے پروان چڑھتی ہے جس قدر صبر کی قوت بڑھے گی وہ بڑھے گا۔ صبر کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں اور روزہ درحقیقت صبر ہی کا نام ہے۔ اسی لیے احادیث میں رمضان کو شہر الصبر بھی کہا گیا ہے۔

جس مہینے میں قرآن نازل کیا گیا اس مہینے کو روزوں کے لیے منتخب کرنے کی ایک حکمت یہ بھی معلوم

ہوتی ہے کہ روزہ دار کو وہ مقصد یاد آجائے جس کے لیے قرآن نازل کیا گیا ہے اور اسکی روشنی میں تقویٰ کی وہ نوعیت بھی متعین ہو جاتی ہے جو روزے فرض کرنے کی اصل غایت ہے۔

قرآن پوری زندگی کا دستور ہے، اس کے احکام انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے دامن کے اندر لیے ہوئے ہیں اس لیے جس تقوے کو روزوں کا مقصد بنایا گیا ہے وہ زندگی کے کسی خاص شعبے کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں ہو سکتا۔ یہ تقویٰ اس دین کو زندہ اور سربلند کرنے کے لیے بھی انسان کو سرگرم عمل کرتا ہے جو قرآن کے ذریعے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور یہ ان تمام احکام کا بھی انسان کو پابند بناتا ہے جن کا تعلق یا تو اللہ کے حقوق سے ہے یا بندوں کے حقوق سے۔ یہ تقویٰ انسان کو رات کا شہسوار بناتا ہے، اس صفت سے جو لوگ متصف ہوتے ہیں وہ رات کے سکوں پرور لمحوں میں اپنے مالک کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور دن کی ہنگامہ خیزیوں میں اپنے مالک کے باغیوں کے آگے صف بستہ نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں ہے کہ غزوۂ بدر بھی رمضان ہی میں واقع ہوا اور فتح مکہ کی جنگ بھی اسی مبارک مہینے میں لڑی گئی بلکہ اللہ کی مشیت نے یہ چاہا کہ غلبۂ اسلام کے یہ دونوں اہم واقعات اسی مہینے میں رونما ہوں تاکہ قیامت تک ہر سال مسلمانوں کو یہ یاد آتا رہے کہ رمضان کو نزول قرآن کے مقصد سے خاص مناسبت حاصل ہے اور ان دونوں کے درمیان گہرا ربط موجود ہے۔ دعوت اسلامی کی ابتدا بھی اسی مہینے سے ہوئی ہے اور پورے جزیرۃ العرب پر اس دین حق کو غلبہ بھی اسی مہینے میں حاصل ہوا ہے۔ لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جن کو یہ حقیقت یاد ہو اور کتنے ایسے ہیں جو اس حقیقت کو سامنے رکھ کر رمضان کے روزے رکھتے ہوں۔

اس مبارک مہینے میں تربیت کے لیے خود شریعت نے جو پروگرام مقرر کر دیا ہے وہ کافی وشافی ہے۔ ضرورت جس بات کی ہے وہ یہ ہے کہ :-

(الف) روزے ہوں یا تراویح، تہجد کی نماز ہو یا تلاوت قرآن یا اس نوع کی کوئی بھی عبادت، ہم اسے محض عادۃً انجام نہ دیں بلکہ پورے شعور کے ساتھ اس مقصد کو سامنے رکھ کر ادا کریں جس کے مختصر اشارات اوپر گزرے ہیں۔

(ب) مقصد کا حصول ان شرائط و حدود کی رعایت پر موقوف ہے جن کی توضیح اللہ کے رسول نے اپنے قول و عمل سے کی ہے اس لیے ہمیں ان سے ہرگز غافل نہ ہونا چاہیے جس روزے میں غیبت، جھوٹ، قول زور، جنگ و

جدال اور دوسری برائیاں شامل ہو جائیں وہ اپنے ڈھانچے کے لحاظ سے تو روزہ ہو سکتا ہے لیکن اپنی روح کے اعتبار سے روزہ باقی نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ محض بھوک اور پیاس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جس کا ذکر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح جو روزے مال حرام کی روٹی کھا کر رکھے جائیں ان سے تقویٰ جیسا پاکیزہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔

(ج) اس بابرکت مہینے میں ہر نیکی کا اجر بہت بڑھ جاتا ہے، اسی طرح برائیوں کے گناہ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کسی عمل خیر کو حقیر اور معمولی نہ سمجھیں بلکہ جو نیکی بھی ہم کر سکتے ہوں اسے ضرور کریں۔ اسی طرح کسی برائی کو حقیر نہ جانیں اور ہر برائی سے اپنا دامن پاک رکھنے کی پوری کوشش کریں۔ ماہِ رمضان کے احترام اور اس کی حرمت کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بحالت صوم اپنی بیوی سے جماع کرے تو قضا کے ساتھ اس پر کفارہ بھی واجب ہو جاتا ہے۔ حالانکہ رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں بحالتِ صوم عام ازیں کہ روزہ کسی قسم کا بھی ہو یہاں تک کہ قضائے رمضان کے روزے میں بھی اس سے یہی حرکت صادر ہو تو کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ فقہائے احناف یہی لکھتے ہیں کہ پہلی صورت میں اس سے ماہ رمضان کی بے حرمتی سرزد ہوتی ہے اس لیے اس پر کفارہ واجب ہوتا ہے، وہ کفارہ احترام رمضان میں رخنہ اندازی کی سزا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصلاً ایک حلال فعل پر جب اتنی سخت سزا ہے تو اس طرح کے کسی حرام فعل پر کتنی سخت سزا ہوگی۔

(د) اس مبارک مہینے میں اگر وقت اور توفیق نصیب ہو تو دوسروں تک اللہ کا پیغام پہنچانے میں محنت صرف کرنی چاہیے۔ ان شاء اللہ اس کا اثر بھی زیادہ ہوگا اور اجر بھی بے شمار ملے گا۔

(ہ) یہ پورا مہینہ قبولیت دعا کا مہینہ بھی ہے اس لیے تمام تر خاکساری اور مکمل تضرع و زاری کا پیکر بن کر اپنے مالک کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا چاہیے۔ اس مہینے میں اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[1] اور اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[2] کا خوانِ کرم دوسرے مہینوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تقسیم ہوتا ہے اس لیے دعاؤں سے غفلت بڑی محرومی ہوگی۔ توبہ، استغفار اور دعا، بندہ محتاج و گنہگار کی سب سے بڑی پونجی ہے اور یہ اللہ رب العلمین کو پسند بھی بہت ہے۔ پھر کیوں نہ ہم یہ پونجی لے کر اپنے آپ کو غنی و غفور مالک کے قدموں میں ڈال دیں۔

---

[1] پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔
[2] مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔

رمضان کے روزے کب اور کس آیت سے فرض ہوئے

سید احمد قادری

رمضان کے روزے کب فرض ہوئے یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، کوئی قیاسی واستنباطی مسئلہ نہیں ہے۔ اس بات پر مورخین اسلام کا اتفاق ہے کہ غزوۂ بدر ماہ رمضان میں ہوا تھا اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ رمضان کے روزے اس غزوہ سے پہلے فرض کیے گئے تھے اور مورخین اس پر بھی متفق ہیں کہ یہ روزے شعبان ۲ھ میں فرض کیے گئے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ رمضان کے روزے کس آیت سے فرض ہوئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دوسری طرف ابن جریر طبری سے لے کر بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی تک تمام صاحب تصنیف مفسرین اس پر متفق ہیں کہ فرضیت صوم رمضان کی ابتدائی آیتیں یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ سے شروع ہوتی ہیں۔ ہر منصف مزاج آدمی تسلیم کرے گا کہ ایجاب صوم رمضان کی آیتوں کے بارے میں صحابہ کرام ہی کا بیان سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ ہو سکتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ کسی صحابی سے بھی بسند صحیح اس کے خلاف کوئی بات منقول ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام ائمۂ دین اور علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ رمضان کے روزے یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ ہی کی آیت سے فرض ہوئے ہیں۔

صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے خود ہر مہینے تین دن روزے رکھنے شروع کیے اور صحابہ کرام کو بھی آپ نے اس کا حکم دیا اسی طرح صوم عاشورا آپ نے خود رکھا اور صحابہ کو بھی اس کا حکم دیا۔ یہ سلسلہ شعبان ۲ھ تک چلتا رہا جب صحابہ کو روزے رکھنے کی کچھ عادت ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کے روزے فرض کیے لیکن پورے ایک ماہ کے روزے ابھی

اب بھی کچھ لوگوں کے لیے زیادہ پرمشقت ہو سکتے تھے اس لیے ابتداءً رمضان کے روزوں میں بھی یہ رخصت دی گئی کہ جن لوگوں کے لیے پورے ماہ کے روزے زیادہ پرمشقت ہوں وہ روزے رکھنے کے بجائے فدیہ بھی دے سکتے ہیں۔ پھر یہ رخصت ختم کر دی گئی اور تندرست مقیم مسلمان کے لیے پورے مہینے کے روزے لازم کر دیے گئے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (پس تم میں سے جو کوئی اس مہینے کو پائے اس پر لازم ہے کہ مہینہ بھر کے روزے رکھے۔)

صوم رمضان کی فرضیت میں اس تدریج کا ذکر بہت سی صحیح احادیث میں موجود ہے۔ میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی طویل حدیث کا ایک ٹکڑا نقل کرتا ہوں انھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے سن کر یہ روایت کی ہے:۔

وقال وحدثنا اصحابنا ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما قدم المدينة امرهم بصيام ثلثة ايام ثم انزل رمضان وكانوا قوما لم يتعودوا الصيام وكان الصيام عليهم شديدا فكان من لم يصم اطعم مسكينا فنزلت هذه الآية فمن شهد منكم الشهر فليصمه فكانت الرخصة للمريض والمسافر فامروا بالصيام	ابن ابی لیلیٰ نے کہا اور ہم سے ہمارے اساتذہ نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ان کو تین دن کے روزوں کا حکم دیا اس کے بعد رمضان کے روزے نازل کیے گئے اور وہ ایسے لوگ تھے جن کو روزوں کی عادت نہ تھی اور روزے ان پر سخت تھے تو جو شخص روزہ نہ رکھتا وہ ایک مسکین کو کھانا کھلاتا پھر یہ آیت نازل ہوئی فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ تو رخصت مریض اور مسافر کے لیے باقی رہی، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو روزے کا حکم دیا گیا۔
(ابوداؤد جلد ا باب کیف الاذان المطبع المجیدی کانپور)	

اسی روایت کی دوسری سند میں ویصوم یوم عاشوراء کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ صوم عاشوراء کے بارے میں متفق علیہ احادیث معروف و مشہور ہیں۔ اس حدیث میں صراحت ہے کہ روزہ نہ رکھنے والوں کے لیے ایک مسکین کو کھانا کھلانے کی رخصت رمضان کے روزوں میں تھی جو آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ سے ختم کر دی گئی۔ اس رعایت کا ایام بیض کے روزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ثُمَّ انزل رمضان کے الفاظ اس پر بھی صراحت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں کہ رمضان کے روزے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

اٰمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ہی کی آیت سے فرض ہوئے تھے کیونکہ انہیں ابتدائی آیتوں میں ایک مسکین کو فدیہ دینے کی رعایت دی گئی تھی جو بعد کی آیت فلیصمہ سے منسوخ کر دی گئی۔ یہی بات حضرت عبداللہ ابن عمر اور سلمہ ابن اکوع رضی اللہ عنہما کی احادیث سے معلوم ہوتی ہے جن کو امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں اور دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے۔ ابن ابی لیلے نے یہی حدیث دوسری سند میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے واسطے سے روایت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلمہ بن اکوع وغیرہ اور حضرت معاذ بن جبل رضؓ کی حدیثوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ دونوں کے درمیان پورا توافق ہے۔ اسی مقام پر یہ بات بھی واضح کر دینا چاہیے کہ ابن ابی لیلے نے "حدثنا اصحابنا" کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں اس سے مراد صحابہ کرام ہی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن ابی شیبہ، ابن خزیمہ، طحاوی اور بیہقی کی روایتوں میں حدثنا اصحب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صراحت موجود ہے۔ جن اصحاب محمد سے ابن ابی لیلی نے یہ حدیث روایت کی ہے ان میں سے ایک حضرت معاذ بن جبل رضؓ بھی ہیں جن کا نام صراحت سے انھوں نے لیا ہے

حضرت معاذ بن جبل کی حدیث سے ایک نادرست استدلال

اس تفصیل کے بعد عرض ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذ بن جبل کی حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کی آیت اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰت اور فدیۃ طعام مسکین کی آیتوں کا تعلق رمضان کے روزوں سے نہیں ہے بلکہ ایام بیض اور یوم عاشوراء کے روزوں سے ہے۔ ان ایام کے روزے صوم رمضان سے پہلے فرض کیے گئے تھے۔ رمضان کے روزے فرض قرار دینے والی آیت شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن سے شروع ہوتی ہے۔ اپنی اس رائے پر انھوں نے ابوداؤد کی حدیث کے جس ٹکڑے سے استدلال کیا ہے وہ میں انہیں کے الفاظ میں یہاں نقل کرتا ہوں۔

یدل علیه ما اخرجه ابوداؤد	اس پر دلالت کرتی ہے وہ بات جو
فی احوال الصلوٰۃ والصیام عن	ابوداؤد نے حضرت معاذ سے احوال الصلوٰۃ و
معاذ قال: فان رسول الله صلی الله	الصیام کی حدیث میں روایت کی ہے انھوں نے
علیه وسلم کان یصوم ثلثة ایام من	کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے میں تین دن

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

گیتا اور رسالت

(سید جلال الدین عمری)

ہندو مذہب کی کتابوں میں ویدوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ویدوں کی روح اپنشد ہیں، جن میں ویدوں کے فلسفہ کو مرتب اور مدلل کیا گیا ہے لیکن ان کا انداز اتنا پرپیچ اور دقیق ہے کہ ان کا سمجھنا اور ان کی کوئی ایک متعین تعبیر کرنا بہت مشکل ہے۔ گیتا اس مشکل کو حل کرتی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس نے آسان انداز میں ویدوں کے فلسفہ کی ایک خاص تعبیر پیش کی ہے۔ یہ تعبیر ہندو مذہب کے ماننے والوں میں اتنی مقبول ہوئی کہ گیتا کو ویدوں کا عطر اور خلاصہ قرار دیا گیا۔ گیتا اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے پورے ہندو لٹریچر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے اور اس کی اتنی شرحیں اور تفسیریں لکھی گئی ہیں کہ شاید ہی ہندو مذہب کی کسی کتاب کی اتنی شرحیں لکھی گئی ہوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہندو عوام ہی نے نہیں بلکہ ان کے اہل علم نے بھی اس کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔

گیتا شری کرشن جی کے خیالات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے ارجن کے سامنے ظاہر کیے تھے۔ شری کرشن خدا کے اوتار سمجھے جاتے ہیں۔ اوتار کا تصور ہندو مذہب کی اور کتابوں میں بھی ہے۔ اس پر ہم الگ سے بحث کریں گے۔ یہاں ہم گیتا کا اس پہلو سے جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ وہ اشخاص جو خدا کے رسول کی حیثیت سے دنیا میں آتے رہے ہیں۔ ان کی تعلیمات اور گیتا کی تعلیمات میں کس حد تک ہم آہنگی یا تضاد ہے۔

گیتا کا موضوع وحدت الوجود کا فلسفہ ہے۔ پوری کتاب اسی فلسفے کے گرد گھومتی ہے اور اسی کی روشنی میں خدا کی ذات و صفات سے بحث کرتی اور کائنات سے اس کے تعلق کو متعین کرتی ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے اندر بلکہ کائنات کی ہر چیز کے اندر خدا کی روح موجود ہے۔ یہ نہ مرتی ہے اور نہ کوئی اس کو مار سکتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ "آتما (روح) کو جیسے اس جسم میں بچپن

جوانی اور بڑھاپا آتا ہے" لیکن اس کے باوجود وہ باقی رہتی ہے۔" ویسے ہی اس کا اورا ور جسموں میں داخل ہوتا ہے" (۲:۱۳) جسم ختم ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کے اندر کی آتما ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے "بے زوال اس کو سمجھ جو سب میں محیط ہے۔ اس لازوال کو کوئی فنا نہیں کر سکتا" (۲:۱۷) "جو اس کو مارنے والا جانتا ہے اور جو اس کو مرنے والا مانتا ہے وہ دونوں اس کو نہیں جانتے۔ یہ نہ مارتی ہے اور نہ مرتی ہے۔ نہ کبھی پیدا ہوتی ہے اور نہ مرتی ہے۔ نہ یہ وجود پاکر نیست ہو جاتی ہے۔ یہ پیدائش نہیں رکھتی۔ ہمیشہ لازوال اور قدیم ہے اور جسم کے مرنے سے نہیں مرتی" (۲:۱۹-۲۰) "جیسے انسان پرانے کپڑے اتار کر اور نئے کپڑے پہنتا ہے ویسے ہی آتما پرانے جسموں کو چھوڑ کر اور نئے جسموں میں داخل کرتی ہے" (۲:۲۲) کائنات میں جاندار اور بے جان دونوں طرح کی چیزیں ہیں لیکن خدا ہر چیز میں موجود ہے "اے ارجن میں کل اجسام کے بطن میں مقیم ہوں اور کل اجسام کی ابتدا اور وسط اور انتہا ہوں" (۱۰:۲۰) "کل مخلوقات کا تخم میں ہی ہوں۔ کوئی شے متحرک اور غیر متحرک ایسی نہیں ہے جس میں میں نہیں ہوں۔ میں نے ایک شمہ سے کل عالم کو نمود دے رکھا ہے" (۹:۴۲)

یہی نہیں کہ ہر چیز میں خدا موجود ہے بلکہ پوری کائنات خدا کی صفات سے وجود میں آئی ہے۔ "اے ارجن جب میں اپنی صفات کے بطن کو بارور کرتا ہوں اس وقت کل موجودات کا نشوونما ہوتا ہے اے ارجن جو تمام اقسام کے وجود پیدا ہوتے ہیں صفات ان کی ماں ہے اور میں پیدا کرنے والا باپ ہوں" (۱۴:۳-۴) قدیم فلسفہ کی رو سے ہوا، پانی، آگ اور مٹی یہ چار عناصر ہیں جن سے یہ عالم مادی وجود میں آیا ہے۔ گیتا کے نزدیک یہ سب خدا کی صفات ہیں "خاک، آب، آتش، باد، خلا، دل، عقل اور انانیت یہ آٹھ مختلف اقسام میری صفات کی ہیں" (۷:۴) اس کائنات کے اندر زندگی اور اس کے جو آثار موجود ہیں وہ بھی دراصل خدا ہی کی ایک 'قوت' ہے۔ "اے ارجن یہ تو ادنیٰ قوت تھی اس کے علاوہ میری ایک اور اعلیٰ قوت ہے جو کہ مادہ حیات ہے اور جس سے اس عالم کا قیام ہے تو سمجھ لے کہ تمام مخلوق اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ میں کل عالم کی پیدائش اور فنا کا مخزن ہوں" (۷:۵،۶)

جب کوئی کاریگر اپنی قابلیت سے کوئی چیز تیار کرتا ہے تو ہم اس چیز کو اس کی قابلیت سے الگ سمجھتے ہیں لیکن خدا کی صفات سے کائنات کے وجود میں آنے کا مطلب گیتا کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ کائنات اس کی صفات سے الگ ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کی صفات کائنات کی شکل میں

ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ کائنات کو خدا کی صفات کے ظہور اور نمود سے تعبیر کرتی ہے۔ "میں سب کا مبدا ہوں اور سب کا مجھ سے ظہور ہے۔" (۱۰: ۸) "میں اپنی قدرت کا حاکم بن کر قدرت کے وسیلے سے ضرور اس کل عالم کو بار بار ظہور دیتا ہوں۔" (۹: ۸) چیزوں کے وجود میں آنے اور فنا ہونے کے جس سرِ مست عمل کا ہم شب و روز اپنے چاروں طرف مشاہدہ کرتے ہیں وہ خدا کی صفات ہی کے اندر ہوتا رہتا ہے۔ صفات سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ "اے ارجن کل موجودات ایک زمانے کے انجام میں میری قدرت میں محو ہو جاتی ہے اور پھر ایک زمانے کے آغاز میں اس کو نمود دیتا ہوں۔" (۹: ۷)

خدا اور کائنات کے بارے میں یہ تصور اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو خدا کے رسول دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات کی کسی چیز میں نہ تو خدا کی ذات موجود ہے اور نہ اس کی صفات نے کائنات کی شکل اختیار کی ہے بلکہ وہ اس کی پیدا کردہ ہے۔ اس بیان کے درمیان تعلق خالق اور مخلوق یا صانع اور مصنوع کا ہے۔ خدائے تعالیٰ اپنے علم و حکمت سے اس کو چلا رہا ہے لیکن وہ اپنی ذات و صفات کے ساتھ اس سے بالکل الگ ہے۔ نہ کائنات اس میں گم ہے اور نہ وہ کائنات میں گم ہے۔ ۲۔ خدا کے رسول خدا کو ہر عیب سے پاک قرار دیتے ہیں وہ نہ تو اس کی ذات میں کسی نقص کو مانتے ہیں اور نہ اس کی صفات میں۔ خدا کا تصور ان کے نزدیک ایک ایسی ہستی کا تصور ہے جس کی طرف کسی چھوٹی سے چھوٹی خامی کو بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا لیکن وحدت الوجود کے فلسفہ کے تحت خدا کو بے عیب اور نقائص سے پاک قرار دینا مشکل ہے۔ کیونکہ جب پوری کائنات خدا ہی کی صفات کا ظہور ہے تو یہاں کی ہر خوبی اور خرابی اسی کی طرف منسوب ہو گی۔

گیتا اس نتیجے کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں بے شک خدا موجود ہے اور یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا سرچشمہ اسی کی صفات ہیں لیکن اس کی ذات ان تمام افعال سے جو اس کی صفات سے ظاہر ہو رہے ہیں بالکل الگ ہے۔ اس لیے کوئی بھی نقص یا خوبی اس سے متعلق نہیں ہو گی۔ "میری اس قدرت کاملہ کو دیکھ کہ نہ تو موجودات کا میری ذات میں قیام ہے اور نہ میری ذات باوجود موجودات کو قیام اور ظہور دینے کے موجودات میں مقیم ہے جیسے ہوا چاروں طرف زور سے چلنے پر بھی خلا میں رہتی ہے ویسے ہی کل موجودات کا قیام مجھ میں سمجھ لے۔" (۹: ۵-۶) مطلب یہ کہ جس طرح ہوا خلا میں ہونے کے باوجود اس سے الگ رہتی ہے اسی طرح خدا کی ذات ہر چیز میں موجود ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ ہے۔

جن اوصاف کو ہم اچھے اوصاف کہتے ہیں یا جن اوصاف کو برے اوصاف کہا جاتا ہے وہ سب کے سب خدا کی صفات سے وجود میں آتے ہیں: عقل، علم، ہوشیاری، تحمل، راست بازی، نفس کشی، ضبط دل، خوشی، رنج، پندار، ترک پندار، خوف، بے خوفی، رحم دلی، سکون، قناعت، ریاضت، فیاضی، نیک طلبی اور بدخواہی

و عمیق انسانوں کی مختلف خصلتیں کا ظہور مجھ سے ہوتا ہے " (۱۰ : ۴، ۵) خدا نے بعض انسانوں کو کسی کام کے لیے بعض کو حکومت و سیاست کے لیے، بعض کو تجارت اور زراعت کے لیے اور بعض کو ان تینوں طبقات کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے لیکن یہ سب کچھ اس کی صفات کا کرشمہ ہے۔ اس کی ذات اس سے آلودہ نہیں ہے۔ "صفت اور فعل کی تقسیم سے میں نے چار ورن پیدا کیے۔ گو میں ان کا خالق ہوں۔ مجھے فاعلیت سے برتر اور لازوال جان" (۴ : ۱۳) عمل، عمل کا احساس اور عمل کا نتیجہ ان سب کا تعلق خدا کی صفات سے ہے خدا کی ذات ان سے غیر متعلق ہے۔ "ذات اس عالم میں پندار فاعلیت کو، افعال کو اور افعال اور ان کے نتائج کے باہمی تعلق کو پیدا نہیں کرتی۔ یہ سب صفات سے پیدا ہوتے ہیں" (۵ : ۱۴) "نہ تو میں افعال میں آلودہ ہوتا ہوں اور نہ فعل کے نتیجے کی خواہش رکھتا ہوں" (۴ : ۱۴) غرض یہ کہ "ذات بے زوال آغاز اور صفت نہیں رکھتی۔ اس لیے وہ جسم میں مقیم ہو کر بھی کوئی فعل نہیں کرتی اور آلودہ نہیں ہوتی جس طرح خلا ہر شے میں محیط ہونے پر بھی بوجہ لطیف ہونے کے کسی شے سے آلودہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ذات مطلق سب جسموں میں محیط ہونے پر بھی آلودہ نہیں ہوتی" (۱۷ : ۳۲، ۳۳) اس لیے ظہور سے برتر، فکر سے بلند اور نقص سے بری و ورائی گئی ہے" (۲ : ۲۵) اس سے گیتا یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ خدا کو حق و باطل نہیں کہا جا سکتا" (۱۳ : ۱۳) "وہ سب حواس سے برتر ہے، سب سے بڑا ہے اور سب کو ظہور دیتا ہے۔ صفات سے منزہ ہے اور صفات کو تمیز کرتا ہے" (۱۳ : ۱۵) ایک دوسری جگہ گیتا کہتی ہے۔ "عالم میں دو قسم کی ہستی ہے۔ حادث اور قدیم کل موجودات حادث مانی گئی ہے اور جو ہستی تغیر و تبدل سے بری رہتی ہے وہ قدیم کہلاتی ہے۔ جو ذات پاک ان دونوں سے برتر ہے اسے ہستی بحت کہتے ہیں اور جو ہستی عالم سہ گانہ میں متصرف ہو کر اسے سہارتی ہے وہ غیر فانی جان ہے۔ چونکہ میں حدوث اور قدم سے برتر ہوں لہذا عوام الناس نے اور کتب علوم نے "ذات بے نشان" کے نام سے تعبیر کیا ہے" (۱۵ : ۱۶، ۱۸)

یہ عجیب و غریب فلسفہ شاید علمی تنقید کا زیادہ متحمل نہیں ہے۔ اس کو جوں کا توں ماننے کے بعد بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی صفات کا اس کی ذات سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ہم ان کو خدا کی صفات ہی کیوں کہیں اور اگر ہے تو ہم ان کے مظاہر کو اگر خدا کی طرف منسوب کریں تو اسے کس بنیاد پر غلط کہا جائے گا؟ اس معاملے میں گیتا کی الجھن یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو خدا کی ذات کو اس کی صفات اور ان کے مظاہر سے غیر متعلق قرار دینے کی کوشش کرتی ہے اور دوسری طرف اس تعلق کا بھی انکار نہیں کر پاتی جو ذات اور صفات کے درمیان موجود ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ کہتی ہے

"ذات صفات میں مقیم ہو کر ان خواص کو جو صفات سے پیدا ہوتے ہیں برداشت کرتی ہے اور خواص کے ساتھ اس کا تعلق ہونے سے نیک اور بد انسانوں کی پیدائش ہوتی ہے " (۱۳ : ۲۲) گویا خدا کی ذات اس کی صفات کاملہ ہے اور وہ ان خصوصیات سے جو صفات سے پیدا ہوتی ہیں دامن کش نہیں ہے بلکہ ان کو برداشت کر رہی ہے ۔ اس سے آگے گیتا کی بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی ذات ہی صفات سے کام لے رہی ہے ۔ مثلاً "واجب الوجود سب مخلوقات کے دل میں مقیم ہو کر ان کو اپنی قدرت کاملہ کے چرخ پر پھیرا تا ہے" (۱۸ : ۶۱)

اس قسم کے تضادات سے قطع نظر اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے اگر خدا کی صفات ہی کی طرف منسوب کیا جائے تو یہ محض الفاظ کا الٹ پھیر ہو گا اس سے اس کی ذات کی تنزیہ و تقدیس نہیں ثابت ہوتی ۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہو گی جیسے ہم کسی شخص کو نیک یا بد نہ کہیں بلکہ اس کے اعمال کی تعریف یا مذمت کریں اور اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اس کی ذات سے تعرض نہیں کیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فلسفہ کو ماننے کے بعد خدائے تعالیٰ کو بے عیب قرار دینا بہت مشکل ہے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ فلسفہ رسول کے تصور خدا سے قدم قدم پر ٹکراتا ہے کیونکہ وہ ایسے فلسفے کے سخت مخالف ہیں جس سے خدا کی تنزیہ و تقدیس میں ذرہ برابر فرق آئے ۔

۳ ۔ خدا کا رسول انسان سے اس حیثیت سے خطاب کرتا ہے کہ وہ عقل و شعور اور ارادہ و اختیار رکھنے والا وجود ہے ۔ وہ کسی بھی چیز کو قبول یا رد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ اس کے سامنے زندگی کی مختلف راہیں کھلی ہوئی ہیں ۔ ان میں سے کسی راہ کا دروازہ بند نہیں بنایا گیا ہے بلکہ جس راہ کو چاہے وہ اختیار کر سکتا ہے اور جس راہ کو چاہے چھوڑ سکتا ہے لیکن وحدت الوجود کا فلسفہ خالص جبر کا فلسفہ ہے ۔ وہ انسان کے اختیار اور ارادہ کی عین ضد ہے ۔ اس میں ہمیں انسان کا کوئی مستقل وجود ہی نہیں نظر آتا ، چہ جائے کہ اس کے اختیار اور ارادے کا سوال پیدا ہو ۔ اس کے نزدیک یہاں محض خدا کی ذات و صفات کا وجود ہے اور وہی سب کچھ کر رہا ہے ۔ اس کے وجود کے سوا نہ کوئی وجود ہے اور نہ اس کے عمل کے سوا کوئی عمل ہے ۔ گیتا میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے اور متعدد مقامات پر کہی گئی ہے ۔ شری کرشن جی ارجن کو جنگ پر آمادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں " پندار کی وجہ سے جو تیرا خیال ہے کہ میں نہیں لڑوں وہ غلط ہے ۔ کیونکہ خاصۂ قدرت تجھ سے جنگ کرائے گا ۔ اے ارجن جس فعل کے کرنے سے تو بوجہ نادانی انکار کرتا ہے وہ تجھے اپنے طبعی فرض سے مجبور ہو کر بے اختیاری کی حالت میں کرنا ہو گا " (۱۸ : ۵۹ ، ۶۰) "میں عالم کو

معدوم کرنے والی فنائے کبریٰ ہوں اور اس موقع پر عالم کو معدوم کرنے میں مصروف ہوں۔ یہ تو نہیں ہے کہ پھر بھی جتنے جوان مرد ہر دو لشکر میں موجود ہیں وہ سب معدوم ہو جائیں گے۔ پس اے تیر انداز تو کھڑا ہو اور نیک نامی حاصل کر۔ دشمنوں پر فتح پا کر سلطنت عظیم سے حظ اٹھا۔ ان کو تو میں نے پہلے ہی مار رکھا ہے تو برائے نام ایک ذریعہ بن جا۔ تو درونا چ، بھیشم پتامہ، جیدرتھ، کرن اور دیگر جوان مردوں کو جنہیں میں نے پہلے ہی مار رکھا ہے ہلاک کر۔ تامل نہ کر۔ اور جنگ کر۔ تو لڑائی میں دشمنوں پر فتح پائے گا۔ (۱۱: ۳۲-۳۴) جنگ کے میدان میں شری کرشن جی نے ارجن کو اپنا جلوہ دکھایا تو انھوں نے جو کچھ دیکھا اس کا ایک حصہ یہ ہے "یہ سب دھرت راشٹر کے بیٹے اور ان کے مددگار راجاؤں کے گروہ بھیشم پتامہ، درونا چاریہ رتھ بان کا بیٹا (کرن) اور نیز ہماری فوج کے دلاور آپ کے تیز دانتوں والے مہیب دہنوں میں نہایت تیزی کے ساتھ گھسے چلے جاتے ہیں اور ان میں سے کچھ پسے ہوئے سروں کے درازوں میں لٹکے نظر آتے ہیں۔ جیسے دریاؤں کی بے شمار لہریں سمندر میں جا کر گرتی ہیں ویسے ہی یہ مردان دلاور آپ کے شعلہ زن دہنوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ جیسے پروانے جلنے کے لیے بے اختیار ہو کر شعلہ پر گرتے ہیں ویسے ہی یہ سب لوگ جذبے میں آ کر مرنے کے لیے آپ کے دہنوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ اے عالم کے صاحب آپ اپنے روشن دہنوں سے سب لوگوں کو کھا کر خوب مزا لیتے ہیں اور آپ کی زبردست جلالی قوتیں سارے عالم کو روشن کرتی ہیں اور حرارت پہنچاتی ہیں" (۱۱: ۲۶-۳۰)
ایک اور جگہ گیتا جبر کے اسی فلسفے کو اس طرح بیان کرتی ہے "کوئی ایک لمحہ بھر بھی فعل سے خالی نہیں رہتا۔ قدرتی خواص اپنے زور سے سب فعل کراتے ہیں" (۳: ۵) "قدرت کے خواص سے سب فعل صادر ہوتے ہیں۔ جاہل بسبب پندار اپنے آپ کو ان کا فاعل مانتا ہے" (۳: ۲۷) "فعل کی پیدائش قدرت سے سمجھنی چاہیے اور قدرت کا ظہور بے زوال ہے۔ پس قدرت محیط ہو کر ہر وقت اپنا فعل کرتی رہتی ہے" (۱۵: ۴)

اس طرح وحدت الوجود کا یہ فلسفہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ جو ہونا چاہیے قدرت کے ہاتھوں از خود ہو رہا ہے۔ وہ مشیت کا پابند ہے۔ اس میں اتنی طاقت ہی نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے کسی معاملے میں کوئی قدم اٹھائے یا اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لے لیکن یہ فلسفہ انسان کی فطرت سے ہرگز کوئی مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ اس کی فطرت میں اس بات کا شدید احساس پایا جاتا ہے کہ وہ ایک با اختیار وجود ہے۔ پھر دو باتیں ایسی ہیں جو اس فلسفے پر عمل کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اپنے آپ کو

مشیت کا پابند سمجھ کر عمل کو ترک کردے تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ بقائے حیات کے لیے اپنے اختیار اور ارادے کو کام میں لانے پر مجبور ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے کسی عمل کو سوسائٹی اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھ سکتی کہ وہ خدا کی مشیت کے تحت وجود میں آیا ہے لہٰذا وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ان ہی اسباب کی وجہ سے شاید گیتا جبر کے فلسفے کے ساتھ حرکت اور عمل کا بھی مشورہ دیتی ہے۔ "اے ارجن گو مجھے نہ تینوں لوک میں کچھ کرنا ہے اور نہ کسی شئے کا جو حاصل نہیں ہے حاصل کرنا ہے۔ پھر بھی میں فعل کرتا ہوں" (۳: ۲۲) مطلب یہ کہ اس عالم میں جب کرشن جی اوتار بھی ترک عمل نہیں کر سکتے تو عام انسان کیسے عمل چھوڑ سکتے ہیں۔ "تو لازمی افعال کر۔ ان کا کرنا نہ کرنے سے بہتر ہے۔ ان کے ترک کرنے سے تو تیرے جسم کا قیام ناممکن ہو جائے گا" (۳: ۸) لازمی فعل کا چھوڑنا مناسب نہیں ہے غلطی سے اس کو چھوڑ دینا جہالت میں داخل ہے" (۱۸: ۷)

حرکت اور عمل کا یہ مشورہ گیتا کے پورے فلسفے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہ جبر اور اختیار کو جمع کرنا چاہتی ہے لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام ہے۔ غرض یہ کہ خدا کے رسول انسان کو ایک آزاد وجود مان کر خطاب کرتے ہیں اور گیتا ایک ایسے انسان کو اپنی ہدایات دیتی ہے جس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہو اور جو مشیت کا محض ایک آلہ ہے۔ انسان کی حیثیت کے بارے میں یہ دو متضاد نظریات ہیں۔ ان میں سے ایک اگر صحیح ہے تو دوسرا لازماً غلط ہوگا۔

۴۔ رسولوں کی بنیادی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ خدا ایک ہے اور انسان کو اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔ وہ پوری قوت کے ساتھ شرک اور اس کے تمام متعلقات کی تردید کرتے ہیں لیکن گیتا شری کرشن جی کو اس حیثیت سے پیش کرتی ہے کہ وہ خدا ہیں اور سب کو ان کی پرستش کرنی چاہیے۔ چنانچہ خود شری کرشن جی کہتے ہیں۔ "اے ارجن تو جو کچھ کرتا ہے، جو کچھ کھاتا ہے، جو کچھ ہوم کرتا ہے، جو کچھ خیرات کے طور پر دیتا ہے اور جو ریاضت کرتا ہے اسے مجھ سے منسوب کر" (۹: ۲۷) "مجھ میں دل کو لگا۔ میری پرستش کر۔ میرے واسطے یگ کر، میری بندگی کر۔ تو اس طریقے سے اپنی ہستی کو میرے حوالے کر کے مجھ میں واصل ہو گا" (۹: ۳۴) "اے ارجن جو قابل تعظیم انسان صفت رحمانی رکھتے ہیں وہ مجھ کو عالم کا مبدا اور غیر فنا سے برتر جان کر میری یاد کرتے ہیں۔ ثابت قدم انسان میری حمد و ثنا اور عبادت کرتے ہوئے اور صادق دل سے میری بندگی کرتے ہوئے میری پرستش میں ہمیشہ مشغول رہتے ہیں۔ بعض علمی ریاضت کے کرنے والے میری ذات کی جو کثرت کے

باعث عالم میں مختلف اشکال میں نمایاں ہے وحدت کے عقیدے سے پرستش کرتے ہیں۔ (۹ : ۱۳ - ۱۵)
"جو شخص آخری وقت میرا تصور کرتے ہوئے کالبد عنصری کو چھوڑتا ہے وہ مجھ میں وصل ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے جو بشر آخری وقت میں جس شے کا خیال کرتے ہوئے جسم کو ترک کرتا ہے، اے ارجن ہمیشہ وہ اس کا تصور کرنے کے سبب سے اسی کو پاتا ہے لہذا جنگ کرتے ہوئے تو ہر دم میرا تصور کر، دل اور عقل کو مجھ میں تفویض کرنے سے تو بے شک مجھے پائے گا۔ (۸ : ۵ - ۷)

کسی انسان کے بارے میں یہ تصور کہ وہ خدا یا اس کا اوتار ہے اور اس کی عبادت کی جانی چاہیے رسولوں کے تصور توحید سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ وہ کسی بھی شخص کو جو عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا ہو، جو بچپن، جوانی، بڑھاپے، بھوک پیاس، مرض و صحت، موت و حیات ہر چیز میں خدا کے بنائے ہوئے قوانین کا پابند ہو، خدائی کا مقام دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ خواہ اس نے کتنے ہی بڑے کارنامے انجام دیے ہوں اور اس میں کتنی ہی غیر معمولی خصوصیات کیوں نہ ہوں۔

گیتا میں شرک کی یہی ایک صورت نہیں ہے کہ کرشن جی نے اپنی پرستش کا مطالبہ کیا ہے، بلکہ وہ صاف الفاظ میں بتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کا بھی حکم دیتی ہے۔ "قادر مطلق نے مخلوقات کو ریاض کرنے کی قوت دے کر پیدا کیا اور ہدایت کی کہ تم اس کے وسیلے سے ترقی کرو۔ اس سے تمہارے مطالب پورے ہوں گے۔ تم اس سے دیوتاؤں کی خدمت کرو۔ وہ تمہیں عزت بخشیں گے۔ کوشش باہم کر سے تمہیں کمال درجے کی بہبودی حاصل ہوگی۔ ریاض سے خدمت کرنے پر دیوتا تمہیں ضروری اشیاء دیں گے۔ جو شخص ان کی دی ہوئی اشیاء کو انہیں دیے بغیر کھا لیتا ہے وہ چور ہے۔ (۳ : ۱۰ - ۱۲)

بعض ہندو مفکرین کے نزدیک شری کرشن جی کا اپنی پرستش کی دعوت دینا شرک نہیں ہے کیونکہ وہ خدا کے اوتار تھے اس لیے ان کی پرستش حقیقت میں خدا ہی کی پرستش ہے۔ البتہ دیوتاؤں کی پرستش کا حکم ان کے لیے الجھن کا باعث ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ وحدت الوجود کے تحت شرک کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیونکہ پرستش اس ہستی کی ہوتی ہے جس نے یہ کائنات پیدا کی اور جو اس کا مالک اور حاکم ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود کی رو سے یہ کائنات ایک ہی ذات سے نکلی ہے اور وہی اس کو چلا رہی ہے۔ شرک کو ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا ظہور ایک سے زائد ہستیوں سے ہوا ہے اور وہ اس میں متصرف بھی ہیں۔ گیتا چونکہ فلسفۂ وحدت الوجود کی علم بردار ہے۔ اس لیے ان کی رائے یہ ہے کہ دیوتاؤں سے اس کی مراد مجسم

اشیاء نہیں ہیں بلکہ خود انسان کے حواس ہیں۔ ان کی پرستش کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس کو کام میں لائے اور ان کی قوت بڑھائے۔ اسی سے اس کو مادی خوش حالی حاصل ہوگی لیکن ظاہر ہے کوئی بھی ایسی توجیہ جو صریح الفاظ سے ٹکراتی ہو وہ قائل کی منشا کے خلاف سمجھی جائے گی۔
گیتا نے جب صاف الفاظ میں دیوتاؤں کی پرستش کا حکم دیا ہے تو ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ اس میں شرک موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سمجھنا ہی صحیح نہیں ہے کہ وحدت الوجود اور شرک ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس فلسفہ کی فطرت میں شرک داخل ہے۔ جب کائنات کی ہر چیز میں خدا ہی کی ذات جلوہ گر ہے تو آدمی جس چیز کی بھی عبادت کرے وہ خدا ہی کی عبادت ہوگی۔ اسی وجہ سے یہ پورا فلسفہ توحید کے اس تصور سے جو خدا کے رسول پیش کرتے ہیں بالکل مختلف ہے۔ ان دونوں کو کہیں ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ خدا کے رسول خدا کا دین اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہی اس کی عبادت اور رضاجوئی کا صحیح طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جتنے طریقے ہیں وہ سب غلط اور باطل ہیں لیکن گیتا کے نزدیک خدا کی عبادت کا کوئی ایک ہی طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کے لیے جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے وہ صحیح ہے۔ چنانچہ شری کرشن جی کہتے ہیں "جو لوگ میرے جس طرح پر طالب ہوتے ہیں ان کو میں ویسا ہی نتیجہ دیتا ہوں۔ اے ارجن سب لوگ میرے ہی راستے پر چلتے ہیں" (۴ : ۱۱) خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنا رسولوں کے نزدیک وہ جرم عظیم ہے جو کبھی معاف نہیں ہوگا۔ لیکن گیتا کے نزدیک یہ محض غلط راستہ سے خدا تک پہنچنا ہے۔ اس لیے وہ اس کو کوئی سنگین جرم نہیں سمجھتی۔ وہ یہ فلسفہ بیان کرتی ہے کہ

"جو اور دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور اعتقاد کے ساتھ ان کا یگ کرتے ہیں۔ اے ارجن وہ بھی بے قاعدہ طور پر میری ہی پرستش کرتے ہیں" (۹ : ۲۳)

وحدت ادیان کا یہ تصور فلسفہ وحدت الوجود کے ساتھ تو جمع ہو سکتا ہے جہاں غیر از خدا کسی کا وجود ہی نہیں ہے لیکن رسولوں کی تعلیمات سے اس کی تطبیق ناممکن ہے۔

۶۔ خدا کا رسول انسانوں تک اس کے احکام پہنچاتا ہے۔ ان احکام کی اس کے نزدیک غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ان کو اس حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ وہ خدا کی رضا حاصل کرنے اور اس

کے غضب سے بچنے کا ذریعہ ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو شریعت، یعنی خدا کا بتایا ہوا طریقہ حیات کہا جاتا ہے۔ گیتا میں احکام تو بہت تھوڑے سے بیان ہوئے ہیں۔ البتہ اس طرح کی بعض اصولی باتیں اس میں ضرور موجود ہیں کہ "نیک اعمال، خیرات اور زہد عارفوں کے قلب میں صفائی پیدا کرتے ہیں پس نیک اعمال، خیرات اور زہد کے فعلوں کا ترک واجب نہیں بلکہ ان کا کرنا ہی واجب ہے" (۱۸: ۵) "راجہ جنک وغیرہ کاروبار کرتے کرتے درجۂ کمال پر پہنچے تھے۔ پس عالم کی بہتری کو مدنظر رکھ کر تجھے فعل کرنا لازم ہے" (۳: ۲۰) ایک جگہ شاستر پر عمل کی تاکید کرتے ہوئے کہا گیا ہے "جو شخص شاستر کے اصول کے خلاف اپنی مرضی کے موافق عمل کرتا ہے وہ کمال کو نہیں پاتا اور آسائش اور اعلیٰ درجہ سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے تجھے ان اصول سے واقف ہو کر جو شاستر میں امر و نہی کی تقسیم کے بارے میں درج ہیں۔ شاستر کی ہدایت کے موافق عمل کرنا واجب ہے" (۱۶: ۲۳-۲۴)

احکام شریعت کے بارے میں گیتا کا یہ ایک رخ ہے اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس میں ان کا استخفاف پایا جاتا ہے وہ ان کو وہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہے جو خدا کے رسول دیتے ہیں۔ چناں چہ ویدوں میں جو احکام ہیں ان کے بارے میں وہ کہتی ہے۔ "اے ارجن جو کم فہم وید کی (عملی) بحث کے شائق خواہشات دل میں رکھنے والے اور بہشت کی امید کرنے والے ہیں وہ لذات اور دولت حاصل کرنے کے واسطے ایسے رجا کے کلام کہتے ہیں جن میں زندگی کے اعمال کے نتیجے ملنے کا اقرار کیا جاتا ہے اور طرح طرح کی رسومات ادا کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے اور بیان کرتے ہیں کہ ان کے سوائے کچھ نہیں ہے"۔ (۲: ۴۲، ۴۳) مطلب یہ کہ ویدوں کے احکام کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انسان جنت میں پہنچے گا لیکن یہ کوئی اعلیٰ مقام نہیں ہے۔ "برہم کے جاننے والے عارف کا ویدوں سے اتنا ہی مطلب باقی رہتا ہے جتنا کہ بے پیاسے انسان کا کنوئیں، تالاب، دریا وغیرہ مقامات آبی سے" (۲: ۴۶) یعنی جس طرح کسی ایسے شخص کو جسے پیاس نہ ہو، کنواں اور تالاب وغیرہ بے کار ہیں۔ اسی طرح عارف کے لیے وید کے احکام بے سود ہیں۔ ایک موقع پر شری کرشن جی نے ارجن کو اپنا جلوہ دکھایا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں "جیسا تو نے مجھے دیکھا ہے ویسا میں وید کے پڑھنے، ریاضت کرنے، خیرات دینے اور یگ کرنے سے نہیں دیکھا جاسکتا" (۱۱: ۵۳)

۷۔ خدا کے رسول کی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ انسان ہر معاملہ میں خدا کی طرف رجوع کرے، مشکلات میں اسی کو پکارے، اسی سے مدد چاہے، اسی سے خوف کھائے، اسی سے امید رکھے، اس کی سزا سے بچنے

اور اس کی جزا کے پانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ خدا کے عذاب سے بچ جائے اور اس کے انعام کا حق دار قرار پائے لیکن گیتا کے نزدیک یہ سب بہت ہی ادنیٰ مقاصد ہیں۔ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کی ذات میں مل جائے۔" اے ارجن مجھے چار قسم کے نیک انسان یاد کرتے ہیں۔ مصیبت زدہ، طالب گار عقبیٰ، غرض مند اور عارف۔ عارف ذات میں ہمیشہ وصل رہتا ہے اور عشق حقیقی رکھتا ہے اس لیے ان سب میں افضل ہے۔ میں عارف کو از حد عزیز ہوں اور وہ مجھے عزیز ہے۔ یہ سب اچھے ہیں لیکن عارف کو تو میں اپنی جان ہی مانتا ہوں کیونکہ وہ صاحب دل میرے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہے۔" (۷: ۱۶ - ۱۸) ذات میں وہ شخص ضم ہوتا ہے۔ " جو مجھ کو سب میں اور سب کو مجھ میں دیکھتا ہے۔ اس سے میں جدا نہیں اور وہ مجھ سے جدا نہیں ہوتا۔" (۶: ۳۰)

گیتا کا بیان ہے کہ خدا کی ذات میں گم ہونے کے بعد انسان کو اپنے وجود کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہر چیز کو خدا کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کائنات کی وسعتیں اس کے اندر اس طرح سما جاتی ہیں جیسے وہ خدا کے اندر سمائی ہوئی ہیں۔ اس کے اعمال خدا کے اعمال بن جاتے ہیں۔ وہ ان کے اچھے اور برے نتائج سے اسی طرح بے نیاز ہو جاتا ہے جیسے خدا بے نیاز ہے۔ اس کو خوشی اور غم، رنج و راحت دوستی یا دشمنی، مرض و صحت کوئی بھی چیز متاثر نہیں کرتی۔ وہ کسی خوبی پر نہ تو فخر کرتا ہے اور نہ کسی خامی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مٹی اور سونا اور ہیرا اور پتھر سب برابر ہو جاتے ہیں اور اس کی فکر اور عمل خدا کے فکر و عمل میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں گیتا نے بڑی ہی صراحت کے ساتھ کہی ہیں۔ ہم اس کی بعض تصریحات نقل کرتے ہیں۔

"جو یوگی ذات میں وصل ہو جاتا ہے اور سب کو مساوی جانتا ہے وہ اپنے آپ کو کل مخلوقات میں اور کل مخلوقات کو اپنی ذات میں موجود دیکھتا ہے۔" (۶: ۲۹) اس حقیقت سے" واقف ہو کر تو اے ارجن پھر ایسی غفلت میں گرفتار نہیں ہو گا اور جس کے ذریعے سے تو کل عالم کو اپنے اندر بعد ازاں مجھ میں موجود دیکھے گا۔" (۴: ۳۵) "باعلم و تہذیب برہمن، گائے، ہاتھی، کتے اور چنڈال سب میں عارف ذات کو مساوی دیکھتا ہے۔" (۵: ۱۸) "سنیاسی اور یوگی وہ شخص ہے جو نتیجہ پر نظر نہ رکھ کر فعل کرتا ہے، نہ کہ وہ شخص جو آگ کو استعمال میں نہیں لاتا یا مذہبی پابندیاں چھوڑ دیتا ہے (۱: ۶)

"جو بشر افعال میں ترک افعال کا ہونا اور ترک افعال میں افعال کا ہونا مشاہدہ کرتا ہے وہ عارف اور واصل ہے۔" (۴ : ۱۸) وہ یوگی جس کا دل علم و سرور سے معمور ہے اور جو آزاد رہتا ہے اور حواس پر قابو رکھتا ہے اور جس کے نزدیک مٹی، پتھر اور سونا مساوی ہے ذات میں وصل کہا جاتا ہے جو محب دوست، دشمن اور بے غرض کو، دوستی اور دشمنی یکساں رکھنے والے کو، بیگانے اور یگانے کو نیک افعال اور بد افعال کو مساوی خیال کرتا ہے وہ اعلیٰ ہے۔" (۶ : ۸، ۹) "جو انسان علم، شوق اور نادانی کی حالتوں کے طاری ہونے پر ان سے بچنا نہیں چاہتا۔ اور ان کے موجود نہ ہونے پر ان کے ہونے کی تمنا نہیں کرتا اور کسی شے کے ساتھ دل بستگی نہ رکھ کر صفاتی تغیرات کے اثر کو قبول نہیں کرتا اور یہ جان کر کہ کل حرکتیں صفات سے پیدا ہوتی ہیں سکون و قرار رکھتا ہے اور رنج و راحت میں مساوی اطمینان رکھتا ہے، لوہے پتھر اور سونے کو یکساں جانتا ہے بھلائی اور برائی کے پیش آنے پر یکساں مستقل رہتا ہے اور اپنی تعریف اور ہجو کو یکساں خیال کرتا ہے اور جس کے نزدیک عزت اور اہانت، دوست اور دشمن مساوی ہیں اور جس کو سب فعلوں سے آزادی حاصل ہے اس کو صفاتی تعلقات سے آزاد کہنا چاہیے۔ جو بشر عشق حقیقی کے وسیلے سے میرا طالب ہوتا ہے وہ ان صفات پر عبور پا کر واجب الوجود میں وصل ہوتا ہے۔" (۱۴ : ۲۲ - ۲۶)

خدا کے رسولوں کی تعلیم اس پورے فلسفے کے خلاف ہے۔ ان کے نزدیک انسان خدا کا بندہ ہے اور بندہ خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے بندہ ہی رہتا ہے۔ اس کے فکر و عمل میں غلطیاں ہو سکتی ہیں لیکن خدا ہر غلطی سے پاک ہے۔ وہ اپنے ساتھ بے شمار حاجتیں رکھتا ہے لیکن خدا ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ اس کی معلومات بہت محدود ہیں لیکن خدا کا علم زمین و آسمان کو محیط ہے، اس کو حکمت و دانائی کی بہت تھوڑی سی مقدار ملی ہے لیکن خدا کی حکمت بے پایاں اور اس کی نظر غیر محدود ہے۔ اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اپنی اس محدودیت کو ختم کر کے خدا کی لامحدود ذات میں گم ہو جائے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ خدا نے اس کو جو علم و بصیرت عطا کیا ہے اس کے ذریعے اس دنیا میں خیر کو تلاش کرے اور شر سے بچے۔ اسی میں اس کی کامیابی ہے اور یہی اس کی معراج ہے۔

۸۔ رسولوں کے نزدیک خدا کی عبادت انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس کے ذریعہ وہ خدا سے اپنا تعلق مضبوط کر سکتا ہے، اس کا مقرب اور محبوب بن سکتا ہے، اس کے الطاف و عنایات کا مستحق

ہو سکتا ہے، اس کی عقوبت اور سزا سے بچ سکتا ہے لیکن اس کی ذات میں فنا نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس گیتا عبادت کا اعلیٰ تصور یہ پیش کرتی ہے کہ عابد، معبود اور عبادت کا فرق مٹ جائے اور سب ایک ہو جائیں۔ "جو یگ کرنے کے آلہ کو، یگ میں ڈالنے کی شے کو، یگ کی آگ کو، یگ کرنے والے کو اور یگ کرنے کو ذات واحد تصور کرتا ہے اس کا ذات واحد سے وصال ہوتا ہے۔" (۴: ۲۴)

۹۔ جو شخص ذات و صفات کے فرق کو سمجھ لے اور ذات میں مل جائے۔ گیتا کہتی ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح کام کرتا ہے کہ اس کے نتائج سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس کے اعمال خدا کے اعمال ہوتے ہیں اس لیے ان کی ذمہ داری بھی اس پر عائد نہیں ہوتی۔ شری کرشن جی، ارجن کو جنگ پر آمادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "جس نے اس لافانی ہمیشہ پیدائش سے برتر اور بے زوال کو جان لیا ہے وہ انسان اے ارجن کیوں کر کسی کو ایذا پہنچاتا ہے اور کسی کو مارتا ہے۔" (۲: ۲۱) "جو اپنے آپ کو کسی فعل کا فاعل نہیں مانتا ہے اور جس کی عقل آلودگی سے صاف ہو جاتی ہے وہ سارے عالم کو مار کر بھی نہ قاتل بنتا ہے اور نہ گناہگار۔" (۱۸: ۱۷) اس لیے گیتا کی ہدایت ہے کہ "فعلوں کے کرنے کا تجھے استحقاق ہے لیکن ان کے نتیجے پر نظر نہ رکھ۔ نتائج اعمال کو ان کے کرنے کی وجہ نہ ہونے دے۔ ترک افعال نہ کر۔" (۲: ۴۷)

گیتا کہتی ہے کہ ذات میں مل جانے کے بعد انسان نہ صرف یہ کہ اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہو جاتا ہے بلکہ گناہ و ثواب سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ وہ کسی عمل کو نہ تو اس لیے کرتا ہے کہ وہ کار ثواب ہے اور نہ اس لیے اس سے باز رہتا ہے کہ وہ گناہ کا کام ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا سے الگ ہی نہیں سمجھتا کہ گناہ و ثواب کا تصور کرے، بلکہ اس کے نزدیک وہ اعمال بھی جو بظاہر اس کے دست و پا سے سرزد ہوتے ہیں خدا ہی کے اعمال ہوتے ہیں۔ "یوگی اس طرح پر شغل کرنے کی بدولت گناہوں سے آزاد ہو کر وصال ذات کی بے انتہا راحت کو بآسانی حاصل کرتا ہے۔" (۶: ۲۸) "جن نیک افعال اور با اعتقاد انسانوں کے گناہ معدوم ہو جاتے ہیں وہ نظر دوئی کے نقص سے بری ہو کر مجھے یاد کرتے ہیں۔" (۷: ۲۸) "سکھ، دکھ، نفع و نقصان، فتح و شکست کو مساوی سمجھ کر جنگ میں مشغول ہو تو اس طرح پر گناہ گار نہ ہوگا۔" (۲: ۳۸)

خدا کے رسول بتاتے ہیں کہ غیر مکلف نابالغ بچے ہوتے ہیں یا پاگل۔ جس شخص کے ہوش و حواس باقی

ہوں اور وہ بھلے برے کی تمیز کر سکتا ہو، وہ جو کچھ کرے گا اس دنیا میں بھی اس کو اس کے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا اور آخرت میں بھی وہ خدا کے نزدیک اس کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔ ان کے نزدیک یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ نتائج اعمال سے بچنے کے لیے انسان ایسے طریقے اختیار کرے جس سے عقل و خرد جاتی رہے، کیونکہ یہ جان بوجھ کر خدا کی ایک نعمت کو ضائع کرنا ہے جس کے لیے اسے جواب دینا ہوگا۔

۱۰۔ گیتا میں تناسخ کا تصور بہت وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن رسولوں کی تعلیمات اس کی بالکل مخالف ہیں۔ تناسخ کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان جس قسم کا عمل کرتا ہے مرنے کے بعد اسی کے مطابق ایک نئے جسم کے ساتھ پھر اسی دنیا میں لوٹ آتا ہے۔ اگر اس کا عمل اچھا ہے تو اچھا جسم نصیب ہوگا اور برا ہے تو برا جسم ملے گا۔ تا آنکہ وہ اپنے حسن عمل سے خدا کی ذات میں ضم ہو جائے۔ جب تک اس کی شخصیت خدا میں ضم نہ ہو جائے وہ آمد و رفت کے چکر میں پڑا رہے گا۔ اس لیے گیتا کی انسان کو ہدایت ہے کہ وہ اس مقام کو تلاش کرے جہاں پر پہنچ کر بازگشت نہیں ہوتی اور اس ذات بے ہدایت کو پاوے جس کے باعث اس عالم کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے چلا آیا ہے۔" (۱۵ : ۴) "جو لوگ اس علم کے فیض سے مجھ میں وصل ہو جاتے ہیں، وہ پیدائش کی قید میں نہیں آتے اور موت سے امن میں رہتے ہیں۔" (۱۴ : ۲) "جہاں سورج، چاند اور آگ کی روشنی کا دخل نہیں ہے اور جہاں پہنچ کر بازگشت نہیں ہوتی وہ اعلیٰ مقام میرا ہے۔" (۱۵ : ۶)
"جو شخص یوگ سے بے بہرہ رہ جاتا ہے وہ نیک افعالوں میں پہنچ کر اور زمانہ دراز وہاں رہ کر یا تو نیک افعال دولتمندوں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے یا دانشمند یوگیوں کے خاندان میں پیدا ہوتا ہے مگر دنیا میں اس قسم کی تولید بہت نادر ہوتی ہے۔" (۶ : ۴۲) "جو تینوں ویدوں کے معتقد سوم کے رس کو پی کر گناہوں سے پاک ہو کر اور یگ کر کے بہشت کے طالب ہوتے ہیں وہ بہشت کی آرام گاہ میں پہنچ کر عمدہ اور دل کش لذات بہشتی حاصل کرتے ہیں اور اس بلند مقام میں حظ نفس اٹھا کر ثواب کے ختم ہونے پر عالم فانی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس طور پر جو لوگ خواہشوں کے پابند ہیں اور تینوں ویدوں کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں وہ آمد و رفت میں رہتے ہیں۔" (۹ : ۲۰ - ۲۱) ایک جگہ برے انسانوں کا ذکر کرتے ہوئے کرشن جی کہتے ہیں "ان موذی بے رحم، ارذل الخلائق، بدخصلت انسانوں کا تنزل میں شیطانی نسل میں ضرور کرتا ہوں۔" (۱۶ : ۱۹) ایک دوسرے مقام پر ہے۔ "اے ارجن جو بدعقل شیطانی نسل کو کئی مرتبہ پا کر بھی میرا وصال حاصل نہیں کرتے وہ پستی میں گرتے ہیں۔" (۱۹ : ۲۰) تناسخ کے اس چکر سے انسان اسی وقت نجات پا سکتا ہے جب کہ وہ خدا کی

ذات میں گم ہو جائے۔" صاحب دل کمال کے اعلیٰ درجے پر پہنچ کر اور مجھ میں وصل ہو کر فنا ہونے والے اور مکرر پیدائش کی تکلیف رکھنے والے عالم میں نہیں آتا۔ اے ارجن برہم کی منزل تک جتنے منازل ہیں وہ سب گردش میں ہیں لیکن مجھ میں وصل ہو کر پھر پیدائش ممکن نہیں ہے۔" (۸: ۱۵-۱۶)

خدا کے رسول تناسخ کے بالمقابل آخرت کا تصور پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد انسان کو صرف ایک زندگی ملے گی اور وہ آخرت کی زندگی ہے۔ موجودہ دنیا عمل کی جگہ ہے اور آخرت جزا کا گھر۔ اس دنیا میں انسان کا عمل جیسا کچھ ہو گا آخرت کی زندگی اسی کے مطابق ہو گی۔ یہ دنیا ایک وقت خاص میں ختم ہونے والی ہے لیکن آخرت ہمیشہ باقی رہے گی۔ وہاں جس کو کامیاب زندگی ملے گی وہ پھر ناکامی سے دوچار نہ ہو گا اور وہاں جس کی ناکامی کا فیصلہ ہو گا اس کو کامیابی کی علوت کبھی نصیب نہ ہو گی۔

رسولوں کی تعلیمات اور گیتا کے درمیان ہم نے چند موٹی موٹی باتوں میں موازنہ کیا ہے۔ اس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گیتا اپنی بنیادی فکر اور روح کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ بہت سی تفصیلات میں بھی رسولوں کی تعلیمات سے ٹکراتی ہے اس لیے یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔
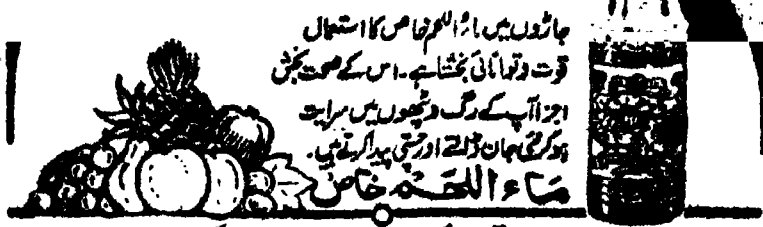
(قسط ۲)

(ڈاکٹر عبدالحق انصاری)

مختلف زاویے

مقصد زندگی کے اسلامی نظریے کے مطالعے کے ضمن میں عبادت، تقویٰ احسان، خلافت، تزکیہ، رضائے الٰہی اور ترجیح آخرت کے تصورات کی تفصیلی بحث اوپر گذر چکی ہے۔ یہ مختلف الفاظ دراصل مقصد زندگی کے جامع تصور کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں یا مختلف زاویوں سے اس جامع حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

زندگی کی سب سے بنیادی حقیقت خدا کا بندہ ہونا ہے۔ پوری زندگی خدا کی عظمت و کبریائی اور اس کے انعامات و احسانات کے گہرے شعور کے ساتھ ایک ادنیٰ غلام اور وفادار بندے کی طرح گذارنا وہ عبادت جامعہ ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا۔ اس عبادت جامعہ میں خدا کی تعظیم و تسبیح یا پرستش اس کے احکام کی اطاعت اس کی نافرمانی سے گریز، اس کی ناخوشی کا خوف (تقویٰ) اس کے دین سے محبت اور اس کی مرضی کی طلب (احسان) اس کی شریعت کا نفاذ اور اس کی حکومت کا قیام (خلافت) سب کچھ غلامی، بندگی اور عبادت ہے۔

خدا کے دین کی اقامت اور اس کے قانون کی حکومت جو خلافت کا بنیادی مفہوم ہے اس وسیع عبادت کا ایک مخصوص اور اہم پہلو ہے۔ مگر خدا کے حکم کا نفاذ دوسروں سے پہلے خود اپنے نفس پر ہونا چاہیے اس کی بادشاہت باہر سے پہلے خود اپنے گھر میں اور اپنے گھر سے پہلے خود اپنی ذات میں قائم ہونی چاہیے۔ اس اعتبار سے خلافت اور عبادت کے حدود ایک ہو جاتے ہیں اور کار بندگی اور کار خلافت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

عبادت اور خلافت کے تصورات مقصدِ زندگی کو خدا کے تعلق سے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی کے مقصد کے فہم کا ایک زاویہ یہ ہے۔ دوسرا زاویہ خود زندگی کے تعلق سے دیکھنے کا ہے۔ اس زاویے سے نظر ڈالیے تو زندگی کا مقصد تزکیہ یعنی اصلاح و تہذیب اور تکمیل و ترقی ہے۔ مگر یہ زاویۂ نظر فرد کی ذات کا زاویہ نظر ہے۔ معاشرے کے اعتبار سے یہی تکمیل ذات کا مقصد تعمیر معاشرہ اور نظام اسلامی کے قیام کا نصب العین ہے۔

پھر اگر اس مقصد کے حصول کی کوششوں کے محرک اور آخری محرک کو پیش نظر رکھا جائے تو اس مقصد کی تحصیل رضائے الٰہی کی طلب ہوگی۔ اگر اس مقصد کی خاطر ساری جدوجہد پر اس زاویے سے نظر ڈالی جائے کہ اس جدوجہد کے ہر ہر قدم پر دنیا کے ادنیٰ عارضی اور حقیر مقاصد کو اس توقع پر قربان کرنا ہوتا ہے کہ موت کے بعد ایک ایسی زندگی ملے گی جو روح و جسم دل و دماغ کے ہر سکون، ہر لذت اور مسرت کے اعتبار سے کامل ہوگی تو یہ ترجیح آخرت ہے۔ مگر اس ترجیح آخرت میں اس دنیا کی بہترین تعمیر اور تکمیل بھی مضمر ہے۔ اس لیے یہ مقصد بیک وقت دنیا اور آخرت کی بہتر اعلیٰ اور مکمل زندگی کو ایک پست ادنیٰ اور ناقص زندگی پر ترجیح دینا ہے۔

<u>مختلف اہمیتیں</u>

عبادت، خلافت، تقویٰ، احسان وغیرہ الفاظ مقصدِ زندگی کی تشریح مختلف زاویوں سے ہی نہیں کرتے اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں بھی کرتے ہیں اور ان کی اہمیتیں اجاگر کرتے ہیں۔ عبادت اگرچہ اپنے وسیع معنے میں پوری زندگی پر حاوی ہے لیکن عبادت میں خدا اور بندے کے درمیان نجی اور ذاتی تعلق کا پہلو انسان کے آپس کے تعلقات کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن و سنت میں عبادت کا لفظ زیادہ تر اسی تعلق اور اس کی مختلف صورتوں اور شکلوں کے سیاق میں آیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا کی یاد تسبیح و تکبیر، حمد و تعظیم، نماز و روزہ، قربانی و حج، دعا اور استعانت اور اسی قبیل کے دوسرے افعال عبادت کی معروف اور اظہار بندگی کی انتہائی شکلیں ہیں۔ اسی لیے اس حقیقت کے باوجود کہ زندگی کا مقصد عبادت جامعہ ہی ہے جو ساری اطاعتوں پر یکساں حاوی ہے۔ عبادت کے لفظ سے جن اعمال اور جن اطاعتوں کی اہمیت دوسری اطاعتوں کے مقابلے میں زیادہ ابھر کر آتی ہے وہ بھی معروف عبادات ہیں۔

خلافت کے تصور میں انسان اور انسان کے باہمی تعلقات کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ قرآن و سنت میں خلافت کا لفظ اکثر اسی سیاق میں آیا ہے۔ اسی لیے اگرچہ بنیادی تصور کے اعتبار سے خلافت و نیابت کا نظریہ امور نفس اور امور خدا سبھی کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے لیکن اس نظریے میں دین کے اجتماعی پہلو، اس کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام ہی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

قرآن و سنت میں عبادت اور خلافت دونوں تصورات کو اپنانے اور مقصد زندگی کی تشریح و تعبیر میں ان سے کام لینے کی غرض دین کے دونوں ہی پہلوؤں کی اہمیت کو ابھار کر پیش کرنا ہے، اور کسی ایک پہلو کی اہمیت بڑھانے اور دوسرے کی اہمیت کو گھٹانے سے روکنا ہے۔ مقصد زندگی کے اسلامی نظریے کی تشکیل میں ان دونوں تصورات کو یکساں دخل ہے۔ جب کبھی ان تصورات میں سے کسی کی اہمیت زیادہ بڑھائی جائے گی اور دوسرے کو نظر انداز کیا جائے گا تو ہمیشہ مقصد زندگی کا یک طرفہ اور ناقص نظریہ سامنے آئے گا۔

یہ بات صرف امکانی اندیشے کی حد تک نہیں ہے۔ ہماری تاریخ میں ایسا ہوا بھی ہے۔ دور اول میں عبادت اور خلافت کے دونوں تصورات کی اہمیت یکساں طور پر واضح تھی۔ بعد کے ادوار میں مختلف حلقوں میں ان تصورات کی صحیح باہمی اہمیت باقی نہ رہی۔ جن حلقوں میں عبادت پر زور دیا گیا ان کے اندر خلافت کا تصور دھندلا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا ذکر بھی ختم ہو گیا۔ یا اس کی نئی توجیہات پیش کی گئیں جو خلافت کے اس تصور سے بے حد مختلف تھیں۔ یہ حلقہ اہل تصوف اور اہل فلسفہ کا حلقہ ہے یہ کہنا تو خلاف واقعہ ہوگا کہ صوفیا کے حلقے میں ایسی شخصیتیں نہیں ملتیں جو خلافت کے تصور سے آشنا ہوں، جنھیں اس کی اہمیت کا شعور ہو۔ بلاشبہ ان میں ایسے افراد کی ایک معتد بہ تعداد ایسی ہے جنھیں اس تصور کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا اور جن کی کتابوں اور تصنیفات میں یہ تصور کم و بیش واضح کیا گیا ہے۔ لیکن تصوف کی اکثر اہم کتابیں اس تصور سے یا تو خالی ہیں، یا اس کی صحیح اہمیت سے ناآشنا ہیں۔

اس کے برخلاف دین کے دوسرے حلقوں میں خلافت کا تصور فکر کی بنیاد ہے۔ اسی تصور پر انسان، معاشرہ اور اسلامی نظام و ریاست کی توجیہ و تشریح کی عمارت اٹھائی گئی ہے اور افراد اور جماعتوں کی اصلاح، تربیت اور تنظیم میں اس کو اولین مقام عطا کیا گیا ہے۔ ان حلقوں میں عبادت کے تصور کو وہ مقام نہیں مل سکا ہے اور اسے وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جس کا فی الواقع یہ مستحق ہے۔

عبادت اور خلافت کے تصورات ایک اور اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تہذیب اخلاق اور تعمیر معاشرہ کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے افراد کے مفاد، مقصد، بھلائی اور کامیابی کو اپنے ذاتی مفاد، مقصد، بھلائی اور کامیابی کے مقابلے میں کیوں ترجیح دے، یا کم از کم اس کے برابر قدر و قیمت کا حامل کیوں کر سمجھے اور اس کے حصول میں تعاون کیوں کرے اور ویسی ہی کوشش کیوں کرے جو وہ اپنے مفادات اور مقاصد کے لیے کرتا ہے۔

اس مسئلہ کے حل کی دوسری کوششوں اور ان کے نقائص سے یہاں بحث نہیں ہے۔ اس مسئلے کا اسلامی حل عبادت اور خلافت کے تصور میں پنہاں ہے۔ زندگی کا مقصد خدا کی عبادت قرار دے کر اسلام نے خدا کے ہر حکم کی اطاعت اور ہر مرضی کی تکمیل کو خدا کی عبادت قرار دیا ہے خواہ اس کا تعلق اپنی ذات سے ہو یا دوسروں کی بھلائی سے۔ دونوں ہی یکساں مطلوب اور یکساں مقصود ہیں۔ فرائض اور ترغیبات کی تقسیم کی بنیاد ذات اور غیر کے امتیاز پر قائم نہیں ہے اور نہ امور خدا اور امور عباد کی تفریق پر۔ جان و مال کی حفاظت، روح و جسم کی ترقی اور ذہنی اور قلبی سکون اور مسرتوں کے سلسلے میں اسلامی تعلیم یہ نہیں ہے کہ انھیں صرف اس حد تک مقصد بنایا جائے اور ان کے لیے کوشش کی جائے جس حد تک کہ ان کا تعلق خود اپنی ذات سے ہو اور جس حد تک ان کا تعلق دوسروں کی ذات سے ہو، وہ افراد کے مساعی کا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی اور دوسروں کی جسمانی اور روحانی ذہنی اور قلبی ساری مسرتیں، ساری بھلائیاں اور ہر طرح کا سکون ہر ہر فرد کے لیے اس کی اپنی حد وسع تک اس کی زندگی کا مقصد اور نصب العین ہے۔ اور یہ مقصد اسی طرح خدا کو عزیز، محبوب اور مطلوب ہے جس طرح اس کی تسبیح و تکبیر، یاد اور عبادت۔ تکمیل بندگی جو اسلامی نقطہ نظر سے انسان زندگی کا آخری مقصود ہے اور انسانی ترقیات کی آخری منزل ہے۔ ذکر و عبادت، اخبات و خشوع، تزکیہ نفس، تکمیل ذات اصلاح معاشرہ، اقامت دین، قیام نظام اسلامی ان سارے ہی میدانوں میں مسلسل جد و جہد، انتہائی کوشش، سرگرم اور مخلصانہ عمل سے عبارت ہے۔

خلافت کے تصور کی اصل یہ ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے، جس چیز پر اس کو کسی طرح کی قدرت حاصل ہے، جس چیز پر وہ اپنے اثرات اور اختیارات کسی معنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے، اس میں تصرف کے اختیارات اس کو خدا کے نائب ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں نہ کہ ایک آزاد اور خود مختار مالک

کی حیثیت سے۔ ان چیزوں کے دائرے میں دوسرے انسان، جاندار اور بے جان مخلوق اور خود
انسان کی اپنی جان، اپنا مال، جسم و روح کی قوتیں اور ذہنی اور قلبی صلاحیتیں سبھی داخل ہیں۔ ان
ساری چیزوں پر نائب بنایا گیا ہے اور اسے ان ساری چیزوں کو یکساں خدا کی امانت سمجھ کر یکساں
احساس ذمہ داری کے ساتھ اس طرح اپنے اختیارات استعمال کرنے چاہییں کہ ان چیزوں سے وہ مقصد
حاصل ہو جن کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ انسان اس کا مجاز نہیں ہے کہ ان میں اپنی چیز اور دوسرے
کی چیز کا کوئی فرق کرے۔ کوئی چیز اس کی اپنی نہیں اور کوئی چیز دوسرے کی نہیں ہے سب خدا کی ہے
وہ ان میں تصرف کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے، نہ کسی اور کے سامنے۔ اس نقطۂ نظر سے اپنی بھلائی
اور غیر کی بھلائی، اپنا مفاد اور دوسرے کا مفاد، اپنا مقصد اور دوسرے کا مقصد یہ ساری تقسیم مٹ جاتی
ہے۔ ہر بھلائی ہر مفاد اور ہر مقصد اپنی بھلائی اور اپنا مفاد بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر بھلائی اور ہر مقصد
کی طلب خدا کے مطلوبہ مقصد اور بھلائی کی طلب ہے اور بحیثیت نائب انسان کو کسی طرف بھی جانبداری
کے بغیر خدا کا منشا پورا کرنا ہے۔

تقویٰ اور احسان کے تصورات زندگی کے داخلی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ عبادت، اخلاق اور تعمیر معاشرہ
کی کوششوں کو ظاہرداری اور سطحیت سے بچانے کے لیے اخلاص، خدا ترسی، للہیت اور خدا کی رضا جوئی کے
جذبے کی ضرورت ہے۔ تقویٰ اور احسان کے تصورات انہیں جذبات کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں۔ ان
تصورات کا حاصل یہ ہے کہ حقیقی نیکی وہ ہے جس کی جڑیں قلب کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوں۔ جو عارضی
نہ ہو بلکہ جو شخصیت کا جز بن جائے اور پوری زندگی کی روش قرار پائے جس کا محرک کوئی ادنیٰ مقصد، ریا
اور نمائش کا جذبہ نہ ہو بلکہ جس کا حقیقی محرک خدا کی خوشنودی کی امید اور اس کی ناخوشی کا اندیشہ ہو۔ احسان
کا تصور بالخصوص خدا کی محبت اس کے دین سے وفاداری اور اس کی مخلوق سے خیر خواہی کے جذبے کی
اہمیت جتاتا ہے اور خوب سے خوب تر عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ایثار و قربانی، ضبط و تحمل، عفو و
درگذر، خیر خواہی، ہمدردی اور انسانی محبت سکھاتا ہے۔ مباحات میں احتیاط و توازن، رخصتوں سے گریز
عزیمتوں کی ترجیح، ادنیٰ مقاصد سے اجتناب اور بلند مقاصد کے لیے جدوجہد، فرائض و واجبات کی تکمیل
کے ساتھ ترغیبات میں مسابقت، خدا کے حکم کی اطاعت کے ساتھ اقامت دین کی کوشش کی تعلیم دیتا ہے۔
اور یہ سب کچھ خدا کی ہمہ وقتی یاد، اس کی صفات کے گہرے شعور، اس کے حضور میں ہونے کے زندہ احساس،

اس کی ہدایتوں پر چلنے [illegible] پر رضامندی، اس کی نافرمانی سے اجتناب، اس کی نصرت پر توکل، اس کی شریعت کی وفاداری، اس کے شعائر کے احترام اور اس کی رضاجوئی میں اخلاص کے ساتھ انجام دینے کی تاکید کرتا ہے۔

مقاصد دین کی درجہ بندی

دین کے ہر پہلو کو مقصد قرار دینے اور پوری شخصیت کی جامع تکمیل کو مطلوب ٹھہرانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر مقصد یکساں قدر و قیمت کا حامل ہے اور زندگی کا ہر پہلو اہمیت کے اعتبار سے ایک ہی سطح پر ہے۔ دین کے مقاصد کے درمیان قدر و قیمت اور اہمیت کے لحاظ سے مختلف درجات ہیں مختلف چیزیں مختلف حدود میں مطلوب ہیں۔ ان سطور میں ان درجات کی تعیین اور ان حدود کی وضاحت پیش نظر نہیں ہے۔ یہ ایک مستقل اور بجائے خود ایک اہم کام ہے۔ یہاں ہم چند اصولی باتوں کی نشان دہی کرنے پر اکتفا کریں گے جو ان شاء اللہ اس سلسلے میں مفید ہوں گی۔

پہلی بات یہ کہ مقاصد دین میں درجہ بندی کی ایک ہی مستند اور قابل اعتماد بنیاد ہے اور وہ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ہمیں حاصل نہیں ہے نہ عقل نہ وجدان، نہ کشف، نہ تجربہ۔ یہ ذرائع ممکن ہے کہ مددگار ذرائع کی حیثیت سے کسی قدر مفید ہوں۔ اگرچہ ہمیں ان کی اس محدود افادیت میں بھی شبہ ہے۔ مگر یہ تو یقینی ہے کہ مقاصد زندگی کی درجہ بندی میں اور احکام دین کی قدر و قیمت اور اہمیت کے تعین میں یہ ذرائع فیصلہ کن نتائج تک نہیں پہنچا سکتے۔ اور ان کی بنیاد پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کام میں انہیں اولیت دینا اور ان کی مدد سے زندگی کے مقاصد کا خاکہ تیار کرنا اور کتاب و سنت کی تفصیلات سے اس خاکے کو پورا کرنا اور اس طرح ایک نظریہ بنا لینا۔ یہ طریقہ غلط بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے انتہائی مضر بھی۔

انسانی عقل کو خیر و شر کے بنیادی الہامات ضرور حاصل ہیں۔ مگر نہ تو وہ کافی ہیں، اور نہ ہی ان متفرق الہامات کے درمیان قدر و اہمیت کے اعتبار سے درجات کا علم انسان کی عقل و وجدان کا جزو ہے۔ مثلاً انسانی وجدان اس کا تو شعور رکھتا ہے کہ حیا اور عصمت اچھی اور مطلوب ہیں۔ بے حیائی اور زنا بری اور مبغوض ہیں۔ لیکن بے حیائی اور حیاداری کے حدود کیا ہیں۔ عصمت کی کیا اہمیت ہے اور زنا کس قدر قبیح فعل ہے، اور کس سزا کا مستحق ہے۔ یہ امور انسان کی عقل اور وجدان سے ماوراء ہیں۔ ان

امور کا علم ہماری بنیادی وجدانیات کا جز نہیں ہے اور نہ ہی ہماری عقل بنیادی وجدانیات حواس اور تجربے کے ذرائع سے مدد لے کر ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہے۔ عقل کو وہ مقدمات ہی حاصل نہیں ہیں جن کو ترتیب دے کر وہ ان امور کے بارے میں کسی رائے پر پہنچ سکے۔

اس سلسلے میں حقیقت سے متعلق مابعد الطبیعیاتی نظریات سے بھی مدد لی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یونانی فکر کا یہ مشترک نظریہ رہا ہے کہ حقیقت عقلی[1] ہے۔ جو چیز جس قدر عقلی ہے اسی قدر اس کا وجودی رتبہ بلند ہے اور اسی قدر وہ زیادہ حقیقی ہے۔ نہ صرف وجود اور حقیقت بلکہ اسی درجے میں وہ زیادہ خیر بھی ہے۔ عقلی اعتبار سے نقص مادہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے جو چیز جس قدر زیادہ مادی ہے، اسی قدر غیر حقیقی ہے۔ وجود کے مراتب میں اتنا ہی پست اور اتنا ہی زیادہ شر کا جز لیے ہوئے ہے۔ یہ نظریات یونانی فکر کے مفروضات ہیں۔ انھیں ہمارے فلاسفہ نے بھی اپنایا ہے اور کچھ تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے مختلف صوفیا نے بھی۔ ان مفروضات سے اور دوسرے منطقی اصولوں اور نظریات کی مدد سے انسان کی حقیقت انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی قدر و قیمت مختلف افعال کی اہمیت اور انسانی مقاصد کے درجات کے بارے میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اور پھر ان نتائج کی بنیاد پر جو خاکہ مقاصد زندگی کا بنایا گیا اس میں رنگ قرآن و سنت کی تفصیلات سے بھرا گیا ہے۔ جس نے مقاصد دین کے پورے نقشے کو بگاڑ دیا ہے

سوال یہ ہے کہ یہ مفروضات نہ تو الہامی اور وجدانی ہیں اور نہ ہی کتاب و سنت میں ان کی صراحت فرمائی گئی ہے۔ پھر ان کے اختیار اور ان کی روشنی میں دین کی توجیہ و تعبیر کا جواز کیا ہے؟ کیا وجہ جواز یہ ہے کہ یہ مفروضات عقلاً ثابت ہیں۔ بدیہی حقائق ہیں اور تنقید و تردید سے بلند ہیں۔ ہمارے قدیم فلاسفہ اور بعض صوفیا۔ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ ان کے لیے یہی ثابت شدہ حقائق اور یہی علمی مشاہدات اور یقینی مکشوفات تھے۔ مگر اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ صرف مفروضات ہیں۔ ان مفروضات کی قدر و قیمت اگر ہے تو صرف اس اعتبار سے کہ کسی حد تک کتاب و سنت کی تعبیر، دین کی توجیہ اور مقاصد زندگی کی تشریح میں مفید ثابت ہو سکے ہیں۔ یہ مفروضات حق و صداقت کا معیار نہیں ہیں اور نہ ہی مقاصد زندگی کی درجہ بندی کی بنیاد ان پر قائم ہے۔ واحد معیار اور بنیاد کتاب و سنت ہے اور کچھ بھی نہیں۔

---

[1] یہاں عقلی کا لفظ محض منطقی عقل کے مفہوم میں نہیں ہے، وجدان بھی اس میں شامل ہے۔

مقاصد دین کی درجہ بندی کا واحد طریقہ قرآن و سنت کے نصوص اور قرآن و سنت کی تفصیلات سے استقرائی نتائج ہیں اور پھر رسول اللہ کی سیرت اور صحابہ کرام کا مجموعی عمل اور زندگی ہے۔ انھیں ذرائع اور مآخذ کے کھلے دل و دماغ کے ساتھ تفصیلی اور غائر مطالعہ سے مقاصد دین میں صحیح درجہ بندی کا علم حاصل ہو سکتا ہے اور ہر ہر مقصد کی الگ الگ قدر و قیمت اور اہمیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ معاونت کے طور پر مابعد الطبیعیاتی نظریات یا سائنٹفک تصورات سے زیادہ مفید اسلامی تاریخ اور مختلف مسلم مکاتیب فکر اہل فلسفہ، اہل کلام اہل تصوف اور اہل فقہ کا مطالعہ ہوگا۔ مگر یہ مطالعہ قرآن و سنت کی تصریحات کی روشنی میں اور کھلے ذہن سے ہونا ضروری ہے۔ ورنہ پھر آدمی اپنے رجحان اور اپنی پسند کی چیزیں تلاش کر کے اپنا مرغوب نظریہ بنائے گا۔ اس کام کے لیے تنقیدی قوت کی ضرورت ہے جس سے دوسروں کے افکار و اعمال کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکے اور خود اپنے رجحانات اور میلانات کو پرکھا جا سکے۔

(ختم شد)

شریعت ہی اصل کسوٹی ہے

یہ نہ سمجھ لینا کہ حقیقت، شریعت سے الگ اور اس کی مخالف کوئی شے ہے۔ حقیقت، شریعت کا جوہر اور اس کی روح ہے اور شریعت، حقیقت کی صورت اور اس کا ہیکل۔

شریعت یہ ہے کہ جو کچھ اللہ و رسول نے فرمایا اس کا اعتقاد رکھا جائے اور اسی کے مطابق عمل کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ جن چیزوں پر یقین ہے وہ علم الیقین تک پہنچ جائے ــ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ:ـ

ہر وہ حقیقت جس کو شریعت رد کر دے زندقہ (بے دینی) ہے۔

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو ایسا کشف ہو جو دین و شریعت کے موافق نہیں ہے اور وہ اس کو اپنا عقیدہ بنائے تو کافر و زندیق ہو جائے گا۔

ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں، بسا اوقات راہ سلوک کے وجد و سکر کا کوئی نکتہ، سراپا حسن و جمال بن کر میرے سامنے آتا ہے مگر میں اس کو قبول نہیں کرتا، میں کہتا ہوں، جب تک دو شاہد عدل تیرے صدق و راستی پر گواہی نہ دیں تجھے ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ یہ دو شاہد عدل کون ہیں؟ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت

(شیخ عبدالحق محدث دہلوی مکتوب ۱۲۷)

(مولانا صدرالدین اصلاحی)

یہ وہ مقالہ ہے جو "مسلم پرسنل لا" کے موضوع پر "اسلامک ریسرچ سرکل" کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ یہ سمینار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے یونین ہال میں ۱۴، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ہوا تھا جس میں اردو اور انگریزی کے چودہ پندرہ مقالے پڑھے گئے تھے اور ان پر بحث و مباحثہ ہوا تھا۔ "اسلامک ریسرچ سرکل" ان سب مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا پروگرام رکھتا ہے، جو ان شاء اللہ اس موضوع پر ایک جامع اور پُر مغز کتاب ہوگی۔

(صدرالدین)

مسئلے کی اہمیت

معزز حاضرین و جناب صدر! "مسلم پرسنل لا" میں ترمیم کا مسئلہ اس وقت ملک اور ملت کا ایک ابھرا ہوا مسئلہ ہے، اور اس نے ذہنوں میں بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ چونکہ اس معاملے کا تعلق یہاں کے کروڑوں اشخاص کی تمدنی، معاشرتی، اخلاقی اور دینی زندگی سے گہرا ربط ہے، اس لیے یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں، بلکہ سرتاسر عملی مسئلہ ہے، اور اس کا جو حل بھی اس وقت اختیار کیا جائے گا اس کا مسلمانوں کے تہذیبی اور دینی مستقبل پر بڑا زبردست اثر پڑے گا۔ اتنے اہم مسئلے کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر تک پہنچنے کے لیے جس طرح تنگ نظری، قدامت پسندی اور روایت پرستی سے احتراز ضروری ہے اسی طرح [illegible] اور زمانہ سازی کی فکری کجروی سے بھی اجتناب لازمی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ اس مسئلے کے سلسلے میں جو کچھ عرض کروں اس میں راست فکری اور علمی انصاف و دیانت کے ان تقاضوں کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، گفتگو جذبات کی آمیزش سے پاک رہے اور بحث کا

کا انداز خالص تحقیقی رہے۔

مرکز بحث

حضرات! میری گفتگو اس اہم مسئلے کی ایک اصولی اور بنیادی بحث سے متعلق اور اسی پر مرکوز ہوگی، جو اس معاملے میں فی الواقع ایک ہی فیصلہ کن نوعیت کی بحث ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلم پرسنل لا کی اصل حیثیت کو روشنی میں لاؤں اور یہ واضح کردوں کہ جن قوانین وضوابط کو مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے، انہیں "مسلم پرسنل لا" کیوں کہا جاتا ہے؟ آیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمان نام کی ایک قوم کے اختیار کیے ہوئے کچھ رسوم وضوابط ہیں جنھیں اس نے ماضی میں اپنی معاشرتی اور تمدنی مصلحتوں کی بنا پر، اور اپنے مزاج کے تقاضوں کے تحت خود وضع کرلیا تھا اور جو موروثی طور پر اس کی زندگی سے وابستہ ہوکر رہ گئے ہیں، یا پھر یہ ہے کہ ان کا رشتہ اس کے اصول حیات اور عقائد سے جڑا ہوا ہے اور وہ اس دین کی تعلیمات کا ایک حصہ ہیں جس پر ایمان لانے اور جس کی غیر مشروط پیروی کا عہد کرنے ہی کے نتیجے میں کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے، مسلمان کہا جاتا ہے اور مسلمان باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ امر واقعہ اگر پہلا ہے تو زیر بحث سوال کا جواب کچھ اور ہوگا، اور اگر دوسرا ہے تو جواب بھی دوسرا ہی ہوگا، اور پھر ہر ایک کے منطقی تقاضے بھی الگ الگ ہوں گے۔ اس لیے اس بحث کے سلسلے میں امر حق تک پہنچنے کا انحصار واضح طور پر اسی بات پر ہے کہ اس سوال کا واضح جواب ہمارے سامنے آئے اور دلیل کے ساتھ آئے۔

مسلم پرسنل لا، کتاب وسنت کی روشنی میں

اس غرض سے جب ہم اسلام کے اصل سرچشموں ـــــــ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ـــــــ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں چار حقیقتیں نمایاں طور سے دکھائی دیتی ہیں:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ نجی زندگی کے جن معاملات سے تعلق رکھنے والے قوانین کو "مسلم پرسنل لا" کہا جاتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں قرآن اور سنت نے کچھ نہ کچھ احکام نہ دے رکھے ہوں۔ نکاح، مہر، طلاق، خلع، ایلاء، عدت، ظہار، رضاعت، وراثت، وصیت اور وقف وغیرہ سبھی مسائل کے بارے میں صاف وصریح ہدایات اور قوانین ان کے اندر موجود ہیں۔ یہ اتنی واضح بات ہے کہ شاید ہی کوئی لکھا پڑھا آدمی اس سے ناواقف ہو۔ اس لیے یہاں متعلقہ آیات واحادیث کے حوالے پیش کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ یہ قوانین دین کے بنیادی اصول و مقاصد اور اقدار کے حامل ہیں۔ یعنی ان کے بارے میں حقیقت واقعہ صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن اور احادیث میں موجود ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصول و مقاصد اور اخلاقی اقدار کا مظہر ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کی نگاہ میں مومن کی متاع ایمانی سب سے قیمتی شے ہے اور اس کی حفاظت کو اس کے اصول و مقاصد میں سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ مشرک اور کافر افراد سے نکاح کی قطعی ممانعت اسی عظیم ترین مقصد کی بنا پر کی گئی ہے چنانچہ یہ حکم دینے کے بعد کہ تم مشرک مردوں یا عورتوں سے نکاح نہ کرو، صراحت فرمائی جاتی ہے کہ اُولٰٓئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ (یعنی یہ کہ یہ اہل شرک تمہیں آگ کی طرف بلائیں گے اور اللہ تمہیں اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے) آیت کا مدعا یہ ہے کہ ازدواجی رفاقت زوجین میں جو گہرا جذباتی تعلق قائم کرتی ہے اس کے پیش نظر اس امر کا قوی اندیشہ ہے کہ مشرک رفیق حیات یا رفیقۂ حیات اپنے مومن شریک زندگی کو بھی اور پیدا ہونے والی اولاد کو بھی اپنے مشرکانہ عقائد و تصورات سے متاثر کر دے۔ اور پھر یہ چیز ان کی آخرت کی تباہی کا باعث بن جائے۔ اس لیے ایک مومن کے لیے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ کسی مشرک شریک حیات کا انتخاب کر کے اپنے کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالے۔

اسی طرح عفت ——— کردار کی عفت، نظر کی عفت اور خیال کی عفت ——— اسلام کے نزدیک انسانیت کا ایک بنیادی جوہر اور ایک بلند ترین اخلاقی قدر ہے، اس کے اندر بال کا پڑ جانا بھی ناقابل برداشت حادثہ ہے۔ یہی اخلاقی قدر تھی جس کے لیے پردے کے احکام دیے گئے، اور جو نکاح کے حکم کا ایک اہم موجب قرار دی گئی، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ۔ يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ (اے نوجوانو تم میں جو لوگ نکاح کرنے کی قدرت رکھتے ہوں انھیں چاہیے کہ نکاح کر لیں۔ کیونکہ نگاہوں کو پست اور شرمگاہوں کو محفوظ رکھنے کی یہ سب سے کارگر صورت ہے۔) اسی طرح قرآن کریم بھی اسی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ مومن باندیوں سے نکاح کی اجازت دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ (یعنی یہ اجازت تم میں سے ان لوگوں کے لیے ہے جنھیں اپنی عفت کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو۔) پھر یہی وجہ ہے کہ اس نے مسلم معاشرے کو حکم دے رکھا ہے کہ اپنے اندر کے رنڈووں اور بیواؤں کے، اور نکاح کے قابل باندیوں اور غلاموں کے نکاح کر دیا کرو، وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنَ

عِبَادِکُمْ وَاِمَائِکُمْ۔ تعدد ازدواج کی اجازت جن اخلاقی اور معاشرتی مصالح کی بنا پر دی گئی ہے ان میں سے ایک مصلحت، بعض افراد کی حد تک، یہ تحفظِ عفت بھی ہے

ایک تیسری مثال لیجیے۔ اسلام معاشرے کے کمزور طبقوں، خصوصاً یتیموں کے حقوق و مصالح کی حفاظت اور تکمیل کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اسے اس کی بنیادی قدروں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ تعددِ ازدواج کی اجازت جن مصالح کی بنا پر دی گئی ہے ان میں اہم ترین مصلحت کی حیثیت اسی قدر کو حاصل ہے، چنانچہ قرآن میں جہاں اس اجازت کا ذکر ہے وہاں یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً یعنی یہ کہ اگر تمہیں یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر پانے کا ڈر ہو تو اپنی پسند کی دو دو، تین تین، یا چار چار عورتوں سے نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت پر اکتفا کرو۔ ان الفاظ پر غور کیجیے۔ تعددِ ازدواج کی اجازت اگرچہ مصالح یتامیٰ کے تقاضے کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے بلکہ اس کے بغیر بھی اس کی اجازت ہے، جیسا کہ کتاب و سنت کے دوسرے نصوص سے واضح ہے، مگر اس کے باوجود قرآن حکیم نے یہاں اس آیت میں انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ میں اس اجازت کی سب سے اہم غایت یہی حقوق یتامیٰ کے تحفظ کی غایت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ بہر حال عدل و انصاف کا سلوک کیا جائے اور اس غرض سے کلی اطمینان کی ایک بہترین شکل یہ ہے کہ ان کی ماؤں سے نکاح کر لیا جائے، تاکہ یہ رشتہ خود ان یتیموں کے ساتھ نفسیاتی طور پر یگانگی اور محبت کا ذریعہ بن جائے اور اس طرح ان کے حقوق کے بارے میں آدمی کا ذہن ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے جذباتی طور پر بھی تیار ہو رہے۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ کتاب و سنت نے ان احکام و قوانین کے صرف بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کر لیا ہے، بلکہ جگہ جگہ یہ صراحت بھی کر رکھی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر عائد کیے ہوئے فریضے ہیں، ان پر ان کی پابندی لازم ہے، یہ اس کی وصیت یعنی تاکیدی احکام ہیں، یہ اس کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں جن کا پاس و لحاظ قطعی ضروری ہے۔ چند حوالے سنیے:۔

نکاح کے معاملے میں کچھ احکام دینے کے بعد ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ (یعنی یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر اس نے لازم قرار دی ہے) دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے۔ ذٰلِکُمْ حُکْمُ اللّٰہِ

یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ (یعنی یہ اللہ کا حکم ہے جس کے مطابق وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔)

خلع اور طلاق کے کچھ احکام بیان کر کے خبردار کیا جاتا ہے کہ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا (یعنی یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرنا)

عدت کے بارے میں چند ہدایتیں دے کر فرمایا جاتا ہے کہ ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ اَنْزَلَہٗ اِلَیْکُمْ (یعنی یہ اللہ کا حکم ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے)

وراثت کے قوانین بیان فرماتے ہوئے ان کی نوعیت اور اہمیت پر چار مختلف پہلوؤں سے زور دیا گیا ہے یعنی پہلے تو تمہیدی اور اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی ہے کہ متوفی کے وارثوں کے لیے اس کے ترکے میں حصے ہوتے ہیں اور یہ حصے نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا یعنی اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ہوتے ہیں، پھر جب ان کے بیان کا آغاز ہوتا ہے تو یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ کے لفظوں سے یعنی اس تنبیہ کے ساتھ ہوتا ہے کہ آگے بیان ہونے والے احکام تمہارے لیے اللہ کی وصیت اور تاکیدی حکم کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے بعد ان قوانین کے تذکرے کے درمیان ہی میں یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ یہ احکام فَرِیْضَۃً مِّنَ اللّٰہِ یعنی اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ہیں، اور جب اس بیان کا خاتمہ ہوتا ہے تو وَصِیَّۃً مِّنَ اللّٰہِ اور تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ کے فرمانوں پر ہوتا ہے۔ اس طرح ان قوانین کے تذکرے کے سلسلے میں ایک دو نہیں بلکہ الفاظ اور انداز بیان کے اختلاف کے ساتھ ساتھ چار چار بار اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ وہ قوانین ہیں جن کی پابندی تمہارے اوپر فرض اور ضروری ٹھیرائی گئی ہے

۴۔ اب اس ضمن کی چوتھی اور آخری حقیقت کو لیجیے۔ کتاب و سنت کے صفحات بتاتے ہیں کہ ان احکام کی پیروی ایمان کا تقاضا اور بندگی کا لازمہ ہے، اور ان کی خلاف ورزی ظلم ہے معصیت ہے، کفر ہے۔ مثلاً:

وراثت کے قوانین ہی کو لے لیجیے، انھیں حُدُوْدُ اللّٰہِ قرار دیے جانے کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے کہ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ۝ یعنی جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی قائم کی ہوئی حدود سے آگے بڑھے گا، اسے وہ آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہوگا

اسی طرح طلاق کے بعض احکام سنانے کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ ذٰلِکَ یُوْعَظُ بِہٖ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (یعنی ان ہدایتوں پر عمل کرنے کی تم میں سے ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن

پر ایمان رکھتے ہیں ۔

اسی طرح سورۂ مجادلہ میں ظہار کے احکام بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ ذَالِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ (یعنی یہ احکام اس لیے دیے گئے ہیں تاکہ تم (صحیح معنے میں) ایمان رکھو اور یہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی حدیں ہیں، اور ان احکام و حدودِ الٰہی کے منکروں کے لیے دردناک عذاب ہے ۔

حضرات! اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں یہ چاروں حقیقتیں، جن کی تفصیلی وضاحت آپ کے سامنے ابھی آئی، دراصل توام حقیقتیں ہیں، اور جب ان میں سے ایک کتاب وسنت کے اندر موجود تھی تو باقی تینوں کا پایا جانا بھی بالکل ناگزیر تھا۔ ان سارے حقائق کے سامنے آجانے کے بعد مسلم پرسنل لا کی اصل حیثیت پوری طرح روشنی میں آجاتی ہے اور ہر صاحب نظر، یہ دیکھ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ قوانین بلاشک وریب دین ہی کا ایک حصہ ہیں، قرآن اور سنت ہی کا ایک باب ہیں، کبھی الگ نہ ہوسکنے والا حصہ! کبھی فراموش نہ کیا جاسکنے والا باب!! آخر جو احکام و ضوابط قرآن میں صراحۃً موجود ہوں، جن کی مزید تفصیل رسولِ خدا کے صریح ارشادات میں پائی جارہی ہو، جن کو کتاب الٰہی نے حدود اللہ قرار دیا ہو جنھیں فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ اور وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ فرمایا ہو، جن کی پابندی کو شرطِ ایمان ٹھیرایا ہو، ایسی چیزوں کو بھی اگر دین کی تعلیمات اور اسلام کا ایک ضروری جزو نہ کہا جائے گا تو دین اور اسلام کے معنے کیا رہ جائیں گے، اور قرآن وسنت کے، اسلام کی اصل اتھارٹی ہونے کا مطلب کیا باقی رہ جائے گا! بنیادی سوال یہ ہے کہ کسی بھی مذہب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے کا حق کہ فلاں چیز اس کے دائرۂ بحث میں شامل ہے یا نہیں، کس کو ہے؟ کیا خود اس مذہب کے سوا، اور اس کی اصل کتاب اور اس کے لانے والے پیغمبر کے ارشادات کے علاوہ کسی اور کو یہ حق دیا جاسکتا ہے؟ نہیں، اور یقیناً نہیں۔ علم و منطق کا اور حق و انصاف کا اصولی فیصلہ اگر یہ ہے تو مسلم پرسنل کو اسلام کا جزو باور کرنے میں کوئی تامل کیسے کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ یہ احکام میرا ایک ضروری جزو ہیں ۔

مخالف نقطۂ نظر اور اس کے دلائل

معزز حاضرین! اب آیئے مسلم پرسنل لا کے بارے میں دوسرا نقطۂ نظر رکھنے والوں کے موقف کا بھی جائزہ لے لیں، اور دیکھیں کہ وہ ان کی اس اصل دینی حیثیت کے باوجود اپنے کن دلائل اور افکار کی بنا پر ان کی اس حیثیت کا انکار کرتے اور انھیں قابلِ تغیر کہتے ہیں؟ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ اپنے اس

نقطۂ نظر کے حق میں تین دلیلیں پیش کرتے یا تین باتیں کہتے ہیں :-

۱۔ پہلی دلیل تو ان کی یہ ہے کہ یہ نکاح و طلاق اور یہ وصیت و وراثت وغیرہ کے معاملات خالص دنیوی معاملے ہیں، کیونکہ ان کا تعلق انسان کے دینی اور تعبدی پہلو سے نہیں ہو سکتا۔ مذہب تو خدا کی پرستش کا، اس کے ذکر و فکر کا، اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے باطنی ریاض کا نام ہے، اس کا مقام خلوت کدے اور عبادت گاہیں ہیں، دنیوی معاملات کا میدان نہیں ہے۔ اس لیے یہ قوانین جن کو "مسلم پرسنل لا" کہا جاتا ہے، مسلمانوں کی دینی نہیں، بلکہ دنیوی زندگی سے تعلق رکھنے والے امور ہیں، اور ان کے دنیوی مصالح اور ترقی پذیر تمدنی حالات کے لحاظ سے ان میں رد و بدل ضروری ہے۔

۲۔ دوسری دلیل ان کی یہ ہے کہ کتنے ہی مسلم ملکوں میں ان قوانین کے اندر آزادانہ رد و بدل کیا جا چکا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے، اگر یہ دینی حیثیت کے مالک ہوتے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ خود مسلمان ممالک اور مسلمان حکمراں انھیں بدل ڈالنے کا کوئی اقدام کرتے۔

۳۔ تیسری دلیل ان کی یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا، نیز مسلم خواتین کو انسانی حقوق کی محرومی سے بچانے کا تقاضا یہ ہے کہ ان قوانین میں رد و بدل کر دیا جائے تاکہ مسلمان زمانے کے ساتھ چل سکیں۔

مخالف دلائل کی حقیقت

ان دلائل میں کتنا وزن ہے ؟ اس کا حال بھی سن لیجیے :-

جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے، اس کی بنیاد اس غلط فہمی پر ہے کہ دین و خدا پرستی کا تصور اسلام میں بھی وہی ہے جو اکثر دوسرے مذاہب میں ہے۔ حالانکہ یہ بدیہی طور پر خلاف واقعہ بات ہے۔ دوسرے مذاہب یقیناً دنیا کو قابل ترک سمجھتے اور اس کے معاملات کو شیطان کا جال کہتے ہیں، اور خدا کو پالینے کے لیے عبادت گاہوں، جنگلوں اور غاروں کے سنسان گوشوں میں جا بیٹھنے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسلام اس نظریے کی شدت سے نفی کرتا ہے، اس کا صاف اور صریح اعلان ہے کہ دین و خدا پرستی کی راہ اس دنیا سے کترا کر نہیں جاتی، بلکہ اس کے ٹھیک درمیان میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ دنیوی زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل و معاملات ہی تو وہ کھیتی ہیں جس سے رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کی فصل کاٹی جا سکتی ہے۔ صحیح خدا پرستی صرف یہ ہے کہ اللہ کی پرستش، اس کے ذکر اور اس کی تسبیح و تحمید کے

ساتھ ہی ساتھ زندگی کے جملہ معاملات بھی اس کی رضا کے مطابق انجام دیے جائیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک مکمل نظام حیات عطا کر رکھا ہے اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارے میں احکام و ہدایات نہ دے رکھے ہوں۔ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے احکام یکساں طور پر واجب الاطاعت ہیں، دین کا ایک جزو ہیں جس کا دین سے رشتہ منقطع کر دینا دراصل دین کو اعضا بریدہ بنا دینا ہے۔ دوسرے تمام احکام کی طرح مسلم پرسنل لا کی بھی اسلام میں یہی حیثیت ہے اور اسے دین سے بے تعلق کہنا اسلام سے انتہائی ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔

اب رہا دوسری دلیل کا مسئلہ تو اسے 'دلیل' کہنا بھی لفظ دلیل کی توہین ہے۔ کچھ مسلم ممالک میں اگر مسلم پرسنل لا کے اندر آزادانہ رد و بدل کر بھی دیا گیا ہو تو اس سے یہ استدلال کرنا کہ یہ قوانین فی الواقع بھی قابل ترمیم ہیں، کسی صاحب علم کو ہرگز زیب نہیں دے سکتا۔ یہ استدلال تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے چین کی نام نہاد عوامی جمہوریہ کے طرز عمل کو اس بات کی سند میں پیش کیا جائے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی عوامی جمہوریت نظریاتی جبر، دماغ شوئی، مذہب کشی، جبری محنت اور کمیون سسٹم کو اپنے نظام کار کی بنیاد بنائے ہوئے ہے۔ اس لیے جمہوریت میں یہ سب چیزیں اختیار کی جا سکتی ہیں اور ضرور اختیار کی جانی چاہییں! یہ بڑی تنگ نظری، قدامت پرستی اور رجعت پسندی کی بات ہے کہ زمانے اور حالات کے بدل جانے کے باوجود آج بھی جمہوریت کے انھیں اصول و تصورات پر اصرار کیا جائے جنھیں مدتوں پہلے فرانس برطانیہ اور امریکہ میں اختیار کر لیا گیا تھا! غور فرمائیے عقل عام اس استدلال کے بارے میں کیا کہے گی؟ کیا وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو سکتی ہے کہ جمہوریت کا نام لے کر جو شخص بھی کچھ کہہ دیا کرے اسے "دین جمہوریت" میں بہرحال 'فتوے' ہی کی حیثیت حاصل ہو گی؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے تو پھر اسلام ہی ایک ایسا مظلوم کیوں ہو کہ اسے عقل عام، حق و انصاف اور علم و تحقیق کے سارے مسلمہ تقاضوں سے محروم کر دیا جائے اور اس کا نام لے کر، یا اس کا نام لینے والوں کی فہرست میں صرف شامل ہونے کی بنا پر جو شخص بھی کچھ کر ڈالے اسے دین اسلام کی صحیح نمائندگی قرار دے دیا جائے؟ کیا علمی تحقیق کا یہ کوئی معقول طریقہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کو قابل ترمیم قرار دینے کے لیے ان لوگوں کے افعال کو بنیاد بنایا جائے جن کا نظام سیاست، جن کا نظام معیشت، جن کا نظام معاشرت اور جن کا نظام تعلیم و تربیت، غرض جن کے اکثر و بیشتر نظامہائے زندگی باہر سے درآمد کیے ہوئے ہوں، جن کے طرز فکر اور طریقۂ عمل پر موجودہ غیر اسلامی افکار و تصورات آسیب بن کر

چھائے ہوئے ہوں؟ اس صورت واقعہ کے پیش نظر کہ انھوں نے اپنی زندگی کے نظام کے کتنے ہی اہم ترین شعبوں کے لیے مغربی اصول و افکار اختیار کر رکھے ہیں، حقیقت واقعی تو یہی سمجھی جانی چاہیے کہ مسلم پرسنل لا میں ان کی یہ آزادانہ ترمیم بھی دراصل اسی مغرب سے مرعوبیت اور فریب خوردگی ہی کا نتیجہ ہے۔

ان حضرات کی تیسری دلیل کا حال یہ ہے کہ اس کی حیثیت دلیل کے بجائے ایک مشورے کی ہے، ہم اس مشورے کو ایک ناواقف حال شخص کا مشورہ سمجھنے کے باوجود ان کے اخلاص و جذبۂ خیر خواہی کا ضرور اعتراف کرتے، مگر یہ دیکھ کر ہم بڑی دشواری میں پڑ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کی بھلائی اور مسلم خواتین کے لیے حصول انصاف کا ان کا یہ جذبۂ بے قرار اس وقت اکثر و بیشتر بے حس ہو کر رہ جاتا ہے جب انہی مسلمانوں کے سر پر قیامت ٹوٹ رہی ہوتی ہے اور انہی مسلم خواتین کی جان اور عفت دونوں پر درندگی کے ڈاکے پڑ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے دردانگیز مواقع پر اگر ان حضرات کی طرف سے مسلمانوں سے ہمدردی کا کوئی قابلِ اطمینان عملی مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آتا تو ہم اپنے دلوں کو کیسے یہ یقین دلائیں کہ مسلم پرسنل لا کو بدلوا ڈالنے کی جس ضرورت کا اظہار وہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں مسلمانوں کی اپنی بھلائی کی جو بات وہ کہتے ہیں اس میں واقعی کوئی وزن ہے۔ ویسے اگر صورت واقعہ یہ نہ ہوتی اور ہمیں ان کے طرز عمل سے یہ محسوس ہوتا کہ وہ اپنے اس مشورے میں فی الواقع مخلص ہیں تو ہم ان سے عرض کرتے کہ آپ کا یہ مشورہ ہمدردانہ ہونے کے باوجود اسلام ہی سے نہیں خود 'مسلمان' سے بھی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ مسلم پرسنل لا تو اسلام ہی کا ایک جزو، اور ان کی پیروی مسلمان کے مسلمان ہونے کی ایک ضروری شرط ہے۔ مسلمان کی بھلائی اس میں نہیں ہے کہ وہ اپنے دین کے کسی جزو سے دست بردار ہو جائے، بلکہ اس میں ہے کہ وہ دین کے ہر جزو کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہے۔

مخالفت کا اصل راز خلط بحث

حضرات! یہ ہے ان لوگوں کے دلائل کی حقیقت۔ یہ لوگ دراصل اس اہم نکتہ کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر رہے ہیں کہ ہر مسئلے کی طرح اس مسئلے میں بھی "کیا ہے" اور "کیا ہونا چاہیے" دو الگ الگ بحثیں ہیں لیکن یہ لوگ مسلم پرسنل لا پر غور کرتے وقت سوچتے تو یہ ہیں کہ "اسے کیا ہونا چاہیے" لیکن کہتے یہ ہیں کہ "وہ کیا ہے"۔ اصل بحث تو یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کا دین میں کیا مقام ہے۔ آیا وہ اسلام کا جزو ہے یا نہیں؟ یہ بالکل نہیں ہے کہ ایسے قوانین کو دین کا جزو ہونا چاہیے تھا یا نہیں۔ اس لیے یہ بحث و تحقیق کا بالکل ابتدائی

تقاضا ہے کہ صاحب تحقیق ان دونوں باتوں کو خلط ملط نہ کرے اور اپنے ذہن میں یہ بات بالکل صاف رکھے کہ مسلم پرسنل کا جزو دین ہونا ایک مستقل مسئلہ ہے اور اس کی تحقیق کے لیے دین ہی کے بیان اور کتاب وسنت ہی کی تفصیلات پر انحصار کرنا چاہیے۔ اگر ان سے یہ ثابت ہو جائے کہ فی الواقع وہ دین ہی کا ایک جزو ہیں تو اسے کھلے دل سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ پھر وہ اس بات پر چاہے تو بحث کر سکتا ہے کہ ان مسائل کو دین کا جزو ہونا ہی نہیں چاہیے تھا، یا اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ یہ چیلنج دے سکتا ہے کہ وہ سارے اصول و اقدار ہی صحیح اور قابل تسلیم نہیں ہیں جو ان قوانین کے پیچھے رکھے گئے ہیں حتیٰ کہ اس کا یہ حق بھی قابلِ تسلیم ہے کہ وہ سرے سے اسلام ہی کو غلط قرار دے دے اور اس کے لیے بحثیں کرے مگر اس کا یہ حق کبھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیز قرآن کے اندر صریح لفظوں میں موجود ہو اس کے بارے میں کہہ دے کہ وہ موجود نہیں ہے یا یہ کہ وہ موجود تو ہے مگر دین کا جزو نہیں ہے۔ ان کا قرآن اور سنت میں موجود ہونا اور جزو دین ہونا تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، اور اس حقیقت کو بہر حال تسلیم کیا جانا چاہیے۔

مسلم پرسنل لا کا صحیح نام

حضرات! زیر بحث قوانین کی جو اصل حیثیت ہے، اور جو ابھی آپ کے سامنے وضاحت سے رکھی جا چکی ہے، اس کے پیش نظر میرے خیال میں انھیں مسلم پرسنل لا کہنا بھی اگر غلط نہیں تو ایک غیر محتاط تعبیر ضرور ہے۔ وہ فی الواقع "مسلم پرسنل لا" نہیں، بلکہ "اسلامک لا فار پرسنل افیرس" (ISLAMIC LAW FOR PERSNAL A77AIRS) ہیں اور مناسب یہی ہے کہ انھیں اسی نام سے پکارا جائے۔ ورنہ آج جس طرح عام ذہن کسی چیز کے 'اسلامی' ہونے اور اس کے 'مسلم' ہونے میں فرق نہیں کرتے اس کے پیش نظر بھی، اور اس نقطہ نظر کے مدنظر بھی جو اس وقت ان قوانین کے بارے میں عام طور سے اختیار کیا جا رہا ہے، یہ بالکل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ان کے اسی اصلی اور حقیقی نام سے یاد کیا جائے، اور انھیں "مسلم پرسنل لا" کہہ کر اس غلط فہمی کو مزید خوراک نہ پہنچائی جائے کہ وہ مسلمان قوم کے کچھ تمدنی اور معاشرتی رسوم و ضوابط ہیں، جس طرح کہ دوسری قوموں کے ہوا کرتے ہیں، اور ان کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔

ترمیم کا مسئلہ

حضرات! آخر میں ایک بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ابتدا میں اشارہ کیا جا چکا، نا قابل ترمیم

جزو دین ہونے کی حیثیت صرف ان قوانین کو حاصل ہے جو کتاب و سنت میں منصوص شکل میں موجود ہیں، ان تفصیلی قوانین و جزئیات کو حاصل نہیں ہے جو ان منصوص قوانین کی بنیاد پر بعد میں حالات زمانہ کے تقاضوں کے تحت اجتہادی طور پر وضع کیے گئے ہیں۔ یہ قوانین یا مسلم پرسنل لا کا یہ جزء ہر وقت قابلِ ترمیم ہو سکتا ہے، اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ان میں ردوبدل ضرور ہونا چاہیے جس طرح کہ دوسرے معاملات سے تعلق رکھنے والے اجتہادی اور تفصیلی مسائل میں ہو سکتا ہے اور برابر ہوتا رہا ہے۔ مگر یہ ترمیم بھی آزادانہ نہیں کی جا سکتی، بلکہ کتاب و سنت کے نصوص، ان کے بنیادی اصول، خصوصاً ان اصول و مقاصد اور اخلاقی اقدار کو پوری شدت سے ملحوظ رکھ کر کی جا سکتی ہے جو ان قوانین کے پیچھے کام کر رہے ہیں اور جن کی وضاحت ابھی آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں لیکن چونکہ یہ میری بحث کا اصل موضوع نہیں ہے۔ اس لیے اس ترمیم کے حدود و شرائط کی تفصیل میں اس وقت نہیں جا سکتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

سوال و جواب

ایک صاحب نے مولانا مودودی سے سوال کیا کہ اگر آپ کسی ملک میں برسر اقتدار آئیں تو ملک کو سائنٹیفک ترقی دینے کے لیے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ پہلے تو اس مفروضے کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے کہ ہم کہیں برسر اقتدار آ رہے ہیں، تاہم اگر آپ کے ذہن میں یہ سوال کھٹکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر نظریاتی تحریک کو معاشرے کے تمام افراد کے ذہنوں کو اپنے خیالات کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے، معاشرے میں ہر طرح کے لوگ، صنعت کار، سائنس داں، ڈاکٹر اور فلاسفر موجود ہوتے ہیں انہیں صرف تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، الگ یونیورسٹیاں قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی یہی لوگ جو پہلے کفر کے لیے کام کرتے تھے، اسلام کے لیے کام کرنا شروع کر دیں گے ـــ ایک اور صاحب نے پوچھا کہ اگرچہ مغربی استعمار اور مشرقی لادینیت (اشتراکیت) دونوں اسلام کی دشمن ہیں لیکن اگر وقت آ پڑے تو ان میں سے کس کو ترجیح دینی ہوگی؟ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ ہم ترجیح کے بجائے ہر دو پر لعنت بھیجیں گے کیونکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے اخبث کون ہے؟ میرے نزدیک دونوں برابر ہیں، مغربی استعمار اشتراکیت کے لیے خود میدان خالی کر رہا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو خود اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا اشتراکیت پہنچا سکتی ہے، ان حالات میں کسی کی ترجیح کا کوئی سوال نہیں، دوسروں کے سہارے پر چلنے والی قوم کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی (ایشیا)

وہ لوگ جن کا انجام بخیر ہوا

(شمس نوید عثمانی)

شاید ہی کسی مسلمان کا سینہ اس آرزو سے خالی ہو کہ جس دن اس کے جسم و جان کا یہ قریب ترین رشتہ ٹوٹے اس دن اس کا دل اپنی ایک ایک دھڑکن کے ساتھ خدا اور یوم آخر سے جڑا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض ایک آرزو ہے اور آرزو بے حد قیمتی اور نہایت ہی قابل رشک ہے۔ لیکن تنہا آرزو سے کوئی کام نہیں ہوا کرتا۔ آرزو اس وقت زیادہ سے زیادہ جاگتے کا ایک حسین خواب ہی ہے جب تک وہ عملی جذبہ و فکر کی لہر بن کر زندگی کے پورے نظام کو حرکت میں نہ لے آئے ــــ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے وہ خواب جس کی تعبیر خوفناک نکلے اور کتنی غمناک ہے وہ حسین سے حسین آرزو جو پوری نہ ہو سکے۔

جس انسان کو خدا نے مومنانہ آغوش میں پیدا کیا ہو اس کو تو ایمانی حالت کے سوا کسی بھی حال میں مرنا ہی نہیں چاہیے۔ خوش قسمت ترین ہیں وہ لوگ جو ابھی زمین پہ سانس لے رہے ہیں اور ان کی موت کی ہچکی ابھی تک ان سے فاصلے پر ہو خواہ یہ فاصلہ ایک سال کا ہو یا ایک گھڑی کا ــــ بہرحال یہ فاصلہ ایک مہلت ہے اسی بات کی کہ کوئی اپنے لیے کیا چیز پسند کرتا ہے ــــ اس غیر یقینی اور فانی دنیا میں پاؤں پھیلا کر پچاس ہزار سالہ قیامت کے میدان میں بری طرح اپاہج ہونا ــــ یا اس جہان گذراں میں آبلہ پائی اور ٹھوکریں سہہ کر قیامت تک قبر میں چین سے پاؤں پھیلا کر سونا؟ ــــ اس بھڑکتی اور دہاڑتی چنگھاڑتی ہوئی آگ میں دھکیلا جانا جس کا نام جہنم ہے یا اس سدا بہار چمن میں بار پانا جس کی لازوال خوشیوں کے ساتھ نہ کوئی غم ہے اور نہ کوئی خوف تھا۔

ہر جاندار کو خود اپنی جان سے جتنا پیار ہے اتنا نہ اس کو کسی اور سے ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس سے۔ آج ہمیں زندگی کی یہ محبت کبھی کبھی اور کسی حد تک کسی خطرے کے وقت ضرور محسوس ہوتی ہے جہاں

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دودھ پلانے والی ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھی تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتی ہے لیکن دنیا کی دوسری مصنوعی اور باطل محبتوں نے آج ہمیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ ہم پوری طرح یہ بات جان سکیں کہ ہمیں خود اپنے آپ سے کس قدر محبت ہے۔ موت کے اس پار جہاں پہنچنے کے بعد ہم دنیا کی یہ تمام رشتے کی محبتوں کو اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آئے ہوں گے ہماری ذاتی ذات سے یہ محبت پوری قوت کے ساتھ بیدار ہو چکی ہوگی۔ چنانچہ آخرت کی سچی خبروں میں اس کی خبر دی گئی ہے کہ ایک آدمی جس کو اس کا نامۂ اعمال دوزخ کے سیاہ الاؤ میں گھسیٹنے لیے جا رہا ہوگا چاہنے کی پوری قوت کے ساتھ یہ چاہے گا کیا اگر سارے جہان کو دوزخ میں ڈلوا کر وہ اپنی جان بچا سکے تو ہنسی خوشی سے ایسا کر ڈالے۔ اپنی ماں اپنے باپ، اپنی بیوی، اپنے بچوں، اپنے دوستوں اور اپنی محبوبہ کو وہ دوزخ سے خود کو بچالے جانے کے لیے قربانی کا بکرا بنانا دل و جان سے پسند کرے گا! — آج جو رشتے اس کو دوزخ سے غافل بے پروا کیے ہوئے ہیں۔ کل ٹھیک اسی طرح دوزخ کی آگ کا ہیبت ناک منظر اور لرزہ خیز مشاہدہ اس کو ان تمام فتنہ آمیز رشتوں سے بے نیاز و غافل بنا ڈالے گا۔

لیکن — ابھی "آج" ہے اور یہ "کل" نہیں ہوئی! — اور یہ "آج" چل چکا ہے اور جا رہا ہے اور وہ "کل" بھی چل پڑی ہے اور چلی آ رہی ہے — اور ان دونوں کے درمیان میں وہ فیصلہ کن مہلت ہے جس کا نام زندگی ہے اب جس کا جی چاہے اس کے لیے اس کا موقع ہے کہ وہ اس دنیا کی طرف بھاگے جو اس سے بیٹھ پھیرے بھاگ رہی ہے یا دارالقرار۔ یعنی جہان باقی کی طرف رُخ کرلے جو اس کی طرف منہ کیے ہوئے چلا آ رہا ہے۔

ایک آدمی کی قدرتی آرزو یہی ہوتی ہے کہ وہ اس آخرت کی طرف قبلہ رو ہو جائے جو اس کی طرف کو آ رہی ہے لیکن دیکھنا وہ یہ ہے کہ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے — چاروں طرف سے آدمیوں، اسی جیسے آدمیوں کی بھیڑ کی بھیڑ اس دنیا کی طرف سرپٹ بھاگ رہی ہے جو ان سے منہ پھیرے ہوئے دور بھاگی چلی جا رہی ہے۔ اور دوسرا کل یہ حال دیکھ کر اس آدمی کے اوپر ایک خود فراموشی کا عالم طاری ہونے لگتا ہے۔

حالانکہ یہی گمراہ دنیا جو اپنے لیے تباہ کن ہے خود اسی آدمی کے لیے انتہائی بابرکت اور حیات انگیز ہے جو آخرت کے لیے جینا چاہے۔ — اسی دنیا نے اپنی قیمت گرا کر اس آدمی کی قیمت اتنی بڑھا دی ہے کہ کبھی اس سے پہلے اس کی یہ قیمت نہ تھی۔ کل جب یہ حال نہ تھا تو خدا کے آخری رسولؐ نے اپنے اصحاب سے کہا تھا کہ اگر سو میں سے تم نوے پر عمل کرلو اور دس حکم چھوٹ جائیں تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ لیکن اس عہد حاضر جیسے زمانوں کے متعلق

کچھ ایسی بات کہی گئی تھی کہ " ایک دور ایسا آئے گا جب سو میں سے نوے چھوڑے جاتے اور دس پر عمل پیرا ہونے کے بعد بھی آدمی کا بیڑا پار ہو جائے گا۔ اس ذیل میں کچھ ایسے واقعات پیش کیے جا رہے ہیں جن سے یہ پتہ چل سکے کہ کس قسم کی زندگیاں ہوتی ہیں وہ کہ جنھوں نے ایمان کی گود میں آنکھ کھولی ہو اور ایمان ہی کی آغوش میں آنکھیں بند کی ہوں۔ پیدائش کے وقت جن کے کانوں میں اللہ کا نام پھونکا گیا اور سکرات موت میں اللہ کا وہی نام ان کی زبان سے پھوٹ نکلا ہو۔ جو خدا کا نام سنتے ہوئے دنیا میں آئے اور خدا کا نام سناتے ہوئے اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔

موت اور مسکراہٹ

۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو وہ تاریخی دن تھا جس دن صلیبی لڑائیوں کی صلیب پر امت مرحومہ کو زندہ بچا لینے والا مسلمان سلطان صلاح الدین ایوبی آخرت کے لیے پا بر کاب تھا۔ یہ دن اس مجاہد جلیل کی بیماری کا بارھواں دن تھا۔ اس وقت جبکہ تین دن سے نیند اور غفلت میں پڑے ہوئے صلاح الدین ایوبی کے سرہانے شیخ ابوجعفر جیسا بزرگ قرآن مجید کی دل دوز اور اشک بار تلاوت میں ڈوبا ہوا تھا، جیسے ہی قرآن کے یہ الفاظ ان کی زبان سے فضا میں بلند ہوئے کہ

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ

اچانک غفلت و بے ہوشی کی گہری نیند سے سلطان نے آنکھیں کھول دیں ـــــ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلی تمام چہرہ خوشی کی شدت میں پھول کی طرح کھل اٹھا اور ـــــ جذبہ و شوق کی طوفانی گہرائیوں کا وقار و جمال لیے ہوئے ارشاد فرمایا۔

صحیح ہے!

اور ـــــ شہادت حق کے یہ آخری الفاظ دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ گونجتے رہنے کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ کر سلطان نے ہمیشہ کے لیے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے ان الفاظ کے شدید کیف و سرور میں خود ان کی روح کو نیند آ گئی ہو۔ کتنی پرسکون اور پرکیف تھی اس مسلمان کی یہ جاں کنی جس نے خون حیات کا ایک قطرہ اور غم آخرت کا ایک آنسو بھی اسلام سے بچا کر نہ رکھا تھا۔ اس نے اپنے ترکے میں متاع دنیا کا ایک پیسہ ایک انچ زمین بھی نہ چھوڑی تھی ـــــ قبر کے لیے گھاس کے پولے بھی قرض سے آئے۔ اور کفن کا انتظام بھی ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے اپنے کسی جائز و حلال ذریعے سے کیا۔ لیکن دولت دل کا جتنا بڑا خزانہ وہ اپنے ساتھ لے گئے اتنا ہی

عملی زندگی کا سرمایہ اپنے پیچھے آنے والے قافلوں کے لیے چھوڑ گئے ۔

اس عظیم الشان انجام کا حسن و جمال اس آدمی کو ملا اور اس جیسے ہر اس آدمی کو آج بھی مل سکتا ہے جس کا حال یہ تھا کہ :۔

"میدان جہاد کے سوا کسی اور طرف ان کی طبیعت متوجہ ہی نہ ہوتی تھی ۔ ایک بار اس کیفیت میں جمعہ سے اتوار تک سلطان نے گنتی کے چند لقموں کے سوا کوئی شے حلق سے نیچے نہ اتاری ۔ جہاد کی محبت اور اس کا عشق ان کے رگ و ریشے میں سما گیا تھا ۔ وہ بولتے تو جہاد بولتے ۔ جہاد ہی سوچتے ۔ اور جہاد ہی سننا پسند کرتے ۔ ایسے ہی لوگوں کی انہیں تلاش رہتی اور اسی کی تیاری ان کا واحد شغل تھا ۔ اس کے لیے انھوں نے اولاد گھر بار ملک وطن سب کچھ چھوڑ کر ایک خانہ بدوش کی سی خیمے کی زندگی اختیار کی ۔ قسم کھائی جا سکتی ہے کہ اپنے عزم جہاد کے پہلے دن سے موت تک انھوں نے ایک پیسہ بھی کسی دوسرے مصرف میں خرچ نہیں کیا تھا اور زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی اور کام کے حوالے نہیں کیا تھا ۔ میدان جنگ میں ان کی کیفیت اس غم زدہ ماں کی سی ہوتی جس نے اپنے اکلوتے بچے کا داغ اٹھایا ہو ۔ وہ ایک صف سے دوسری صف تک دیوانہ وار گھوڑے پر دوڑتے پھرتے اور جس وقت رہ رہ کر یہ ہوک ان کے ہونٹوں سے بلند ہوتی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو جاتیں ۔

"یا للاسلام! ۔۔۔ ہائے! اسلام!! ہائے! اسلام!!"

اور وہ "اسلام" جس کے لیے وہ اس طرح ماہی بے آب نظر آتے تھے حقیقتاً نام نہاد مذاہب کے جامہ میں خوں آشام خود پرستی تھا یا حقیقی خدا پرستی کی شکل میں انسانیت کا وہ درد تھا جو ایک خدا کے پروانے کے دل ہی میں پیدا ہو سکتا ہے ۔ یہ بات بھی انھوں نے خوب کھول کر اس دنیا کو بتا دی تھی ۔ بتا دیا تھا کہ اسلام "ظلم" سے نفرت سکھاتا ہے، ظالم سے نہیں ۔ وہ زندگی کا دشمن اور انسانیت کا دوست ہے وہ ظلم کو ظلم سے نہیں مٹاتا ، ظلم کا خاتمہ انصاف کے ذریعہ کرتا ہے ۔ وہی یروشلم جہاں حضرت مسیح علیہ السلام نے رحم اور محبت کا وعظ دنیا کو سنایا تھا اور وہی یروشلم جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام لے کر نام بدنام کرنے والوں نے بیت المقدس میں اس طرح فاتحانہ داخلہ لیا تھا کہ ان کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں خون میں ڈوبے ہوئے تھے ۔۔۔ جہاں بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر دیواروں سے دے مارا گیا تھا اور فصیلوں سے چکر دے کر پھینکا گیا تھا ۔ مردوں اور عورتوں کے جسم ریزہ ریزہ کیے گئے تھے ، یہودیوں کو ان کے ہیکل

میں زندہ جلایا گیا تھا اور آخر میں عربوں کے خون سے شہر کی سڑکیں دھلائی گئی تھیں ۔ ہاں اسی شہر میں جب اس "اسلام" کا فاتحانہ سایہ لہرایا تو صلاح الدین ایوبی کی

"سپاہ اور معزز ذمہ دار افسران نے جو ان کے ماتحت تھے شہر کے گلی کوچوں میں یہ زبردست انتظام قائم کر رکھا تھا کہ ظلم نہ ہونے پائے ۔ اس کا نتیجہ تھا کہ مفتوح شہر میں جنگ ختم ہونے کے بعد ایک عیسائی کو بھی ذرا سی آنچ نہیں آنے پائی ۔ شہر کے دروازے پر ایک نہایت ایماندار سردار ان تمام شہریوں کو جہاں چاہیں انہیں جانے دے رہا تھا جو زرفدیہ ادا کر چکے ہوں ۔

اور پھر یہ زر فدیہ بھی اٹھا دیا گیا اور ـــــ

"اب صلاح الدین ایوبی نے اپنے امیروں سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنی طرف سے اور پایان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کر دی (ہزار ہزار غلام آزاد کر دیے) اب میں اپنی طرف سے خیرات کرتا ہوں اور یہ کہہ کر تمام شہر کے گلی کوچوں میں اعلان عام کرا دیا کہ تمام بوڑھے جن کے زر فدیہ ادا کرنے کو نہیں ہے آزاد کیے جاتے ہیں کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں ۔ چنانچہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک ضعیفوں کی صفیں باہر نکلتی رہیں ۔

اور ـــــ

"یروشلم کی فتح کے بعد سلطان نے عیسائی بادشاہ گائی کو اپنے پہلو میں عزت کے ساتھ بٹھایا اور اس کو پیاسا دیکھ کر سرد پانی کا گلاس پیش کیا ۔ ہاں اس وقت صرف ایک شخص تھا جو اس دریائے رحمت میں طغیانی کے وقت بھی سلطان کے انتقام ہی کی زد میں آیا اور وہ تھا ریجی نالڈ ! ـــــ سلطان نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا ۔

"سن ! کہ میں نے تجھے خود قتل کرنے کی دو بار قسم کھائی تھی ۔ ایک اس وقت جب تو نے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا اور دوسری بار اس وقت جب تو نے دھوکے اور دغابازی سے حاجیوں کے قافلے پر حملہ کیا تھا اور جب ان بے کس حاجیوں نے انسانیت اور شرافت کے لیے درخواست پیش کی تو تو نے گستاخانہ کہا کہ "اپنے محمد سے کہو وہ تمہیں رہائی دے" بعض روایات یہ ہیں کہ اس شخص کو بھی قتل کرنے سے پہلے سلطان نے اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور جب اس نے اس کو بھی ٹھکرا دیا تو قتل کر دیا ۔

(اصل واقعات کی حد تک مولانا ابوالحسن علی میاں کے ایک مضمون سے ماخوذ)

کتابیات: سلطان صلاح الدین ایوب۔ النوادر السلطانیہ

تاریخ ابی الفداء حموی۔ وغیرہ

خدا سے حسن ظن کی رعنائیاں

ابوحیان توحیدی جس کو یاقوت حموی نے معجم الادبا جلد ۵ ص ۷ پر بزم صوفیہ کا صدر نشین طبقہ ادبا کا فلسفی، گروہ فلاسفہ کا ادیب، فرقہ معتزلہ کا دانش ور، نکتہ رسوں کا گل سرسبد، اہل زبان کا پیشوا، یگانۂ روزگار" وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔ جب اس شخصیت پر زندگی کا وہ آخری دن آیا جو ہر جان دار پر ایک نہ ایک دن آنا ہے تو سکرات موت کے آثار دیکھ کر حاضرین کے دل و دماغ اس فیصلہ کن ساعت پر پوری دل سوزی کے ساتھ متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا

"اللہ کا ذکر کرو! ـــــ کیونکہ یہ وقت خدا سے ڈرنے کا ہے یہی وہ گھڑی ہے جس کے لیے عمر بھر انسان تیاری کیا کرتا ہے"

چنانچہ تمام حاضرین سوز و گداز اور فکر و درد کے ساتھ ابوحیان کے سامنے ذکر اور تلقین کرنے لگے ـــ یہ دیکھ کر ابوحیان نے سر اٹھا کر ان تمام چہروں کی طرف غور سے دیکھا اور عجب کیفیت میں یہ الفاظ اس کی زبان تک لڑکھڑاتے ہوئے آئے

"معلوم ہوتا ہے میں کسی فوجی یا پولس کے آدمی کے پاس جا رہا ہوں بس ـــــ میں تو رب غفور کے حضور میں جا رہا ہوں" (لسان جلد ۶ ص ۳۷۳)

ابوحیان توحیدی اور شیخ المشائخ ابوالحسن احمد البیضاوی میں اختلاف رائے تھا۔ شیخ نے ابوحیان کی وفات کے بعد ان کو خواب میں دیکھا اور پوچھا۔ کہو کیا گزری؟ خدا نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟

ابوحیان نے جواب دیا۔ آپ کی توقع کے خلاف میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا۔ صبح کو شیخ نے یہ خواب اپنے مریدین کو سنایا اور بہ نفس نفیس ابوحیان کے مقبرے پر حاضری دی۔

خدا سے یہ حسن ظن کی سدا بہار رعنائیاں دیکھ کر آدمی اس حسن ظن کی قیمت محسوس کر سکتا ہے لیکن خود یہ حسن ظن بھی خود بخود نہیں اگ آتا۔ یہ اس انسان کے دل کی سرزمین اگتا ہے جس کا حال وہ ہو جو ابوحیان کے متعلق یاقوت حموی نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

(باقی ص ۳۵۴ پر)

مسلم پرسنل لا

علی گڑھ میں ایک باوقار سیمینار

اسلامک ریسرچ سرکل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے زیر اہتمام ۱۴، ۱۵ ستمبر ۶۹ء کو مسلم پرسنل لا کے موضوع پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں راقم الحروف کو بھی شرکت کا موقع ملا۔ یونیورسٹی یونین ہال میں اس کی متعدد نشستیں ہوئیں۔ پروفیسر حفیظ الرحمن صاحب مسلم یونیورسٹی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا منت اللہ رحمانی اور بیرسٹر نورالدین دہلی نے مختلف نشستوں میں صدارت کے فرائض انجام دیے اور آخری نشست اسلامک ریسرچ سرکل کے ڈائرکٹر مولانا صدرالدین اصلاحی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ یہ آخری نشست صرف اظہار خیالات، سوالات اور بحث و گفتگو کے لیے پروگرام میں بڑھادی گئی تھی۔ کئی پہلوؤں سے بحیثیت مجموعی یہ سیمینار خاصہ کامیاب رہا اور اگر اسلامک ریسرچ سرکل کے ذرائع و وسائل زیادہ ہوتے تو اس سے زیادہ کامیاب ہوتا پھر بھی بقول ڈاکٹر مقبول احمد (اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے موضوع پر اب تک اس سے زیادہ سنجیدہ، مفید اور کامیاب سیمینار کوئی نہیں ہوا۔ یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ اور کثیر تعداد میں طلبہ نے اس میں حصہ لیا۔ اساتذہ نے مقالے بھی پڑھے اور بحث و گفتگو میں بھی حصہ لیا۔ سیمینار کے منتظمین نے اردو اور انگریزی کے مقالے سائیکلو اسٹائل سے ٹائپ کراکے باقاعدہ فائل بناکر، باہر سے آنے والے مہمانوں اور سیمینار میں حصہ لینے والے مقامی اہل علم کو تقسیم کیے اور اکثر انگریزی مقالوں کی اردو میں تلخیص بھی چھپائی، اس طرح انگریزی نہ جاننے والوں یا کم جاننے والوں کو ان مقالوں سے استفادے کا موقع مل گیا۔ بعض مقالے جو فوری طور پر تیار کرکے پڑھے گئے تھے وہ ٹائپ نہیں ہوسکے۔ مثال کے طور پر ڈپارٹمنٹ آف لا کے استاذ جناب

سلسلے میں [illegible] انگریزی مقالہ اور مولانا حامد علی صاحب کا اردو مقالہ سائکلو اسٹائل نہیں ہو سکا انگریزی مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے تعددِ ازدواج کا ایک سیر حاصل تاریخی جائزہ پیش کیا ہے اردو مقالے میں مولانا حامد علی نے مسلم پرسنل لا کے متعدد مسائل پر اختصار اور جامعیت کے ساتھ گفتگو کی ہے اور اجتہادی مسائل میں جزوی ترمیم، ترجیح یا تبدیلی کے کچھ طریقے بتائے ہیں۔ سیمینار کے تمام مقالے اسلامک ریسرچ سرکل کے ترجمان "اسلامک تھاٹ" کے ایک خاص نمبر میں شائع کیے جائیں گے اور ان شاء اللہ یہ نمبر اس موضوع پر ایک مفید اور قابل قدر مجموعہ ہوگا۔

اس سیمینار میں حصہ لینے والے دو باتوں پر متفق تھے۔ ایک یہ کہ حکومت ہند کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ بھارت کا دستور اس کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہو یا نہ دیتا ہو، کسی بھی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے دین و مذہب میں مداخلت کرے اور زبردستی اس کے بعض احکام پر ترمیم و تنسیخ کی قینچی چلائے۔ دوسری بات جس پر اتفاق تھا یہ تھی کہ قرآن اور احادیث کے منصوص اور مسلّم احکام میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی البتہ اجتہادی و استنباطی مسائل میں حسب ضرورت و حالات، جزوی تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن یہ تبدیلی خود مسلمان کر سکتے ہیں کسی دوسرے کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ صرف اسلامی قانون کے ماہرین (علماء) ہی نہیں بلکہ انگریزی قانون کے بعض ماہرین نے بھی ولولہ انگیز اور ایمان افروز تقریریں کیں۔ بیرسٹر نور الدین صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلامی قانون دنیا کا سب سے ترقی یافتہ اور جامع قانون ہے۔ اس نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے اور اب بھی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یورپ آج بھی رومن لا کے چکر میں ہے اور رومن لا اسلامی قانون سے فروتر ہے۔ مسلمانوں کو یورپ کی مرعوبیت سے اپنے ذہن کو پاک کرنا چاہیے۔ ایک اور ایڈوکیٹ صاحب نے جن کا نام میں بھول گیا اپنی تقریر میں کہا کہ جب خدا علیم و خبیر ہے تو پھر اس کے دیے ہوئے قانون میں تبدیلی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض مقررین نے کہا کہ تعددِ ازدواج کے سلسلے میں عورتوں پر ظلم کا بہت ذکر کیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مرد عورتوں کو راستے سے پکڑ کر زبردستی اپنی دوسری بیوی بنا لیتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اکثر و بیشتر دوسری شادیاں عورتوں اور ان کے سرپرستوں کی واقفیت اور مرضی سے ہوتی ہیں پھر اس کو عورتوں پر ظلم کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ واقعہ

یہ ہے کہ اگر اس کو ظلم قرار دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ عورتیں، عورتوں پر ظلم کر رہی ہیں۔ اگر وہ کسی مرد کی دوسری بیوی بننے سے انکار کر دیں تو یہ ظلم، اگر فی الواقع یہ ظلم ہے، آپ سے آپ ختم ہو جائے ـــــ ایک مقالہ نگار نے لکھا تھا کہ بعض اسلامی ممالک میں جائزہ لیا گیا تو دو بیویاں رکھنے والوں کی تعداد ایک بیوی رکھنے والے مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس پر ایک صاحب نے اظہار خیال کیا کہ جائزہ اس بات کا لینا چاہیے کہ جو لوگ دو بیویاں رکھتے ہیں ان میں سے کتنے عدل و انصاف کا سلوک کر رہے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو کسی ایک بیوی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ تجویز بہت مناسب ہے۔ اس طرح کا جائزہ بھی ضرور لینا چاہیے لیکن پہلے یہ طے کر لینا ہو گا کہ کسی چیز کے عدل یا ظلم ہونے کا فیصلہ کس سند اور کس ماخذ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ مولانا سعید اکبر آبادی مدیر برہان نے بھی بصیرت افروز تقریر کی انھوں نے کہا کہ "حالات، حالات" کا شور سنتے سنتے کان پک گئے ہیں آخر وہ کیا حالات ہیں جن کی وجہ سے اسلامی قوانین میں تبدیلی کی ضرورت پیش آگئی ہو۔ مولانا جب تقریر کر کے واپس آئے تو میں نے ان کو مخاطب کر کے "جزاک اللہ" کہا تھا۔

جناب آر۔ ایم۔ عبدالکریم ایڈوکیٹ سپریم کورٹ نے اپنے انگریزی مقالے میں اجماع اور اجتہاد اور حالات کے مطابق مسلم لا میں تبدیلی پر بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے گورنر کو جو نصیحت کی تھی وہ ہر مسلمان کے سامنے ہر زمانے میں رہنی چاہیے۔ اجتہاد ایک مستقل ضرورت ہے۔" فاضل مقالہ نگار کو واقفیت ہونی چاہیے کہ علماء نے ہمیشہ نئے حالات و مسائل میں اجتہاد کیا ہے اور یہ دروازہ کلی طور پر کبھی بند نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں یہ بھی لکھا ہے کہ "قرآن ناقابل تبدیلی ہے مگر قرآن نے کیا ہدایات دی ہیں ان کے سمجھنے میں ملت کی اجتماعی بصیرت کا استعمال ہے۔" بلاشبہ قرآن کی ہدایات پر غور کرتے رہنا چاہیے اور علماء اس سے بھی کبھی غافل نہیں رہے ہیں لیکن یہ بات تو فاضل مقالہ نگار کو بھی تسلیم ہو گی کہ مثال کے طور پر جب عربی لفظ کے معنے "اسپ" ہیں۔ حالات کے تغیر کی وجہ سے اس ذہنی دور میں اس کے معنی "خر" نہیں ہو جائیں گے۔ ایٹم بم "اسپ تازی" کو ہلاک تو کر سکتا ہے اس کو "خر" نہیں بنا سکتا۔

ہندوستان میں مسلم پرسنل لا، میں تبدیلی کا جب ذکر آتا ہے تو اسلامی ممالک کی مثال پیش کی جاتی ہے اس لیے سیمینار میں اس موضوع پر بھی مقالے پڑھے گئے۔ جناب طاہر محمود صاحب ال، ال، بی دہلی نے بھی اپنے

مقالے میں اس پر گفتگو کی اور اس موضوع پر جناب فضل الرحمٰن گنوری نے تو بہت ہی پُر از معلومات مقالہ انگریزی میں لکھا ہے اپنے مقالے کی اردو تلخیص انھوں نے سمینار میں پڑھی تھی۔ ان مقالوں کا حاصل یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں تبدیلی کا ذکر کرکے لوگوں کو فریب میں مبتلا کیا جاتا ہے اس لیے کہ اکثر و بیشتر اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں ان کی نوعیت یہ ہے کہ مختلف مسالک فقہ میں سے کسی ایک مسلک کے قول کو دوسرے اقوال پر ترجیح دے کر اسی کو نافذ کر دیا گیا ہے۔ جناب طاہر محمود نے اپنے مقالے میں لکھا ہے:۔

"یہ امر پوری دنیائے اسلام میں متفق علیہ ہے کہ شریعت ناقابل ترمیم ہے۔ اس اصل پر سارا عالم اسلامی متفق ہے کہ حقیقی شارع اور قانون ساز صرف اللہ ہے جس کی مرضی کا مستند بیان اسلامی شریعت ہے"

جناب ایس اے شفیع صاحب اسپشل مجسٹریٹ دہلی نے بھی اپنے مقالے میں تسلیم کیا ہے کہ "اسلام کے بنیادی قوانین میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں، اصل مسئلہ ان کو ان کی اصل روح کے مطابق نافذ کرنے کا ہے"۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جب تک یہ عقیدہ سلامت ہے امید ہے کہ ان شاء اللہ افہام و تفہیم سے عقیدہ و عمل کا تضاد بھی دور ہو جائے گا۔ اس تضاد کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ جو لوگ کتاب و سنت کے منصوص احکام کو ناقابل ترمیم سمجھتے ہیں انہیں میں کے کچھ افراد جب مسلم پرسنل لا میں تبدیلی و ترمیم کی تجاویز پیش کرتے ہیں تو انہیں یاد نہیں رہتا کہ کون سا حکم منصوص ہے اور کون سا غیر منصوص۔ اور اسی تضاد کا مظاہرہ یہ ہے کہ بعض اسلامی ممالک میں منصوص اور مسلمہ احکام پر بھی ہاتھ صاف کیا گیا ہے۔ سمینار میں بعض لوگوں نے اس کا اظہار بھی کیا تھا کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اسلامی ممالک میں منصوص احکام میں تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ اس سمینار کے مقالوں میں تعدد ازدواج، پوتے کی وراثت، تین طلاقیں بیک مجلس اور نکاح و طلاق کو ان مسائل کی فہرست میں پیش کیا گیا تھا جن پر غور و فکر ہونا چاہیے اور ان سے متعلق کچھ نئے ضوابط اور قوانین بنانے چاہییں جناب ممتاز علی خاں (شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی) نے کہا کہ جب تک مسلم معاشرے کے اخلاق و کردار کی اصلاح نہ ہو، نئے قوانین اور نئے ضوابط بنانے سے کوئی خاص فائدہ نہ ہو گا۔ بلاشبہہ ممتاز صاحب کا اٹھایا ہوا یہ نکتہ پوری توجہ کا مستحق ہے۔ مختصر یہ کہ خود مسلمان اہل علم کے درمیان مسلم عائلی قوانین جس جس انداز فکر سے گردش کر رہے ہیں، یہ سمینار اس کا سنجیدہ مظاہرہ تھا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا نہ سمینار کی روداد ہے اور نہ اس کا مفصل جائزہ بلکہ صرف راقم الحروف کا تاثر ہے جس میں مختصر تبصرے کا رنگ بھی آ گیا ہے۔

آخر میں ریڈینس دہلی کے نمائندے کی رپورٹ پر چند لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ رپورٹ ۲۹ ستمبر کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ یہ صرف میرا ہی احساس نہیں ہے بلکہ چند ان ذمہ داروں کا احساس بھی ہے جو خود سمینار میں شریک تھے کہ یہ رپورٹ یک طرفہ ہے اور اس سے سمینار کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔ نمائندہ صاحب نے راقم الحروف کے مقالے کا خلاصہ بھی صحیح بیان نہیں کیا۔ میرا مقالہ چار سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے اور ان سوالات میں سے کوئی ایک سوال بھی نہیں ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت وقتی طور پر دی گئی تھی اب اس کی اجازت باقی نہیں ہے مجھے تو اس کی واقفیت بھی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے یہ دعوے کیا ہو کہ تعدد ازدواج کی اجازت منسوخ ہو چکی ہے۔ میں اس پر بحث کیا کرتا۔

میرے مقالے کا ایک اہم حصہ اس عدل کی تشریح میں ہے جو تعدد ازدواج کی آیت میں بطور شرط موجود ہے لیکن ریڈینس کے نمائندے نے اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ نمائندے نے جناب انور علی خاں سوز کی طرف جو بات منسوب کی ہے وہ انھوں نے سمینار میں نہیں کہی تھی اور جو بات انھوں نے کہی تھی وہ رپورٹ میں نہیں ہے اور ان کی طرف منسوب کر کے جو بات اس رپورٹ میں لکھی گئی ہے وہ جناب انور علی خاں سوز جیسے مرد معقول کی طرف منسوب نہ ہونی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ جناب سوز صاحب نے جو مقالہ پڑھا تھا اس کے خلاصے سے ریڈینس کے قارئین کو نمائندہ صاحب نے معلوم نہیں کیوں محروم رکھا۔ —————

(بقیہ صفحہ ... دفعہ ۳۵ میں درج ذیل اضافہ کیا جائے)

دفعہ ۲۵ میں "امیر جماعت" کے بعد "مصالح جماعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے" کا اضافہ کر دیا جائے۔

البتہ اگر کسی مقام پر ارکان کی تعداد بیس سے زائد ہو تو وہاں مقامی مجلس شوریٰ کا قیام بھی عمل میں لایا جا سکے گا۔

اس کے بعد مجلس نمائندگان کے ایک تہائی (۲۰) حاضر ارکان کے دستخط سے دوران اجلاس ترمیم دستور کی حسب ذیل تجویز پیش ہوئی۔

دستور جماعت کی دفعہ ۴۳ میں "ہمیشہ" لفظ کی جگہ "عام طور پر" کے الفاظ رکھ دیے جائیں۔

طے ہوا کہ صرف اتنا کافی ہوگا کہ اس دفعہ سے لفظ "ہمیشہ" حذف کر دیا جائے۔

اس کے بعد اجلاس دعا پر برخاست ہو گیا۔ قیم جماعت اسلامی ہند محمد یوسف

(بقیہ صفحہ ۴۴) • بڑا عابد و زاہد تھا۔
• اس کا دن قرآن کی تلاوت اور خشوع میں گزرتا۔
• اور رات نمازوں اور خضوع میں بسر ہوتی تھی۔
• چالیس سال مسلسل روزے رکھے۔

رودادِ مجلس نمائندگان جماعت اسلامی ہند

۲۵ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۶۸ء

الحمد للہ کہ مجلس نمائندگان کا اجلاس زیر صدارت مولانا ابو اللیث صاحب بتاریخ ۲۵ ستمبر ۶۸ء بروز چہارشنبہ ۸ بجے صبح سے مرکز جماعت اسلامی ہند واقع بازار چتلی قبر دہلی میں شروع ہوا اور بتاریخ ۳۰ ستمبر ۶۸ء بروز دوشنبہ تقریباً ۹½ بجے شب میں بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

مجلس کا ایجنڈا دو چیزوں پر مشتمل تھا۔

۱۔ دفعہ ۳۹ ج (دستور جماعت اسلامی ہند) کے مطابق اس مسئلہ پر غور و فیصلہ کہ ارکان جماعت پر سے ووٹ نہ دینے کی پابندی ہٹالی جائے لیکن ارکان جماعت اپنے ووٹ کے استعمال کرنے میں ان شروط و حدود کے پابند ہوں گے جن کو جماعت اس سلسلے میں وضع کرے گی۔

۲۔ دستور جماعت میں ترمیم سے متعلق سفارشات اور تجاویز پر غور۔

شرکاء اجلاس مجلس نمائندگان کے اجلاس میں، ۷۶ ارکان مجلس (بشمول امیر جماعت بحیثیت صدر مجلس اور قیم جماعت بحیثیت معتمد) میں سے ۶۰ ارکان نے شرکت فرمائی جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عبد الخالق احسن متقیمی صاحب۔ ۲۔ عبد الفتاح صاحب۔ ۳۔ مولانا ابوبکر صاحب۔ ۴۔ مولانا محمد عزیز صاحب المظاہری۔ ۵۔ ضیاء الرحمن صاحب۔ ۶۔ رشید عثمانی صاحب۔ ۷۔ عبد الباری صاحب۔ ۸۔ عبد الباری شبنم سبحانی صاحب۔ ۹۔ مولانا نظام الدین صاحب۔ ۱۰۔ محمود احمد خاں صاحب۔ ۱۱۔ محمد مسلم صاحب۔ ۱۲۔ غلام احمد حسن صاحب۔ ۱۳۔ محمد یوسف صاحب صدیقی۔ ۱۴۔ مولانا مظہر الحق صاحب۔ ۱۵۔ مولانا سلمان صاحب۔ ۱۶۔ سید ضیاء الہدیٰ صاحب۔ ۱۷۔ محمد حسین صاحب بسلی۔ ۱۸۔ اکرام الدین احمد صاحب۔ ۱۹۔ نسیم احمد صاحب۔ ۲۰۔ سراج الحسن صاحب۔ ۲۱۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب۔ ۲۲۔ اے کے عبد القادر صاحب مولوی۔

۲۳۔کے پی کے اسعد صاحب مولوی، ۲۴۔ راؤ شمشاد علی خاں صاحب۔ ۲۵۔مولانا شہباز صاحب۔ ۲۶۔ مولانا شبیر احمد صاحب۔ ۲۷۔ مولانا محمد خلیل صاحب رحمانی۔ ۲۸۔ محمد یونس صاحب۔ ۲۹۔ حافظ انوار اللہ محمود صاحب۔ ۳۰۔ خورشید حسن صاحب رضوی۔ ۳۱۔ التفات احمد صاحب۔ ۳۲۔ سید اختر صاحب۔ ۳۳۔ عبدالرزاق صاحب لطیفی۔ ۳۴۔ انعام الرحمٰن خاں صاحب۔ ۳۵۔ سید جعفر علی صاحب۔ ۳۶۔ محمد نجات اللہ صاحب صدیقی۔ ۳۷۔ محمد عبدالحی صاحب۔ ۳۸۔ مولانا سید حامد علی صاحب۔ ۳۹۔ جمال احمد صاحب۔ ۴۰۔ مولانا سید احمد عروج صاحب قادری۔ ۴۱۔ محمد شفیع صاحب مونس۔ ۴۲۔ مولانا صدرالدین صاحب۔ ۴۳۔ حسین سید صاحب۔ ۴۴۔ ارشاد حسین صاحب جعفری۔ ۴۵۔ م نسیم صاحب۔ ۴۶۔ مولانا عبدالغفار صاحب ۴۷۔ مولانا حبیب اللہ صاحب۔ ۴۸۔ نعیم اللہ صاحب۔ ۴۹۔ مولوی محمد صدیق صاحب۔ ۵۰۔ مولانا محمد یوسف صاحب۔ ۵۱۔ سید حامد حسین صاحب۔ ۵۲۔ سلطان احمد خاں صاحب۔ ۵۳۔ عرفان احمد خاں صاحب ۵۴۔ عبدالعزیز صاحب۔ ۵۵۔ عبدالحق صاحب۔ ۵۶۔ شیخ فرید صاحب۔ ۵۷۔ انیس الدین احمد صاحب ۵۸۔ افضل حسین صاحب۔ ۵۹۔ محمد یوسف۔ ۶۰۔ مولانا ابواللیث صاحب

سات ارکان جن کے نام حسب ذیل ہیں اپنی مختلف مجبوریوں کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔

۱۔ کے معید و صاحب مولوی، ۲۔ عبدالسلام صاحب مولوی۔ ۳۔ پی محمد صاحب مولوی۔ ۴۔ پی محمد ابوالجلال صاحب مولوی۔ ۵۔ کے سی عبداللہ صاحب مولوی۔ ۶۔ عبدالقیوم صاحب۔ ۷۔ ٹی کے عبداللہ صاحب مولوی

حاضر ارکان مجلس میں سے دو صاحبان اجلاس کے ختم ہونے سے قبل اپنی معذوریوں کی بنا پر صدر مجلس سے اجازت لے کر واپس تشریف لے گئے تھے۔

اجلاس کی کارروائی کا آغاز مولانا محمد یوسف صاحب اصلاحی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد حسب ذیل اوقات کار کا تعین کیا گیا۔

۸ بجے صبح سے ۱۰ بجے تک پھر وقفہ ۲۰ منٹ اور اس کے بعد ۱۲ بجے دوپہر تک، پھر سہ پہر کو ۳ بجے سے ۴½ تک اور حسب ضرورت بعد مغرب تا عشاء۔

ایجنڈے کے مطابق سب سے پہلے گذشتہ اجلاس نمائندگان منعقدہ اپریل ۶۸ء کی روداد پڑھ کر سنائی گئی جس پر شرکاء مجلس نے اپنے اپنے دستخط ثبت کیے۔ اس کے بعد ایجنڈے کی پہلی دفعہ جو ارکان جماعت پر سے ووٹ نہ دینے کی پابندی ہٹانے سے متعلق تھی زیر غور آئی۔

اجلاس میں زیرِ غور مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے یہ بتایا کہ گزشتہ کئی برسوں سے جماعت کی مجلس شوریٰ مختلف پہلوؤں سے الیکشن کے مسئلے پر غور و فکر کرتی رہی ہے اور اس نے اس ضمن میں متعدد فیصلے بھی لیے ہیں جو مطبوعہ روداد شوریٰ جماعت اسلامی ہند میں درج ہیں۔

اس اصول کی حد تک ہمارے درمیان کامل اتفاق ہے کہ ملک کے عوام تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے کام کے نتیجے میں جب جمہوریہ ہند کا ایک موثر عنصر حاکمیت الٰہ کے اصول کو قبول کرلے تو اس ملک کے دستور کو اس اصول کے مطابق تبدیل کرانے کے لیے جماعت اسلامی الیکشن میں حصہ لے سکے گی مگر ابھی یہ مرحلہ نہیں آیا ہے۔

مجلس شوریٰ نے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے تحفظ کے لیے الیکشن میں حصہ لینے کے جائز ہونے کا بھی فیصلہ کیا ہے مگر یہ فیصلہ کثرت رائے سے ہوا ہے اور اختلاف رائے کی وجہ سے یہ مسئلہ بار بار مجلس شوریٰ میں زیر بحث بھی آتا رہا ہے جہاں تک اس مقصد کے تحت الیکشن میں عملاً حصہ لینے کا سوال ہے۔ اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جماعت سر دست اپنے امیدوار نہیں کھڑے گی مگر اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس مقصد کے تحت کھڑے ہونے والے دوسرے کچھ امیدواروں کے حق میں ارکان جماعت اپنے ووٹ استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے موقع پر اس اختلافی مسئلے میں رایوں کا تناسب کچھ ایسا تھا کہ باوجود اس کے کہ کچھ عملی فیصلے ممکن ہوگئے تھے امیر جماعت نے مناسب نہیں سمجھا کہ عملاً کوئی نیا قدم اٹھایا جائے۔

جو لوگ الیکشن میں حصہ لینے کے جواز کی رائے رکھتے ہیں ان میں سے اکثر کے نزدیک اس کی بنیاد اضطرار یا ضرورت کی دلیل رہی ہے۔ مگر شوریٰ میں ایک زاویہ نگاہ یہ بھی ہے کہ ایک جمہوری نظام میں الیکشن میں حصہ لینا اصلاً مباح ہے اور عمل لحاظ اس مقصد کا کیا جائے گا جس کے تحت الیکشن میں حصہ لینے کا ارادہ ہو۔ مئی کے اجلاس شوریٰ کے موقع پر الیکشن سے متعلق دوسرے مسائل کے ضمن میں یہ مسئلہ پھر سامنے آیا کہ ارکان جماعت پر سے وہ پابندی اٹھالی جائے یا نہ اٹھائی جائے جو ووٹ دینے کے سلسلے میں ان پر عائد ہے اور ارکان شوریٰ نے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اس مسئلے پر اظہار رائے کیا جب اس مسئلے پر رائے لی گئی تو رائیں اس طرح تقسیم پائی گئیں کہ جماعت کے دستور کی رو سے مجلس شوریٰ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی تھی اور یہ ضروری ہوگیا کہ بنیادی پالیسی کے اس اختلافی مسئلے میں ارکان جماعت کے مختلف نمائندوں اور امیر جماعت پر مشتمل مجلس نمائندگان سے فیصلہ چاہا جائے۔

امیر جماعت نے فرمایا کہ جس مسئلہ پر مجلس نمائندگان کو اس وقت غور و بحث کے بعد کسی فیصلہ تک پہنچنا ہے وہ یہ ہے کہ ارکان جماعت پرسے ووٹ نہ دینے کی پابندی ہٹالی جائے لیکن ارکان جماعت اپنے ووٹ کے استعمال کرنے میں ان شرائط و حدود کے پابند ہوں گے جن کو جماعت اس سلسلے میں وضع کرے گی۔

مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ووٹ دینے پرسے پابندی اٹھانے کے باوجود ارکان اپنے ووٹوں کے استعمال میں ان حدود و شرائط کے پابند ہوں گے جن کو جماعت طے کرے گی۔ آپ نے بتایا کہ عبارت کی رو سے حدود و شرائط کے ضمن میں ان حالات کی نشاندہی کرنا ہوگی جن میں ارکان جماعت اپنا ووٹ استعمال کر سکیں گے۔ امیدواروں کے اندر کیا اوصاف پائے جانے چاہئیں اور امیدوار کا تعلق کس طرح کی پارٹیوں سے ہونا چاہیے وغیرہ امور سے متعلق بھی شرائط طے کرنے ہوں گے۔ گویا پابندی اٹھالینے کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ آئندہ جو رکن جس امیدوار کو چاہے ووٹ دے یا لازماً اپنا ووٹ استعمال ہی کرے۔

مسئلہ کی نوعیت واضح کرنے کے بعد امیر جماعت نے فرمایا کہ اگرچہ فیصلہ طلب مسئلہ الیکشن کے ایک جزء یعنی حق رائے دہی کے استعمال سے تعلق رکھتا ہے لیکن اظہار خیال میں حسب ضرورت دوسرے متعلقہ مسائل سے بھی تعرض کیا جا سکے گا۔ اس کے بعد ارکان مجلس کو آپ نے اظہار خیال کی دعوت دی۔

ارکان مجلس کے اظہار خیال کا سلسلہ چار دن تک جاری رہا۔ مختلف نشستوں میں تقریباً ۲۵ گھنٹے تک مجلس کے ساٹھ حاضر ارکان میں سے دو تین ارکان کے علاوہ ہر رکن نے اظہار خیال کیا۔ بعض ارکان نے اپنے خیالات پہلے سے تحریری شکل میں مرتب بھی کر لیے تھے۔ اظہار خیال کے ساتھ ہی سوال و جواب اور بحث کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مجلس کے دوسرے ارکان کی طرح امیر جماعت نے بھی اظہار خیال کیا اور بحث میں حصہ لیا۔

اس پوری بحث و گفتگو سے یہ بات سامنے آئی کہ الیکشن اور متعلقہ مسائل میں ارکان مجلس کے درمیان خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور ہر رائے کے پیچھے کچھ دلائل بھی ہیں۔

اس بارے میں کامل اتفاق رائے کے باوجود کہ مبنی برحق نظام صرف وہی ہے جس میں حاکمیت اور قانون سازی کو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص سمجھ کر زندگی کا پورا نظام اسی کی ہدایات کے مطابق چلایا جائے اور جو نظام اس بنیاد پر قائم ہو وہ غیر اسلامی اور غلط ہے۔ موجودہ نظام کے تحت الیکشن میں حصہ لینے کی اصولی حیثیت کے بارے میں خاصا فرق ہے۔ ارکان مجلس کی ایک معتدبہ تعداد کے نزدیک چونکہ موجودہ جمہوری نظام کی بنیاد حاکمیت الٰہ کے مقابلے میں حاکمیت جمہور

کے تقسیم ہے۔ اس لیے اس میں رائے دہی، امیدواری اور مجالس قانون سازی کی رکنیت حرام یا ناجائز ہے اس حرمت یا عدم جواز سے استثناء یا تو اس صورت میں ہوگا جب الیکشن میں حصہ لے کر دستور میں حاکمیت الٰہ کی بنیاد پر مطلوبہ تبدیلیاں کرانا مقصود ہوں، یا اسلام اور مسلمانوں کو اضطراری حالات میں کسی بڑے سخت نقصان سے بچانے یا ان کے کسی عظیم مفاد کے تحفظ کی واحد راہ یہی رہ گئی ہو کہ الیکشن میں حصہ لیا جائے۔ ان ارکان مجلس کے نزدیک چونکہ نہ ایسے حالات درپیش ہیں نہ الیکشن ملی مسائل کے حل کی واحد راہ ہے اور نہ حاکمیت الٰہ کی دعوت کا ابھی باشندگان ملک میں عام تعارف ہو سکا ہے جو ان کو اس نظریہ کے مطابق اپنا نظام بدلنے پر آمادہ کر سکے۔ اس لیے سردست الیکشن میں حصہ لینے یا حق رائے دہی کے استعمال کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

بعض ارکان مجلس اگرچہ اضطرار سے کمتر حالات میں بھی الیکشن میں حصہ لینے یا کم سے کم حق رائے دہی کے استعمال کی گنجائش پاتے تھے لیکن ان کے خیال میں موجودہ حالات میں ایسا کرنے سے کوئی فائدہ ہونے کی امید نہیں ہے اس لیے جماعت کو یکسو ہو کر دعوت، اصلاح اور دوسرے تعمیری کاموں ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا چاہیے۔ اسی طرح بعض ارکان مجلس اگرچہ حاکمیت الٰہ کے نظریہ کے عام تعارف کے لیے اس بنیاد پر الیکشن میں حصہ لینے کو مفید سمجھتے تھے لیکن چونکہ مجلس شوریٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ سردست اس بنیاد پر الیکشن میں حصہ نہیں لینا ہے لہٰذا ابھی حق رائے دہی کے استعمال کا بھی کوئی موقع نہیں ہے۔

دوسری طرف ارکان مجلس کی ایک معتدبہ تعداد کے نزدیک اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کو بڑے سخت حالات و مسائل درپیش ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ضروری ہے۔ الیکشن میں حصہ لیکر اہم ملی مفادات کا کسی درجہ میں تحفظ ممکن ہے۔ اس ضمن میں فسادات کی روک تھام مسلم پرسنل لا، اوقاف، ابتدائی تعلیم اور اردو زبان وغیرہ ملی مسائل کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ ان میں سے بعض ارکان نے موجودہ حالات کو اضطراری حالات قرار دیا اور بعض ارکان نے یہ رائے ظاہر کی کہ الیکشن میں حصہ لینے کے لیے اضطرار ثابت کرنا ضروری نہیں بلکہ یہ بات کافی ہے کہ اس ذریعے سے اہم اسلامی مفادات کا تحفظ ممکن ہے۔ مگر چند دوسرے ارکان نے یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ حالات میں ہمارے الیکشن میں حصہ لینے سے ملی مسائل کے حل میں مدد ملنے کے بجائے اس سے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچ جانے کا قوی اندیشہ ہے۔

بعض ارکان مجلس نے یہ نقطہ نظر بھی پیش کیا کہ الیکشن میں حصہ لینے کو اصلاً حرام یا ناجائز اور صرف حالت اضطرار میں یا دستور میں حاکمیت الٰہ کی بنیاد پر مطلوبہ تبدیلیاں لانے کے لیے جائز کہنا غلط ہے ہمیں موجودہ جمہوری

نظام کے اس پہلو کو کہ وہ اجتماعی نظام یا اجتماعی امور و مسائل کے بارے میں کسی فیصلے تک پہنچنے کا ایک طریقہ ہو اس کی اس پہلو سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے کہ سردست جمہور ہند نے ایک مخصوص نظام کے حق میں فیصلہ کر رکھا ہے۔ ہمارے نزدیک حاکمیت جمہور اور انسانی قانون سازی کے حق میں کیا ہوا موجودہ فیصلہ غلط ہے۔ مگر اسی طریقۂ فیصلہ کو اختیار کر کے اس فیصلہ کو تبدیل کرایا جا سکتا ہے اور اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام کے حق میں فیصلہ کرایا جا سکتا ہے لہذا اس طریقۂ فیصلہ کو برتنا اور اس میں شریک ہونا بالکل مباح ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ الیکشن میں حصہ لینے سے ہمارا مقصد اہم اسلامی مفادات کا تحفظ اور دستور و قوانین میں ایسی تبدیلیاں کرانا ہو جو اسے حق کے مطابق کر دیں۔ الیکشن میں حصہ لینا مستحسن ہے۔ اس بارے میں جائز و ناجائز کی بحث کے بجائے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اپنے موجودہ حالات، وسائل اور مصالح کی روشنی میں تحریک اسلامی کے لیے الیکشن میں حصہ لینا کیسا ہوگا۔

ملک کے موجودہ دستور کے بارے میں یہ نقطۂ نظر بھی پیش کیا گیا کہ اس کی اصل حیثیت ہندوستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے شہریوں کے درمیان ایک معاہدے کی ہے اس لیے اس پر مبنی نظام کے ساتھ ہمارا رویہ وہی ہونا چاہیے جو کسی معاہدے کے ساتھ اس کے ایک فریق کا ہوتا ہے۔

بعض ارکان مجلس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب سردست حق رائے دہی کے استعمال کی کوئی فوری ضرورت نہیں سمجھی جا رہی ہے تو تمام نظریاتی بحثوں سے قطع نظر اس وقت پابندی نہ اٹھانا ہی مناسب ہے کیونکہ جماعت شروع سے اسی موقف پر ہی ہے اور جماعت کے ارکان اور متعارفین کے لیے بغیر کسی عملی ضرورت کے اس موقف میں تبدیلی قابل فہم نہ ہوگی اس کے برعکس بعض ارکان مجلس نے اس بات پر زور دیا کہ ارکان جماعت پر سے ووٹ نہ دینے کی پابندی اٹھا لینا ایک اصولی اور نظری ضرورت ہے جسے بہرحال پورا کرنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ عملاً اس حق کو استعمال کیا جاتا ہے یا نہیں یا کس حد تک استعمال کیا جاتا ہے۔ موقف کی اس تبدیلی سے ان بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا جو ہمارے طریق کار کے بارے میں جو پرامن اور تعمیری ہے۔ اہل ملک میں پائی جا سکتی ہیں۔ ساتھ ہی عام مسلمانوں کی یہ خلش بھی دور ہوگی کہ جس کام کو ہم بعض حالات میں جائز سمجھتے ہیں اس کا دروازہ اپنے ارکان کے لیے بالکل ہی بند کیوں کریں۔

ان مختلف نقاط نظر پر بحث و مذاکرہ کے دوران ارکان مجلس نے آیات و احادیث اور ائمہ کے کلیات و نظائر کے علاوہ متعلقہ مسائل پر معاصر علماء مفکرین کی رایوں اور فتووں کے حوالے بھی دیے بعض ارکان نے علمائے سیاسیات کی کتابوں سے حاکمیت کے تصور اور دوسرے علمی موضوعات پر اقتباسات بھی پیش کیے

جب [illegible] مجلس کو اطمینان ہو گیا کہ تبادلۂ خیال مکمل ہو چکا ہے تو اس نے فیصلہ طلب مسئلہ پر رائے شماری کی گئی جس کے نتیجہ میں چوبیس رایوں کے مقابلے میں چھتیس رائیوں سے یہ طے پایا کہ ارکان جماعت پر سے وہ پابندی نہ اٹھائی جائے جو ووٹوں کے استعمال کے معاملے میں ان پر عائد ہے۔

فیصلہ ہو جانے کے بعد مختلف گوشوں سے یہ خیال سامنے آیا کہ اب مختلف رائیں رکھنے کے باوجود اس اجتماعی فیصلہ پر اس اطمینان کے ساتھ عمل درآمد کیا جا سکے گا کہ یہ فیصلہ کافی غور و بحث کے بعد ارکان جماعت کی منتخب اور معتمد علیہ مجلس نے جو جماعت میں اعلیٰ ترین مقام رکھتی ہے، کیا ہے

اس کے بعد دستور جماعت میں ترمیم سے متعلق مجلس شوریٰ کی مندرجہ ذیل سفارشات امیر جماعت نے پیش کیں جنہیں مجلس نمائندگان نے باتفاق رائے سے منظور کر لیا۔

دفعہ ۱۷ (۵) میں "اور مجلس نمائندگان" کے بعد "یا امیر جماعت" کا اضافہ کیا جائے۔

دفعہ ۲۸ شق ۴ الف کی ذیلی شق ۲۸ کے بعد ذیلی شق ۲۹ کا اضافہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا جائے۔

"مجلس نمائندگان کے اجلاس میں ترمیم دستور کے متعلق کوئی تجویز پیش کرنا (دفعہ ۴۷)"

"مجلس شوریٰ" کے الفاظ جہاں جہاں دستور جماعت میں آئے ہیں وہاں "مرکزی مجلس شوریٰ" کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

جہاں جہاں دستور جماعت میں "مجلس مشاورت" کے الفاظ آتے ہیں وہاں "حلقہ کی مجلس شوریٰ" کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

دفعہ ۴۶ میں شق ج کا اضافہ کیا جائے۔

۴۶ (ج) امیر حلقہ اپنی ذمہ داریوں کو اپنے معاونین کے ذریعے بھی انجام دے سکے گا۔

دفعہ ۲۵ میں "سنبھالے گا" کے بعد یہ عبارت بڑھائی جائے۔

بصورت دیگر مرکز میں موجود ارکان جماعت کثرت رائے سے عارضی امیر کا انتخاب کر لیں گے۔

دفعہ ۲۵ میں "انتخاب کرے" کے بعد کی عبارت حذف کر کے یہ عبارت رکھی جائے۔

"امارت کا یہ نیا انتخاب عارضی ہو گا الا یہ کہ مجلس نمائندگان مصالح جماعت یا ضرورت کے پیش نظر اس انتخاب کو مستقل کرنے کا فیصلہ کرے۔

دفعہ ۴۲ الف میں "جس کا تقرر امیر جماعت" کے الفاظ کے بعد "مصالح جماعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے" کا اضافہ کیا جائے۔ (باقی صفحہ ۲۵ پر)

(بقیہ مطالعہ قرآن)

کل شہر ویصوم یوم عاشوراء فانزل الله (كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ) فكان من شاء ان یصوم صام ومن شاء ان یفطر ویطعم کل یوم مسکینا اجزأہ ذالک فهذا حول فانزل الله (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ) فثبت الصيام على من ثبت الشهر وعلى المسافران یقضی وثبت الطعام للشيخ الكبير والعجوز الذين لا يستطيعان الصوم، فهذا نص فی ان تلک الآیات فی حق الایام البیض و

(فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۳ ص ۲۲۸)

انما فرض صیام رمضان من قولہ (شہر رمضان) الخ

روزے اور یوم عاشوراء کے روزے رکھتے تھے پس کے بعد اللہ نے کتب علیکم الصیام سے وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین تک کی آیتیں نازل کیں تو جو شخص روزہ رکھنا چاہتا وہ روزہ رکھتا اور جو روزہ نہ رکھتا وہ ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلاتا اور یہ اس کی طرف سے کافی ہو جاتا پس یہ پہلا تغیر ہے پھر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن سے فمن شہد منکم الشہر فلیصمہ تک تو روزے لازم ہو گئے ان لوگوں پر جو مہینہ پائیں اور مسافر پر واجب ہوا کہ وہ قضا رکھے اور کھانا کھلانا ثابت رہا اس بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے جو روزہ رکھنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ حدیث صریح ہے اس بات پر کہ یہ آیتیں ایام بیض کے بارے میں ہیں اور رمضان کے روزے آیت شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن سے فرض ہوئے ہیں۔

ہمارے سامنے ابو داؤد کا جو نسخہ ہے اس میں "ثبت الشہر" کے بجائے "شہد الشہر" ہے یعنی فثبت الصیام علی من شہد الشہر۔ اوپر حضرت معاذ کی حدیث کا جو ٹکڑا اور علامہ مرحوم کی جو جو باتیں نقل کی گئی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا استدلال دو باتوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے تین دن اور سال میں یوم عاشورا کے جو روزے بطور خود رکھتے تھے انہیں روزوں کو فرض قرار دینے کے لیے کتب علیکم الصیام کی آیت نازل ہوئی اور دوسری یہ کہ وہ "ہذا حول" کا اشارہ انہیں تین دن کے روزوں میں رخصت فدیہ کو قرار دے رہے ہیں۔

راقم الحروف بڑے ادب کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ اس حدیث سے ان دو باتوں میں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی میں اس کے وجوہ ذیل میں پیش کرتا ہوں :۔

(۱) ابو داؤد میں یہ حدیث دو سندوں سے روایت کی گئی ہے اور ان دونوں کو ملا کر پڑھنے سے حدیث پوری ہوتی ہے بعض باتیں پہلی سند کی روایت میں راوی سے چھوٹ گئی ہیں جن کی تکمیل دوسری سند کی روایت سے ہوتی ہے اور بعض باتیں دوسری سند کی روایت میں مبہم ہیں جن کی توضیح پہلی سند کی روایت سے ہوتی ہے۔ روزوں کے بارے میں حضرت معاذؓ نے جو تین احوال بیان کیے ہیں ان میں سے پہلا حال پہلی روایت میں مفصل موجود ہے۔ میں نے اوپر صوم رمضان کی فرضیت میں تدریج کا ذکر کرتے ہوئے پورا ٹکڑا نقل کر دیا ہے اس میں "ثم انزل رمضان" کا جملہ اور اس کے بعد کی عبارتیں صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ جن روزوں میں یہ اختیار تھا کہ روزے نہ رکھ کر ان کے بجائے مسکین کو کھانا بھی کھلایا جا سکتا تھا اس کا تعلق ان روزوں سے ہرگز نہ تھا جو نبی علیہ السلام کتب علیکم الصیام کی آیت نازل ہونے سے پہلے ہر مہینے میں تین دن رکھتے تھے بلکہ اس رخصت کا تعلق رمضان کے روزوں سے تھا۔ پہلی روایت کے اس فیصلہ کن اور مفصل ٹکڑے کو نظر انداز کر کے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ حضرت معاذؓ نے رکن اسلام نماز کی طرح اس کے دوسرے رکن صوم رمضان کے تین احوال بیان کیے ہیں

(۲) جس روایت سے جناب شاہ صاحبؒ نے استدلال کیا ہے اس میں ہر مہینے تین دن کے روزوں کا ذکر ہے اس میں ایام بیض کے روزوں کا ذکر نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایام بیض کے روزوں کی فرضیت کہاں سے اور کیسے ثابت ہو گئی۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور ہر مہینے تین دن کے روزے متفرق طور پر بھی رکھتے تھے پھر کتب علیکم الصیام اور ایاما معدودات میں ایام بیض کی تعیین کس دلیل سے کی گئی ہے اور اس حدیث سے استدلال کس طرح صحیح ہوگا؟

(۳) اگر رمضان کے یہ روزے آیت شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن سے فرض کیے گئے ہیں اور اس سے پہلے کی آیتوں کا تعلق صوم رمضان سے نہیں ہے تو پھر ابو داؤد کی حدیث میں "فثبت الصیام علی من شہد الشہر" کے جملے کا مطلب کیا ہوگا؟ ثبت کا صیغہ کسی چیز کو فرض قرار دینے کے لیے استعمال نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہو تو قرآن یا احادیث سے اس کی کوئی نظیر پیش کرنا چاہیے۔ اس جملہ کا صاف اور متبادر مفہوم یہ ہے کہ صیام رمضان میں اطعام مسکین کی جو رخصت تھی وہ اب ختم ہو گئی اور پورے مہینے کے روزے لازم ہو گئے۔ اس کے علاوہ اسی حدیث میں "وثبت الطعام" کا جملہ بھی موجود ہے ظاہر ہے کہ اس کے معنی فرض اور وجوب کے نہیں ہیں بلکہ یہ ہیں کہ روزے کی استطاعت نہ رکھنے والے بوڑھوں کے لیے فدیہ دینے کی رخصت ختم نہیں ہوئی باقی رہی۔ ایک جگہ ثبت کا لفظ فدیہ کی رخصت ختم کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے اور دوسری جگہ اس کو باقی رکھنے کے لیے۔

(۴) ابو داؤد کی دونوں روایتوں سے مسئلہ صاف ہو جاتا ہے لیکن میں مزید توضیح کے لیے مسند احمد کی حدیث کے متعلقہ حصے نقل کرتا ہوں۔ امام احمد نے ابن ابی لیلیٰ ہی کے واسطے سے حضرت معاذ کی یہ حدیث روایت کی ہے

واما احوال الصیام فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم المدینۃ فجعل یصوم من کل شہر ثلثۃ ایام وقال یزید فصام سبعۃ عشر شہرا من ربیع الاول الی رمضان من کل شہر ثلثۃ ایام وصام یوم عاشوراء ثم ان اللہ عز وجل فرض علیہ الصیام فانزل اللہ عز وجل یا ایہا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم الی ہذہ الاٰیۃ وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین قال فکان من شاء صام ومن شاء اطعم مسکینا فاجزا ذالک عنہ قال ثم ان اللہ عز وجل انزل الاٰیۃ الاخری شہر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن الی قولہ فمن شہد منکم الشہر فلیصمہ قال فاثبت اللہ صیامہ علی المقیم الصحیح (مسند احمد ج ۵ ص ۲۴۶)

اور رہے روزوں کے تغیرات تو اس کی یہ صورت یہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ہر مہینے میں تین دن روزے رکھنے لگے اور یزید راوی نے کہا کہ آپ نے ۱۷ مہینے ربیع الاول سے رمضان تک روزے رکھے ہر مہینے میں تین دن اور یوم عاشوراء کے روزے بھی رکھے پھر آپ پر اللہ عز وجل نے روزے فرض کیے پس اللہ عز وجل نے یہ آیت نازل کی یا ایہا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام سے وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین تک۔ انہوں نے کہا جو چاہتا روزے رکھتا اور جو چاہتا ایک مسکین کو کھانا کھلاتا اور یہ روزے کا بدل ہو جاتا۔ انہوں نے کہا پھر اللہ عز وجل نے یہ دوسری آیت نازل کی شہر رمضان سے فمن شہد منکم الشہر فلیصمہ تک۔ انہوں نے کہا اللہ نے تندرست اور مقیم پر رمضان کے روزے لازم کر دیے

اس حدیث اور اس کے ایک ثقہ راوی یزید بن ہارون کے اضافے نے یہ بات سورج کی طرح روشن کر دی ہے کہ رمضان ۲ھ سے پہلے کُتِبَ علیکم الصّیام کی جو آیت نازل ہوئی اس نے رمضان کے روزے فرض کیے تھے۔ یہ وہی بات ہے جو ابوداؤد کی روایت میں صحابہ کرام نے ثُمَّ اُنزِلَ رمضان کے جملے سے بیان کی ہے یہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ ماہ رمضان کے روزے ۲ھ میں فرض کیے گئے تھے اور رمضان ۲ھ میں مسلمانوں نے رمضان کے روزے رکھے تھے۔ کون شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ نبی علیہ السلام سترہ مہینوں سے ہر مہینے تین دن کے جو روزے رکھتے آ رہے تھے انہیں روزوں کو فرض کرنے کے لیے سترہ مہینوں کے بعد کُتِبَ علیکم الصیام کی آیت نازل ہوئی تھی اور اگر کوئی یہ کہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رمضان ۲ھ میں بھی ماہ رمضان کے فرض روزے نہیں رکھے گئے اور رمضان کے روزے ۲ھ میں نہیں بلکہ معلوم نہیں کب فرض کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس حدیث میں بھی ہر مہینے تین دن کے روزوں کا ذکر ہے ایام بیض کے روزوں کا ذکر نہیں ہے اس لیے ایام بیض کے روزوں کی فرضیت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۵) اب میں امام بیہقی کی وہ حدیث نقل کرتا ہوں جس نے ہر قیاس آرائی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔

عن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ عن معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ قال احیل الصلوٰۃ ثلٰثۃ احوال فذکر الحدیث قال واما احوال الصیام فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صام بعد ما قدم المدینۃ فجعل یصوم من کل شہر ثلٰثۃ ایام وصام عاشوراء فصام سبعۃ عشر شہرا شہر ربیع الی شہر ربیع الی رمضان ثم ان اللہ تبارک وتعالیٰ فرض علیہ شہر رمضان فانزل علیہ کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم الآیۃ (بیہقی جلد ۴ صفحہ ۲۰۰)

عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ حضرت معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا نماز میں تین مرتبہ تبدیلی ہوئی پھر انھوں نے اس کی تفصیل بیان کی انھوں نے کہا اور رہا روزوں کا تغیر تو اس کی صورت یہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد روزے رکھے۔ آپ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے لگے اور عاشوراء کے روزے بھی رکھے اس طرح آپ نے سترہ مہینے ربیع الاول سے ربیع الاول تک اور پھر ربیع الاول سے رمضان تک روزے رکھے۔ پھر اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ پر ماہ رمضان کے روزے فرض کیے پس آپ پر یہ آیت نازل کی۔ کُتِبَ علیکم الصیام کما کُتِبَ عَلَی الَّذِینَ مِنْ قَبْلِکُمْ آخر آیت تک

یہ حدیث بلا شبہ اس بات پر نص صریح ہے کہ کُتِبَ علیکم الصیام کی آیت رمضان کے روزے فرض کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی اور اس آیت کا ہر مہینے کے تین روزوں اور صوم یوم عاشوراء کی فرضیت سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے حقیقت یہ ہے اور علامہ مرحوم نے فرمایا ہے کہ اس آیت کا رمضان کے روزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح کے برعکس استدلال کی مثالیں کم ملیں گی۔

میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا تھا وہ یہی تھا کہ علامہ انور شاہ کشمیری رح نے حضرت معاذؓ کی حدیث سے جو استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اور یہ کہ رمضان کے روزے یٰایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام ہی کی آیت سے فرض کیے گئے تھے۔ ان آیتوں سے متعلق دوسرے مسائل سے تعرض کرنا اس وقت میرا مقصود نہیں ہے البتہ آخر میں اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ نے اپنے قول کی تائید میں جو چند دوسری باتیں لکھی ہیں وہ بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں لیکن ان پر تفصیل سے بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے کتب علی الذین من قبلکم کی تشبیہ کو اپنے قول کی تائید میں اس بنا پر پیش کیا ہے کہ اگلی امتوں پر رمضان کے روزے فرض نہیں کیے گئے تھے۔ یہ روزے امت محمدیہ کی خصوصیت ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ سلف سے ایک مضبوط قول یہ بھی چلا آ رہا ہے کہ مِن قبلکم سے مراد اہل کتاب ہیں اور ان پر رمضان کے روزے فرض کیے گئے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے بھی اپنے حاشیۂ قرآن میں یہ قول نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"جاننا چاہیے کہ یہود و نصاریٰ پر بھی رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنی خواہشات کے موافق ان میں اپنی رائے سے تغیر و تبدل کیا۔"

Monthly 'ZINDGI' Rampur, Nov. 1968, Regd. No. L--688

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اقامت دین کا داعی

ماہنامہ

رامپور

فی پرچہ ۸۰ پیسے

جلد :- ۴۱ رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۸ء شمارہ :- ۶

اس دائرے میں ○ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو ان شاء اللہ پرچہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر
ماہنامہ زندگی رام پور یوپی

مالک :- جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر :- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر :- احمد حسن۔ مطبع :- روہیلا پرنٹنگ پریس۔ عنامی روڈ
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رام پور یوپی

اشارات

سید احمد قادری

الکشن کے قریب کا زمانہ شمالی ہند میں اس پہلو سے مسلمانوں کے لیے بہت خوش آیند ہوتا ہے کہ تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں ان کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کرتی ہیں۔ ان کی مظلومیت اور ان کے حقوق و مسائل کے ساتھ زبانی ہمدردی کی مقدار بھی کچھ بڑھ جاتی ہے اور تعداد بھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی نگاہ کرم ان کی طرف پھر جاتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زبان کرم ان کی طرف بھی گھومنے لگتی ہے ان کو ملک کے ساتھ وفاداری کے زوردار سرٹیفکٹ ملتے ہیں، ان کو برابر کا مساوی حقوق رکھنے والا شہری کہا جاتا ہے۔ جارحانہ حملوں میں ان کو جانی و مالی جو نقصانات پہنچے ہیں ان کا اعتراف کیا جاتا ہے، ان کو مظلوم قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے حقوق ادا کرنے میں جو کوتاہیاں کی گئی ہیں ان کا اقرار کیا جاتا ہے غرض ہر پہلو سے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے اور جب الکشن گزر جاتا ہے، حکومتیں بن جاتی ہیں تو پرنالہ وہیں گرتا ہے جہاں پہلے گرا کرتا تھا۔ بیس بائیس سال سے مسلمان اسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم　　نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی زندگی میں کانگرس اس ملک میں کوس لمن الملک بجاتی رہی۔ اگرچہ ان کی زندگی ہی میں ان کے ساتھی ان سے ٹوٹ ٹوٹ کر نئی پارٹیاں بناتے رہے لیکن کسی کے لیے ان کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، ان کی ذی قامت شخصیت اور بین الاقوامی شہرت سب پر چھائی رہی، ان سے الگ ہونے والا ہر لیڈر ان کے مقابلے میں قد و قامت کے لحاظ سے بونا اور بین الاقوامی شہرت کے اعتبار سے صفر تھا۔

اس کے علاوہ ان میں سے کسی کے پاس ملک کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے نہ مثبت پروگرام تھا نہ خلوص و ایثار بلکہ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ جو مقام پنڈت نہرو کو حاصل ہے وہ اس کو مل جائے۔ ہر ایک نے بنیادی طور پر اپنے لیے راستہ وہی منتخب کیا جو کانگریس کا تھا۔ فرق یہ تھا کہ کانگریس کی کار پکی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور ان کا چھکڑا ادھر ادھر کی کچی پگ ڈنڈی پر لاحاصل تعاقب میں بے دم ہو رہا تھا۔ وہی سیکولرزم اور نام نہاد سوشلزم جس کی امامت پنڈت نہرو کو حاصل تھی، پیچھے سے یہ بھی اسی کی ہاو ہو مچار ہے تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا ان کے نزدیک یہی سیکولر پارٹیاں بچہ شتر کی حیثیت رکھتی تھیں اور ظاہر ہے کہ وہ شتر کو چھوڑ کر بچہ شتر کو اپنے ووٹ کیوں دیتے۔ ان کے زمانے میں کمیونسٹ پارٹی بھی اپنا کوئی خاص اثر پیدا نہیں کرسکی اس لیے کہ پنڈت نہرو کا یارانہ روس سے تو تھا ہی۔ ۱۹۶۱ء تک چین سے بھی قائم رہا۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے بھارت پر حملہ کر دیا تو کمیونسٹوں کے لیے فضا بہت ناہموار ہو گئی اور اب بھی کچھ زیادہ ہموار نہیں ہوسکی ہے۔

پنڈت نہرو کے وقت میں جس سیاسی پارٹی نے اس ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کیں وہ جن سنگھ ہے۔ یہ پارٹی آر۔ ایس۔ ایس کا سیاسی بازو اور گرو گول والکر کے افکار و نظریات کی نمایندہ ہے، ان کے افکار کا اگر ایک جملے میں تعارف کرایا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ گرو جی کے افکار گاندھی جی کے افکار کی عین ضد ہیں ان افکار کی کش کش اتنی بڑھی کہ گاندھی جی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد گرو جی کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ پورے ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص نہیں تھا جو ان افکار کے سامنے گاندھی جی کی طرح کھڑا ہوسکتا۔ گرو جی کے افکار کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ بھارت کو مسلمانوں کے لیے اسپین بنا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مسلمان یا تو اپنا دین و مذہب ترک کرکے ہندوؤں میں ضم ہو جائیں یا پھر انہیں قتل کرکے، لوٹ کر اور پورے ملک میں ان کے خلاف فضا تیار کرکے انہیں اتنا کچلا جائے کہ وہ آج سے پچاس سال پہلے کے شودروں کی سطح تک پہنچ جائیں۔ اسی کے ساتھ ان کے خیال کا مخفی جزیہ بھی ہے کہ بھارت پر اونچی ذات کے ہندوؤں کی ڈکٹیٹرشپ قائم کر دی جائے۔ آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ دونوں مل کر اس منصوبے کو نافذ کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں پر جارحانہ حملے اسی منصوبے کا جز ہیں۔ پنڈت نہرو نے گرو جی سے دوستی کا ہاتھ تو نہیں ملایا لیکن ان افکار کو پھیلنے سے روک بھی نہ سکے۔ یہاں تک کہ یہ زہر شمالی ہند کے تمام حکومتی محکموں میں پھیل گیا اور خود کانگریسی لیڈروں کی

بہت ... دل سے ان افکار کی ہمنوا اور گروجی کی ہمدرد بن گئی ــــــ مسلمان مختلف اسباب کی بنا پر ــــ جن میں کے ایک سبب کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ــ کانگریس ہی کو ووٹ دے کر اس کی مسلسل کامیابی میں اہم رول انجام دیتے رہے ۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور چینی ہندی بھائی بھائی کا نعرہ چینی توپوں کی گھن گرج میں گم ہو گیا ۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ہندوستانی فوج چینیوں کا جم کر مقابلہ بھی نہ کر سکی تو اس حادثہ فاجعہ کی وجہ سے پنڈت نہرو کی شخصیت و مقبولیت اور ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ کو سخت دھچکا لگا ۔ اس کے علاوہ جبل پور، جمشید پور، راؤرکیلا اور کلکتہ میں مسلمانوں کے قتل عام نے انہیں بھی پنڈت نہرو کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا لیکن ابھی ملک کے چوتھے عام انتخابات بہت دور تھے کہ پنڈت نہرو اس جہانِ گزراں سے گزر گئے اور کانگریسی حکمرانی کا ایک باب بند ہو گیا ۔

آنجہانی شری لال بہادر شاستری کا عہد حکومت اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن آر۔ ایس۔ ایس اور جن سنگھ کے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا اس لیے کہ پنڈت نہرو کے زمانے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ انھوں نے پوری کر دی جیسا کہ اوپر اشارہ گزر اکسر یہ رہ گئی تھی کہ پنڈت نہرو نے گول والکر سے دوستی کا مصافحہ نہیں کیا تھا ۔ شری لال بہادر شاستری نے گروجی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر یہ کسر پوری کر دی ۔ اس کا نتیجہ ۶۷ کے عام انتخابات میں وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا ۔ ایک طرف جن سنگھ کا زور تھا اور دوسری طرف بہت کم مسلمانوں نے کانگریس کو ووٹ دیے ۔ اس لیے چوتھے الکشن میں وہ اندازے سے بھی زیادہ بری شکست سے دوچار ہوئی لیکن ابھی اس کی زندگی کی رسی کچھ اور دراز تھی اس لیے مرکز میں اس کو اکثریت حاصل ہو گئی اور پھر صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتخاب نے اس ناؤ کو ڈوبنے سے بچا لیا ۔ ناؤ بھی بچ گئی اور اس کی سیکولرزم کو بھی ایک بڑی سند مل گئی ۔ اس کی خوش قسمتی سے وہ نائب صدر کے عہدہ پر موجود تھے اور پہلے کی نظیر بھی موجود تھی اس لیے ایک مسلمان کو جمہوریہ ہند کی صدارت تک پہنچا دینے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہ آئی ہر کانگرسی نے سمجھا ہوگا کہ اس نازک وقت میں ایک مسلمان ہی سے "سمعنا و اطعنا" کی توقع کی جا سکتی ہے اور صدر جمہوریہ ہند نے یہ ثابت کر دیا کہ واقعی وہ اس کے اہل تھے ۔ رانچی اور ہٹیا کے صنعتی قصبے کا بہیمانہ قتل عام جو بعض پہلوؤں سے جمشید پور کے فساد سے بھی زیادہ ہولناک تھا مسلمانوں کو اس عہد صدارت کے "یادگار تحفہ" کے طور پر ملا ۔ رانچی کا فساد اگست ۶۷ء میں ہوا تھا ۔ اس کے تقریباً ایک

سال بعد کشمیر میں بڑے دھوم دھڑکے سے قومی یک جہتی کونسل کی سہ روزہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مسلمانوں کی کسی جماعت کا کوئی نمائندہ شریک نہیں کیا گیا لیکن جن سنگھ کے صدر بڑے ناز نخرے کے ساتھ اس میں شریک ہوئے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا حاصل کیا نکلے گا۔ اگست ۹۶۸ کے اشارات میں میں نے لکھا تھا :۔

> ان سطور کی تحریر تک کانفرنس کی سفارشات پر جو کارروائیاں ہو چکی ہیں ان سب پر اظہار خیال نہ مقصود ہے نہ مفید ہے۔ حکومت اور حکومتی عملہ کے عمل کی زبان خود توضیح کر دیگی، ان کے عمل کی زبان جو کچھ توضیح کر رہی ہے وہ اب ہمارے سامنے ہے ۔

جن ریاستوں میں کانگرس کو شکست ہوئی تھی ان میں غیر کانگرسی مخلوط حکومتیں بنی تھیں۔ سمجھنے والوں نے اسی وقت کہا تھا۔ کہ یہ حکومتیں کامیاب نہیں ہو سکتیں بلکہ زیادہ دنوں تک اپنے وجود کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ متضاد افکار و نظریات رکھنے والے شرکا کے ساجھے کی یہ ہانڈی چوراہے پر پھوٹے گی اور واقعی یکے بعد دیگرے وہ پھوٹتی چلی گئی اور صدر راج قائم ہوتا چلا گیا۔ ان مخلوط حکومتوں میں جو پارٹیاں شریک تھیں ان کے درمیان قدر مشترک کانگرس دشمنی کا جذبہ تھا اسی جذبے کے تحت چند متفقہ پروگرام تصنیف کیے گئے اور بھانت بھانت کی پارٹیاں راج گدی پر پہنچ گئیں۔ یہ منفی جذبہ کب تک انہیں جوڑے رکھتا وہ جذبہ اپنی خدمت انجام دے کر جلد ہی رخصت ہو گیا اور اقتدار و مفادات کی جنگ شروع ہو گئی ریاستوں میں تعمیری کام کی فرصت کہاں تھی اب وزیروں اور پارٹیوں کے لیڈروں کو ان حکومتوں کے وجود ہی کو برقرار رکھنے کی تدابیر سے فرصت نہ تھی۔ اس کے لیے ہر بے اصولی کو اصول پسندی کا رنگ دیا گیا اس کے باوجود ان حکومتوں کا وجود سلامت نہ رہ سکا۔

فروری ۷۲ء میں کئی ریاستوں کے اندر درمیانی مدت کے انتخابات ہونے والے ہیں۔ ریاست اتر پردیش میں بھی آنے والے انتخابات کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں اور حسب معمول سیاسی پارٹیوں کی توجہات مسلمانوں کی طرف بھی مبذول ہونے لگی ہیں۔ دوسری پارٹیوں کی طرف سے غیر مسلم لیڈروں نے ہمدردی کا اظہار شروع کیا ہے لیکن کانگرس کی طرف سے حسب معمول مسلمانوں کا نیشنلسٹ طبقہ ہراول دستے کے طور پر میدان میں پہلے اتر آیا ہے۔ ہمیں کسی پارٹی کی حمایت یا مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہمیں اس سے کوئی بحث

ہے کہ مسلمان کس پارٹی کو ووٹ دیں گے اور کس کو نہیں دیں گے۔

ہم خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے نیشنلسٹ افراد، عام مسلمانوں کو ہندوستان کی مختلف سیکولر سیاسی پارٹیوں اور بالخصوص کانگریس میں شرکت کی جو دعوت دیتے ہیں اس پر انہیں نظر ثانی کرنا چاہیے۔ ان کی یہ دعوت و تبلیغ دینی نقطۂ نظر سے تو غلط ہے ہی، تجرباتی لحاظ سے بھی ایک سعی لاحاصل ہے مسلمان اس عقیدے پر ایمان نہیں لاسکتے جس کی طرف یہ لوگ انہیں بلاتے ہیں۔ اس دعوت و تبلیغ سے انہیں کچھ ذاتی فوائد ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن اس حقیر مقصد کے لیے اس امت میں جس کے وہ خود ایک جزبنے ہوئے ہیں۔ ذہنی انتشار پیدا کرنے کی کوشش ایک غلط اور ناروا کوشش ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو جو دعوت دیتے ہیں وہ تین بڑے نکات پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے مسائل بھی جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم ہی کے تحت حل ہوسکتے ہیں۔ کوئی دوسرا عقیدہ وعمل ان کے مسائل حل نہیں کرسکتا۔ دوسرا یہ کہ ان کے مسائل کسی ایسی سیاسی پارٹی میں شرکت سے حل ہوسکتے ہیں جو ان اقانیم ثلاثہ پر یقین رکھتی ہو اور ان نیشنلسٹوں میں اکثر کے نزدیک ایسی پارٹی صرف کانگریس ہے اور تیسرا نکتہ یہ کہ مسلمانوں کو اپنی کسی علیحدہ تنظیم کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ رہا دین و مذہب تو وہ پرائیوٹ معاملہ ہے اس کو سیاست، اجتماعی مسائل اور حکومت کے نظم ونسق میں دخل کرنا بالکل غلط ہے۔

ان میں سے بعض افراد کے سیکولرزم پر اعتقاد کا پارہ اتنا چڑھا ہوا ہے کہ وہ مذاہب تک کو سیکولر تحریکیں سمجھتے اور کہتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ہمارے ایک مشہور مسلمان نیشنلسٹ لیڈر کی ایک ریڈیائی تقریر "سیکولرزم — ایک ضرورت — ایک اعتقاد — کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے مذاہب کی بزعم خویش مجرد دعوی کی شکل میں ایک تشریح کی اور اس کے بعد ارشاد ہوا:-

"مذاہب کی تعلیمات پر اگر اس پہلو سے سوچا جائے تو ہم انہیں سیکولر تحریکیں بھی کہہ سکتے ہیں"۔

اور ان کی ریڈیائی تقریر ان جملوں پر ختم ہوئی تھی:-

"آج سیکولرزم ہماری ایک ضرورت بھی ہے اور ہمارا اعتقاد بھی اور سیکولرزم میں ہی ہمارے دیس کی ترقی کا اصلی راز پوشیدہ ہے"۔

اور ان میں سے بعض اور زیادہ ترقی پسند افراد تو نام لے کر دین اسلام کو بھی سیکولر قرار دیتے ہیں اور

ان کے نزدیک دنیا میں سب سے پہلی سیکولر حکومت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائی تھی۔ (اللہ کی پناہ ان خرافات سے)

ان افراد میں سے کچھ چالاک لوگ دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے اور کچھ کم فہم لوگ سادہ لوحی کی بنا پر جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے بعض عملی مظاہر کی بھولی بھالی تشریح کرکے لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ بس یہی ان کی حقیقت ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ سیکولرزم لادینیت کا نام نہیں ہے بلکہ مذہبی ناطرف داری کو سیکولرزم کہتے ہیں یعنی مذہب کی بنیاد پر کسی کی طرف داری نہ کی جائے۔ مذہب کی بنا پر آبادی کے مختلف عناصر میں کوئی تفریق اور امتیاز نہ برتا جائے۔ یہ کہتے ہیں کہ جمہوریت ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کے تحت ہر شخص جو عقیدہ چاہے رکھ سکتا بلکہ اس کی تبلیغ بھی کر سکتا ہے یہ کہتے ہیں کہ سوشلزم ایک ایسے نظام کا نام ہے جس میں امیر لوگ غریبوں کا خون نہ چوس سکیں اور جس کے تحت ملک کے ہر شہری کو یکساں طور پر اس کی بنیادی ضروریات مہیا کی جائیں اور سب کے لیے ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ اس کے بعد یہ مسلمانوں سے کہتے ہیں بتاؤ ان میں سے تمہیں کس چیز پر اعتراض ہے اور کیا اعتراض ہے؟

اس سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ ان تشریحات کا بھی بھارت کے کس گوشے میں وجود ہے؟ ہم ان کے جواب میں کہیں گے کہ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے ان تینوں کی جو تشریح کی ہے وہ ان کی حقیقت کا بیان نہیں ہے۔ اس میں ان کی جڑوں کو چھپا کر ان کی بعض خوبصورت پتیوں کو دکھایا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی نظام بھی ایسا نہیں ہے جو ازسرتاپا شر ہی شر ہو سب میں کچھ نہ کچھ خیر کے پہلو بھی ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آمریت اور سرمایہ داری جن کا نام سننا بھی آپ کو گوارا نہیں وہ بھی تمام تر برائیوں ہی کا مجموعہ نہیں ہیں۔ سیکولرزم، مغربی جمہوریت اور سوشلزم کی مشترکہ حقیقت یہ ہے کہ دین و شریعت کو سیاست و حکومت اور زندگی کے اجتماعی مسائل سے بالکل خارج کر دیا جائے اور اس کو صرف مسجدوں مندروں اور گرجاؤں میں بند کر دیا جائے۔ مذہب ہر شخص کا بالکل پرائیوٹ معاملہ ہو مثال کے طور پر کوئی مسلمان جب تک مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو وہ مسلمان رہے اور جب وہ مسجد سے باہر نکلے تو خالص اور صرف ہندوستانی ہو یا کم سے کم یہ کہ وہ پہلے ہندوستانی ہو اس کے بعد کچھ اور۔ مسجد میں داخل ہو تو اسلام کا لبادہ اوڑھ لے اور باہر نکلے تو وہ لبادہ وہیں اتار کر باہر نکلے۔ ہم اور کسی مذہب کے بارے میں کچھ نہیں کہتے لیکن اسلام کے بارے میں پورے

شعور کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ سیکولرزم اور جمہوریت کی یہ حقیقت حقیقت اسلام کی عین ضد ہے۔ اس لیے مسلمان جب تک وہ واقعی مسلمان ہیں۔ اس حقیقت پر ایمان نہیں لا سکتے۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی انہیں اس پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی تھی لیکن وہ ایمان نہیں لائے اور ملک تقسیم ہوگیا۔ افسوس ہے کہ تقسیم ملک کے بعد بھی نیشنلسٹ حضرات نے اپنی دعوت پر نظر ثانی نہیں کی حالانکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان لٹ رہے ہیں پٹ رہے ہیں، کٹ رہے ہیں لیکن وہ اسلام کو صرف مسجدوں میں بند کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اس لیے کہ وہ قرآن کے کسی نئے اڈیشن پر یقین نہیں رکھتے ان کے نزدیک قرآن وہی ہے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور قیامت تک وہی رہے گا۔ اس کے الفاظ بدلنے کا کیا سوال معنوی تحریف کرنے والوں کی تحریف بھی زیادہ دیر تک میدان میں ٹک نہیں سکتی۔ باقی رہی بات جن سنگھ، آر۔ ایس ایس اور ہندو مہاسبھا کے جارحانہ حملوں کی تو اس کے بارے میں بھی ہم یقین رکھتے ہیں کہ ان کی جارحیت سے مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان نہ کانگریس بچا سکتی ہے، نہ کوئی دوسری پارٹی۔ انہیں اس سے صرف اسلامی اجتماعیت اور اللہ کی نصرت بچا سکتی ہے اور کوئی نہیں۔

ہم ان صفحات میں بار بار یہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت کا مستحق بننے کی شرطیں کیا ہیں اور مسلمانوں پر بحیثیت امت مسلمہ کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان سطور میں ہم مسلمان قوم پرستوں کی خدمت میں عاجزانہ عرض گزار ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس چیز کی دعوت نہ دیں جس کو ان کے ایمان اور ان کے اجتماعی ضمیر نے کبھی قبول نہیں کیا ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ قبول کرے گا بلکہ ان کو خود اپنی تگ و دو اور سعی و عمل پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

اوتار اور رسالت

(مولانا سید جلال الدین عمری)

ہندو مذہب میں رسالت کا تصور تو نہیں ہے البتہ اوتار کا تصور ہے۔ اسی کو بالعموم عقیدۂ رسالت سے قریب سمجھا جاتا ہے۔ اوتار سنسکرت کا لفظ ہے۔ لغت میں اس کے معنی ہیں اوپر سے نیچے اترنا۔ لیکن جب اس کو ایک مذہبی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی ہندو دیوتا کا صاف اور واضح شکل و صورت میں زمین پر اترنا۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ تصور اپنی حقیقت کے لحاظ سے عیسائیت کے عقیدۂ تجسیم (INCARNATION) سے قریب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب اس عالم میں کوئی طبعی یا اخلاقی بے چینی پیدا ہوتی ہے یا عدل و انصاف اور قانون ختم ہو جاتا ہے یا خدا کی مخلوق پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے اور اسے نقصان پہنچنے لگتا ہے تو اوتار کا ظہور ہوتا ہے اور وہ ان خرابیوں کو دور کرتا ہے۔

ہندو مذہب کی رو سے چھوٹے بڑے بے شمار اوتار پیدا ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر گستاولی بان کے بقول "ان میں بڑے بڑے بہادر اور دیوا ور معمولی انسان اور حیوانات تک شامل ہیں"۔ اوتاروں کی اس کثیر تعداد میں دس اوتار سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۔ مچھلی۔ ۲۔ کچھوا۔ ۳۔ سور۔ ۴۔ شیر نر۔ ۵۔ بونا یا بالشتیا۔ ۶۔ پار اسورام۔ ۷۔ رام چندر جی۔ ۸۔ کرشن جی۔ ۹۔ بدھ اور ۱۰۔ کلکی اوتار۔ لیکن یہ سب اوتار ہر دور میں مسلّم نہیں رہے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کی حیثیت مختلف فیہ رہی ہے اور یہ تعداد بھی گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ مہا بھارت میں دس اوتار کا ذکر تو ہے لیکن ان کی ترتیب وہ نہیں ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ اس میں بعض نئے اوتار شامل ہیں۔ بھگوت پران میں بائیس (۲۲) اوتار کا ذکر ہے اور بعض دوسری کتابوں میں چوبیس (۲۴) اوتار بیان ہوئے ہیں۔

ہندو مذہب میں اوتار کے عقیدے کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اس کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں لیکن کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی کے نزدیک یہ عقیدہ ویدک تعلیمات کے خلاف ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یجروید میں خدا کو جسم سے آزاد اور یکساں، موجود کل، طاقت مطلق اور غیر مجسم کہا گیا ہے۔" ان اقوال سے ثابت ہے کہ پرمیشور جنم نہیں لیتا۔"

اس کے برخلاف بعض لوگوں نے ویدوں ہی سے اس کے حق میں ثبوت فراہم کیے ہیں، مثلاً "اندر یعنی پرماتما اپنی مایا (کرشمہ سازی) کے ذریعے مختلف صورت اختیار کر کے وچرتا (گھومتا پھرتا) ہے۔" (رگ وید ۶-۴۷-۱۸) "پرماتما بار بار مچھلی، کچھوا وغیرہ مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔" (رگ وید ۳-۳-۷-۳-۲)

اس طرح کے بعض اور حوالے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ دعوے تو شاید صحیح نہ ہوگا کہ ویدوں میں اوتار کا ذکر نہیں ہے یا یہ کہ وہ اس کے مخالف ہیں، البتہ یہ بات صحیح ہے کہ اوتار کا تصور بعد کے پرانوں میں جتنا واضح ہوا ہے اتنی وضاحت کے ساتھ وہ ویدوں میں نہیں ملتا اور پھر جتنی اہمیت اس کو بعد میں دی گئی ویدوں میں ان کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ اسی طرح بعض شخصیتوں کو ویدوں نے اگر کسی قسم کی اہمیت دی تھی تو بعد میں ان کو اوتار کا درجہ دے دیا گیا۔

ویدوں کے بعد کی کتابوں میں رامائن کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ بالمیک جی کی تصنیف ہے جو رام چندر جی کے ہم عصر تھے۔ یہ سنسکرت میں ہے۔ اکبر کے عہد میں تلسی داس نے اس کو ہندی میں منتقل کیا۔ لیکن اس میں اس قدر حذف و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کی کہ وہ بالمیکی رامائن سے الگ ایک نئی کتاب بن گئی۔ آج کل یہی کتاب زیادہ تر پڑھی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بالمیک جی نے رام چندر جی کو محض ایک نیک صفت اور مضبوط عزم و ارادے والے انسان کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ چنانچہ اسی حیثیت سے وہ ایک عرصہ دراز تک متعارف رہے۔ مہابھارت جو رامائن کے کئی سو سال بعد لکھی گئی، اس میں بھی رام کو کہیں بھگوان یا اس کا اوتار نہیں کہا گیا ہے۔ اس پر بھی صدیاں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ تلسی داس نے رام کو بھگوان کا روپ دیا اور ان کو اوتار قرار دیا۔

بعض محققین نے جنہوں نے بالمیکی رامائن کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تلسی داس ہی نے نہیں بلکہ بالمیک جی نے بھی رام کو اوتار ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ چندر شیکھر آزاد کہتے ہیں:-

اس امر میں شکل ہی سے کسی شبہہ کی گنجائش ہے کہ والمیکی کا مقصد یہی ہے کہ وہ رام کو اوتاری حیثیت سے پیش کریں کتاب کے آغاز ہی میں ہم اس واقعہ کا ذکر پاتے ہیں کہ دیوتاؤں نے مجتمع ہو کر ہری مہا وشنو سے درخواست کی کہ وہ راکشش راون کو ہلاک کرنے کے لیے دسرتھ کے بیٹے یا بیٹوں کے روپ میں اوتار لینے کا فیصلہ کریں ...... راون کے مارے جانے اور جنگ کے جیتے جانے کے بعد تمام دیوتا برہما کی قیادت میں بر سر موقع آ موجود ہوتے ہیں تاکہ اس فتح پر دھنباد دے سکیں۔ وہ صاف و صریح الفاظ میں کہتے ہیں کہ رام نارائن ہیں جو خبیث راون سے دنیا کو نجات دلانے کے لیے دنیا میں نازل ہوئے ؟"

رامائن کے بعد کی تصنیف مہابھارت ہے۔ اس میں اوتار کا تصور اتنے صاف اور واضح الفاظ میں موجود ہے کہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان رزمیہ نظموں کے بعد پرانوں کا دور آتا ہے اور وہ اوتاروں کی داستانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

اوتار کا عقیدہ ہندو مذہب میں جس طرح بتدریج اہمیت اختیار کرتا گیا اس کا ایک [illegible] یہ بھی ہے کہ زیادہ تر اوتاروں کا تعلق وشنو سے ہے اور وشنو کی اہمیت اس عقیدے کے سا[illegible] بڑھی ہے ہندو مذہب میں اصلاً تین بڑی طاقتیں ہیں۔ برہما، شیوا اور وشنو۔ برہما عالم کا خالق، وشنو اس کو باقی رکھنے والا اور شیو اس کو برباد کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ان ہی تینوں کے مجموعے سے یہاں خدا کا تصور مکمل ہوتا ہے۔ برہما کو ان سب میں زیادہ عظمت حاصل ہے لیکن بالعموم اس کی پرستش نہیں ہوتی۔ شیو کی پرستش سب سے قدیم بھی ہے اور سب سے زیادہ کی بھی جاتی ہے۔ بلکہ اس تثلیث میں سب سے بڑا حصہ اسی کا ہے۔ وشنو کی پرستش بہت بعد میں شروع ہوئی۔ ویدوں میں وشنو کا ذکر تو ہے لیکن اس کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو دوسرے دیوتاؤں کو حاصل ہے حتیٰ کہ ویدوں میں اس کی تعریف میں مستقل نغمے بھی نہیں ہیں۔ رگ وید میں اس کا ذکر اندر کے ساتھ آیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس سے بھی کم تر حیثیت کا مالک ہے اور وہ اپنی طاقت اس سے حاصل کر رہا ہے۔ البتہ رزمیہ شاعری کے دور میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ لیکن اس میں بھی فرق ہے۔ رامائن میں اس کو جو مخصوص حیثیت حاصل ہے وہ مہابھارت میں نظر نہیں آتی۔ مہابھارت میں ایک طرف وہ سب سے اونچی طاقت کے ساتھ نظر آتا ہے اور کہیں شیو کی حمد کرتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان سب کے

باوجود یہ حقیقت ہے کہ وشنو کی پرستش کرنے والوں کے نزدیک وہ سب سے بڑا خدا ہے اور ساری عالم کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

جب کوئی عقیدہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے تو ایک زمانے کے بعد بالعموم وہ اپنی ابتدائی حالت میں باقی نہیں رہتا بلکہ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ اس لیے آج خود ہندو مذہب کے ماننے والے بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ اوتار کی اصل کیا تھی اور پھر بعد میں کیا سے کیا ہو گئی۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اوتار کا عقیدہ موجودہ حالت میں ہندو مذہب کے لیے ایک نیا عقیدہ ہے یا کم از کم وہ آمیز اور خالص شکل میں نہیں ہے۔

دنیا کے مختلف مذاہب میں ایک خاص خرابی دیکھی گئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی شخصیت سے جب کوئی بڑا کارنامہ انجام پاتا ہے اور عوام کو اس سے عقیدت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کو عام انسانوں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کو خدائی کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں اس طرح کی عقیدت کا جذبہ بہت شدید رہا ہے۔ اس لیے یہ قیاس شاید غلط نہ ہو کہ جن شخصیتوں میں بعض غیر معمولی خصوصیات تھیں، پہلے تو ان کی طرف خدائی اوصاف منسوب کیے گئے اور بعد میں ان کو خدا یا اس کا اوتار قرار دے دیا گیا۔

اوتار کا تصور اس وقت جس شکل میں موجود ہے گیتا اس کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ یہاں ہم اسی سے یہ تصور پیش کرتے ہیں۔ شری کرشن جی، ارجن سے کہتے ہیں:۔

"...... میں کل عالم کی پیدائش اور فنا کا مخزن ہوں۔ اے ارجن مجھ سے برتر کوئی شے نہیں ہے" (۷: ۶، ۷) "میں اس عالم کا باپ، ماں، محافظ اور بزرگ ہوں، جاننے کے قابل اور متبرک اونکار ہوں اور رگ وید، سام وید اور یجر وید ہوں۔ میں منزل مقصود، پروردگار، مالک، شاہد، قیام گاہ، جائے پناہ، مربی، پیدائش و فنا کا قیام، مخزن اور غیر فانی تخم ہوں" (۹: ۱۷، ۱۸)

کرشن جی نے نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو خدا کہا ہے بلکہ اسی حیثیت سے بار بار اپنی عبادت اور پرستش کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ "ثابت قدم انسان میری حمد و ثنا کرتے ہوئے اور صدق دل سے میری بندگی کرتے ہوئے میری پرستش میں ہمیشہ مشغول رہتے ہیں" (۹: ۱۴) "میں سب یگوں کا قبول کرنے والا ہوں اور معبود ہوں۔ چونکہ وہ میری اس حقیقت کو نہیں جانتے ان کا تنزل ہوتا ہے" (۹: ۲۴)

"جو صدق ارادت سے پتہ، پھول، پھل، یا جل مجھے پیش کرتا ہے اس کے صدق ارادت سے دی ہوئی شے کو میں بخوشی قبول کرتا ہوں۔ اے ارجن تو جو کچھ کرتا ہے، جو کچھ کھاتا ہے، جو کچھ ہومتا ہے، جو کچھ خیرات کے طور پر دیتا ہے اور جو ریاضت کرتا ہے اسے مجھ سے منسوب کر۔" (۹: ۲۶، ۲۷) "مجھ میں دل کو لگا، میری پرستش کر، میرے واسطے یگ کر، میری بندگی کر، تو اس طریقے سے اپنی ہستی کو میرے حوالہ کرکے مجھ میں وصل ہوگا۔" (۹: ۳۴)

ارجن نے جس طرح کرشن جی کی خدائی کا اعتراف کیا ہے اس سے یہ حقیقت اور کھلتی ہے۔ کہتے ہیں:-

"اے کرشن مہاراج یہ بجا ہے کہ ایک عالم آپ کی توصیف بیان کرکے خوشی اور دلبستگی حاصل کرتا ہے اور بدافعال آپ کے خوف کے مارے ہر طرف بھاگتے ہیں اور کاملوں کی جماعتیں آپ کو سجدہ کرتی ہیں۔ اے بزرگ منش وہ لوگ آپ کی اس ذات واجب التعظیم کو جو عالم کی صانع کی بھی علت غائی ہے سجدہ کیوں نہ کریں۔ اے بے شمار دیوتاؤں کے حاکم اور عالم کی پناہ آپ لازوال ہیں اور حق و باطل سے برتر ہیں۔ اے محیط عالم آپ صفات کا مبدا ہیں اور ذات قدیم ہیں اور اس عالم کے اصلی مخزن ہیں آپ ناظر، منظور اور اعلیٰ مقام ہیں اور عالم میں محیط ہیں۔ وایو، یم، اگنی، ورون، چندرما، پرجاپتی اور ہر ینہ گربھ آپ ہیں۔ میں آپ کو ہزار بار بلکہ بے شمار بار نمسکار کرتا ہوں۔ اے محیط کل آپ کو روبرو اور پشت اور سب طرف سے نمسکار ہے۔ آپ بے انتہا قوت اور بے اندازہ جلال رکھتے ہیں۔ آپ کل میں محیط ہیں پس کل ہیں۔" (۱۱۔ ۳۶۔ ۴۰)

ارجن کو جب تک یہ بات نہیں معلوم تھی کہ کرشن جی اوتار ہیں انھوں نے ان کو اپنا ہمسر سمجھا۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ اپنی اس غلطی کی وہ ان الفاظ میں معافی چاہتے ہیں۔

"اپنا دوست سمجھ کر اور آپ کی اس عظمت کو نہ جان کر جو میں نے عالم بے خبری میں یا دوستانہ طور پر آپ کو کرشن، یادو، دوست کہہ کر اکثر پکارا ہے اور از راہ مذاق کھیلتے، سوتے، بیٹھے اور کھاتے وقت خلوت اور جلوت میں آپ کی گستاخی کی ہے۔ اے عالی وقار اس کی معافی میں آپ کی ذات برتر از قیاس سے مانگتا ہوں۔ آپ اس متحرک اور ساکن موجودات کے باپ اور واجب التعظیم بڑے استاد ہیں۔ اے لاثانی قدرت رکھنے والے تینوں عالم میں کوئی آپ کے برابر بھی نہیں ہے۔ بڑا تو کون ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں آپ کی ذات باصفات سے عاجزی اور تعظیم کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ جیسے باپ بیٹے کا، دوست دوست کا، شوہر بیوی کا

تصور صاف کرتا ہے آپ میرا تصور صاف کریں۔" (۱۱:۳۱۔۳۴)

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ وشنو کوئی معمولی دیوتا نہیں بلکہ کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے، وہی اس عالم کا خالق، مالک، معبود اور حاکم ہے۔ اس سے برتر کوئی چیز نہیں ہے۔ کرشن جی کی شکل میں اسی کا اوتار ہوا ہے۔ اب ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا ہوگا جو خدا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اب ہم اس پورے تصور کا عقیدۂ رسالت سے موازنہ کریں گے۔ اس کے لیے ہمیں چند پہلوؤں سے غور کرنا ہوگا۔

(۱) اوتار کے تصور اور عقیدۂ رسالت میں کیا فرق ہے؟

(۲) اوتار کیوں آتے ہیں؟

(۳) کیا خدائے تعالیٰ اوتار لے سکتا ہے؟

(۱) پہلے اس سوال کو لیجیے کہ اوتار کا تصور عقیدۂ رسالت سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اوتار کا تصور ایک نہیں کئی پہلوؤں سے عقیدۂ رسالت سے متصادم ہے۔

(ا) اوتار حقیقت میں خدا ہوتا ہے اور رسول خدا کا بندہ۔

(ب) رسول صرف انسان ہوتا ہے لیکن اوتار خدا کی دوسری مخلوقات کی شکل میں بھی نمودار ہو سکتے ہیں۔

(ج) رسول انسانوں کی ہدایت کے لیے آتے ہیں اور اوتار اس کے علاوہ اور مقاصد سے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان وجوہ سے ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تصورات ہیں۔ ان کو کسی طرح ایک نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اوتار کے بہت سے مقاصد بیان کیے جاتے ہیں۔ ان سب پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ جن پہلوؤں سے اوتار کے تصور کو تصور رسالت سے قریب کہا جاتا ہے۔ یہاں ہم ان پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اس لیے اوتار لیتا ہے تاکہ انسانوں کو اپنے علم سکھائے چنانچہ شری کرشن جی کہتے ہیں:۔

"اے ارجن جو علم اس طرح پر زمانہ قدیم سے چلا آیا تھا اس کو راج رشی جانتے تھے، وہ علم اب زمانہ دراز سے محجوب ہو گیا ہے، وہی قدیم علم میں تجھے اب بتاتا ہوں۔ تو میرا معتقد اور رفیق ہے اور یہ اعلیٰ اسرار ہیں۔" (گیتا۔ ۴: ۲،۳)

اس سے معلوم ہوا کہ جب کبھی خدائے تعالےٰ کی تعلیمات غائب ہو جاتی ہیں تو ان کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے وہ اوتار لیتا ہے۔ خدا کے پیغمبر بھی اس کے دین کو پیش کرنے اور اس کی تعلیمات کو زندہ کرنے کے لیے آتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو انسان کہتے ہیں خدا نہیں کہتے۔ البتہ ان کا دعوےٰ یہ ہوتا ہے کہ خدائے تعالےٰ فرشتے کے ذریعے ان پر اپنا دین نازل کرتا ہے۔ اب دیکھیے کہ ان میں سے کون سی بات قابل فہم اور عقل سے قریب ہے۔

اوتار کا عقیدہ قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اوتار کو ہم دیکھتے تو ہیں ایک مخلوق کی حیثیت سے اور اپنے اس صریح مشاہدے کے خلاف اس کو خدا ماننا پڑتا ہے لیکن رسول کی رسالت کو ماننے میں کم از کم اس طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو انسان سے برتر کوئی مخلوق نہیں ثابت کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ دعویٰ بھی بہت بڑا دعوےٰ ہے کہ اس کے پاس خدا کا فرشتہ آتا ہے اور اس کی تعلیمات اس تک پہنچاتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق محض اس کے ذریعۂ علم سے ہے اور یہ ذریعۂ علم ہمارے تجربات سے اس قدر قریب ہے کہ اس کو ماننے میں کوئی زحمت نہیں پیش آتی۔

اس دنیا میں انسان بلا واسطہ اور بالواسطہ دو طریقوں سے علم حاصل کرتا ہے۔ بلا واسطہ وہ علم ہے جو اس کو اپنی عقل یا فطرت سے حاصل ہوتا ہے۔ بالواسطہ علم وہ پوری کائنات سے اور اس میں بسنے والی بے شمار مخلوقات سے حاصل کرتا ہے۔ ان ہی دو طریقوں سے اس نے زراعت، صنعت، حرفت تجارت اور بہت سے مادی علوم و فنون سے واقفیت حاصل کی اور اب تک اس میں اضافہ کر رہا ہے اور پھر ان ہی دو طریقوں سے وہ اس بات کو بھی جان سکتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ اس کو حکمت و دانائی کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اس کی قدرت اور طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور وہ سب سے برتر اور تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہے۔ یا یہ کہ محبت، ہمدردی، سچائی اور دوسروں کی خدمت اچھی صفات ہیں اور جھوٹ، مکر و فریب اور دوسروں کو نقصان پہنچانا برا ہے۔ ان دو طریقوں کے سوا اب تک اس کے سامنے کوئی ایسی صورت نہیں آئی جس میں خدا خود زمین پر آ کر اس کو تعلیم دے۔ خدا کا رسول جب یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس خدا کا فرشتہ آتا ہے اور اس کو خدا کا دین سکھاتا ہے تو یہ بات ہمارے اس تجربے کے بالکل مطابق ہے کہ ہم خدا کی مخلوقات سے خدا کے بارے میں بہت سی باتیں سیکھتے ہیں اس کے برعکس یہ دعوےٰ کہ خدا خود اپنا دین سکھانے کے لیے زمین پر آتا ہے انسان کے علم و تجربات سے

کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ وہ ایک ایسی بات سنتا ہے جو اس کی تمام معلومات اور شب و روز کے تجربات سے بالکل الگ ہے۔

اب آپ سوال کریں گے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اس کائنات میں فرشتے موجود ہیں اور وہ خدا کے رسولوں کے پاس اس کا پیغام لاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کائنات بہت وسیع ہے اور اس کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ یہاں خدا کی اتنی مخلوقات پھیلی ہوئی ہیں کہ ہم ان سب کو جاننا چاہیں تو بھی نہیں جان سکتے۔ اس لیے اگر انسانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کسی ایسی مخلوق کے وجود کا دعوے کرتی ہے جسے ہم نے نہیں دیکھا ہے تو ہمارے پاس اس کی تردید کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، ہمارے دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ آیا وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں اور ان کی باتیں قابل فہم ہیں یا نہیں؟

اوتار کا ایک مقصد نیکیوں کی حفاظت اور بروں کو سزا دینا ہے۔ شری کرشن جی کہتے ہیں:۔

"اے ارجن جب کبھی نیکی گھٹ جاتی ہے اور برائی غلبہ پاتی ہے اس وقت میں خود اختیار کرتا ہوں۔ میں نیک آدمیوں کی حفاظت کرنے اور بدکرداروں کو غارت کرنے کے واسطے اور نیکی قائم رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتا رہتا ہوں۔" (۴: ۷، ۸)

خدا کے رسول اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ بروں کو ان کی برائی کا اور نیکوں کو ان کی نیکی کا بدلہ ملنا چاہیے لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا عمل کے لیے ہے۔ یہاں کے کاموں کا بدلہ ایک اور دنیا میں ملے گا جسے وہ آخرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں بھی بعض اوقات اعمال کے تھوڑے بہت نتائج ظاہر ہوتے ہیں لیکن مکمل اور صحیح نتائج آخرت ہی میں سامنے آئیں گے۔

ان دونوں دعووں پر اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس معاملہ میں بھی رسول کا دعوے ہماری عقل اور تجربات سے قریب ہے۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ نیکوں کی حفاظت اور بروں کی ہلاکت کے لیے ہمیشہ اوتار ظاہر نہیں ہوتے۔ ورنہ ساری دنیا اس کو ایک مسلّم حقیقت کے طور پر جانتی اور اس کا انکار نہ کر پاتی۔ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ "نیک آدمیوں کی حفاظت کرنے اور بدکرداروں کو غارت کرنے کے واسطے" اوتار آتے ہیں لیکن دنیا ان سے یا تو واقف نہیں ہوتی۔ یا اگر واقف ہوتی ہے تو اعتراف نہیں کرتی۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ کسی نے اوتار ہونے کا دعوے کیا ہو۔ کسی کے دعوی کیے بغیر ہم اس کو اوتار کہیں تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ولو بالفرض

اگر ہم اس امکان کو بھی تسلیم کرلیں کہ کبھی اوتار اس طرح بھی آسکتے ہیں کہ عام انسان ان سے شناخت نہیں ہو پاتے تو کم از کم ان کے آنے کے نتائج تو ظاہر ہونے چاہییے۔ یعنی یہ کہ جب بھی نیکی گھٹ جاتی اور برائی غلبہ پاتی۔ نیک انسان اپنی نیکی کی جزا پاتے اور بدکرداروں کو ان کی بدعملی کی سزا ملتی۔ حالانکہ یہ ایک ناقابل تردید واقعہ ہے کہ یہاں نہ تو بدکاروں کو لازماً ان کی بدی کی سزا ملتی ہے اور نہ نیک انسان ہمیشہ اپنی نیکی کا بدلہ پاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر رسول کی یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جزائے اعمال کا ایک وقت آئے گا اور اس وقت ہر شخص اپنے ٹھیک ٹھیک انجام سے دوچار ہوگا۔

پھر رسولوں کی اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دنیا میں کبھی کبھی اعمال کے جزوی نتائج ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ سرکش اور باغی قوموں پر خدا کا عذاب نازل ہوا ہے اور اس کے نیک بندے انعام و اکرام سے نوازے گئے ہیں لیکن جو قوم برسوں بلکہ بعض اوقات صدیوں خدا کی نافرمانی کرے اگر وہ کسی زلزلے یا طوفان سے تباہ ہو جائے تو یہ اس کی تمام بدکاریوں کی مکمل سزا ہرگز نہ ہوگی بلکہ محض معمولی سا بدلہ ہوگا۔ اسی طرح جو افراد بڑی بڑی قوموں کو ہدایت کی راہ دکھاتے ہیں۔ اگر ان کو چند سال کے لیے عیش دنیا بھی فراہم کر دیا جائے تو یہ ان کے احسانات کا پورا صلہ نہیں کہا جاسکتا۔

اوتار کے اس مقصد پر ایک اور پہلو سے غور کیجیے۔ وہ یہ کہ کیا بری قوموں کو عذاب دینے یا نیک اقوام کو نجات دینے کے لیے خدائے تعالیٰ کا اوتار لینا ضروری ہے؟ خدا کے رسول کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے خدائے تعالیٰ اوتار نہیں لیتا بلکہ اپنی قدرت سے یہ کام انجام دیتا ہے۔ اب دیکھیے کہ ان میں سے کون سی بات صحیح ہو سکتی ہے؟

اوتار لیے بغیر جس ہستی نے زمین اور آسمان پیدا کیے، چاند اور سورج اور بے شمار سیارے پیدا کیے، خشکی اور سمندر پیدا کیے، کیا وہ کسی قوم کو تباہ کرنے یا نجات دینے ہی کے لیے اوتار لینے پر مجبور ہوگا؟ اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے قوموں کی نیکی اور بدی کے تصور سے ہٹ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا ختم کرنا یا ان کو پستی سے اٹھا کر بلندی پر پہنچانا اس کے لیے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے ایک حکم سے زلزلے آتے ہیں، آتش فشاں پھٹ پڑتے ہیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، طوفان آتے ہیں، سمندر ابل

پڑتے ہیں اور آن کی آن میں بڑی بڑی قومیں تباہ اور بستیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب وہ چاہتا ہے مغلوب کو غالب، محکوم کو آزاد اور مفلس کو دولت مند بنا دیتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی کام کے لیے وہ اوتار لینے پر مجبور نہیں ہے تو کون مان سکتا ہے کہ وہ نیکوں کی حفاظت کرنے اور بروں کو ختم کرنے کے لیے اوتار لیتا ہے۔ الا یہ کہ ہم ثابت کریں کہ اس کائنات کے ہر بڑے واقعہ کے پیچھے کسی نہ کسی اوتار کا عمل دخل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا نہ تو کوئی دعوے کر سکتا ہے اور نہ اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ انسان اپنی زندگی گزارنے اور سنوارنے کے لیے کوئی اعلیٰ نمونہ چاہتا ہے۔ اوتار یہ نمونہ فراہم کرتے ہیں۔ دنیا ان کی سیرت اور صورت کو دیکھ کر ان سے گھل مل کر ان سے بات چیت کرکے، ان کو گھر میں، بازار میں، میدان جنگ اور ایوان حکومت و سیاست میں دیکھ کر ان کے نقش قدم پر چل سکتی ہے اور ان کی اتباع کر سکتی ہے۔

خدا کے رسولوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاتی ہے کہ وہ اپنے افکار و کردار اور سیرت و اخلاق میں دوسروں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ ان میں سے کس کا نمونہ قابل تقلید اور قابل عمل ہے؟

اوتار کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ بظاہر تو وہ مخلوق کی شکل میں ہو لیکن اس کی تمام خصوصیات اور اوصاف خدا ہی کی ہوں۔ اس صورت میں وہ انسان کے لیے قابل تقلید نہیں ہوگا۔ کیونکہ انسان نمونہ خدا کا نہیں بلکہ اپنے جیسے انسان کا چاہتا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ جو شخص اس کی طرح فطری کمزوریاں اور خامیاں، جذبات اور خواہشات، ضرورتیں اور تقاضے رکھتا ہے، وہ کس طرح نیکی اور تقویٰ کی زندگی گزارتا ہے اور اعلیٰ اخلاق اور عمدہ سیرت کا نمونہ پیش کرتا ہے؟ خدائے تعالیٰ کے کام اگر غلطیوں سے پاک ہیں تو ان کو فی الواقع ایسا ہونا ہی چاہیے۔ کیونکہ اس سے کسی غلطی کے صدور کا امکان نہیں ہے۔

اوتار کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ صرف ظاہر ہی میں نہیں بلکہ اپنے جذبات، خواہشات اور ضرورتوں کے لحاظ سے بھی انسان ہی ہو۔ بلاشبہ اس وقت وہ دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ ہوں گے، لیکن اس صورت میں ان کو اوتار کہنا محض ایک تکلف ہوگا۔ اس لیے کہ جب وہ اپنی شکل و صورت ہی میں

نہیں بلکہ سیرت و اعمال میں بھی خدا کی مخلوق ہیں تو کس بنیاد پر ان کو خدا یا اس کا اوتار کہا جائے۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ خدا کے رسول بہترین انسان ہوتے ہیں اس لیے وہ دنیا والوں کے لیے سب سے اچھا نمونہ بھی ہوتے ہیں۔

(۴) اب اس سوال کو لیجیے کہ کیا خدائے تعالیٰ اوتار لے سکتا ہے یا نہیں؟ شری کرشن جی کہتے ہیں:

"گو میں پیدائش اور فنا سے برتر ہوں اور مخلوقات کا مالک ہوں تاہم اپنی قدرت میں دخل دے کر اپنے کرشمے سے ظاہر ہو جاتا ہوں" (گیتا ۴: ۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نہ تو پیدا ہوا ہے اور نہ اس کو موت آتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ عام مخلوقات کی طرح پیدا ہوتا بھی ہے اور مرتا بھی ہے۔ خدا غیر محدود بھی ہے اور وہ محدود شکل و صورت میں ظاہر ہوتا بھی ہے۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہے۔ حیرت ہے کہ ہندو مذہب میں اس تضاد کو محسوس نہیں کیا جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ خدا کی ذات غیر محدود ہے لیکن وہ محدود شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے لیکن یہ کوئی جواب نہیں ہے بلکہ ایک نیا دعویٰ ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدائے تعالیٰ اپنی غیر محدودیت کے ساتھ محدودیت کیوں کر قبول کر سکتا ہے؟ خدائے تعالیٰ کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو بعض چیزوں کو ناممکن سمجھتے ہیں اس لیے کہ وہ اس تصور سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدائے تعالیٰ اپنے سے اونچی ہستی پیدا کر سکتا ہے یا اس کا ہمسر وجود میں آسکتا ہے یا وہ کبھی اپنی قدرت، علم و حکمت اور دوسری صفات سے خالی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا نہیں رہا۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ اس کا کوئی جسم ہو یا وہ کسی مخلوق کی شکل میں ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ جسم کی کچھ خصوصیات ہیں۔ وہ تغیرات قبول کرتا ہے، گھٹتا بڑھتا ہے، اس پر موت و حیات طاری ہوتی ہے، وہ ایک وقت میں ایک ہی جگہ پایا جا سکتا ہے اور جب تک اس جگہ کو نہ چھوڑ دے دوسری جگہ اس کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس خدا کی ذات ہر جگہ ہے اور ہمیشہ سے ہے۔ اس میں کوئی تغیر یا تبدیلی کبھی نہیں آتی۔ پھر ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ وہ جسم رکھتا ہے یا کبھی کوئی جسمانی ہیئت اختیار کر سکتا ہے؟ فلسفیانہ اصطلاح میں اگر ہم ان کو ممتنع بالذات کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ خدائے تعالیٰ بے پایاں قدرت کا مالک ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اگر ہم کسی عمل کے بارے میں یہ کہیں کہ خدائے تعالیٰ کے لیے وہ ممکن نہیں ہے تو یہ اس کی قدرت کا انکار ہوگا

اس کا جواب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ بلاشبہ قادر مطلق ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی کام وہ اس طریقے سے بھی انجام دیتا ہے جو اس کی عظمت سے فروتر اور اس کے لیے نامناسب ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ کسی بھی کام کے لیے کوئی ایسی صورت اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہے کیونکہ کسی کام کے لیے اعلیٰ طریقے کو چھوڑ کر ادنیٰ طریقہ اسی وقت اختیار کیا جاتا ہے جبکہ اعلیٰ طریقہ اختیار نہ کیا جا سکتا ہو یا ادنیٰ طریقہ ہی سے وہ کام ہو سکتا ہو۔ جسم اور اس کے تمام لوازمات خدا کی شان کے منافی ہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ وہ کسی بھی مقصد کے لیے کوئی جسمانی ہیئت نہیں قبول کرتا۔ وہ اس کو اس سے بہتر طریقے سے پورا کر سکتا ہے جس کے لیے جسم کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ ہم اوتار ان ہی کو مانتے ہیں جن میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ وہ غیر معمولی طریقے سے اس دنیا میں آتے ہیں اور غیر معمولی کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ان کے کاموں کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی مخلوق کے کام ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات تو یہ کہ خود ہندو مذہب کی تاریخ اور روایات کی رو سے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں صرف وہی اوتار نہیں ہیں جنھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، بلکہ ایسے اوتار بھی ہیں جن کے کاموں کی کوئی خاص شہرت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ اوتاروں کے جو کارنامے بیان کیے جاتے ہیں تاریخی طور پر ان کو ثابت کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی صحیح نوعیت واقعات سے زیادہ افسانوں کی ہے۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ اگر یہ کارنامے صحیح بھی ہیں تو ہمارے لیے یہ ماننا آسان ہے کہ خدا نے اپنی کسی مخلوق کو (جسے اوتار کہا جاتا ہے) غیر معمولی طاقت عطا کر دی اور اس نے ایسے کام انجام دیے جو عام طور پر اس جیسی کسی مخلوق سے انجام نہیں پاتے۔ لیکن یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ ان کارناموں کو انجام دینے کے لیے خدا کی ذات نے اپنی مخلوق کی شکل اختیار کر لی۔ کیونکہ اس کو ماننے کے بعد خدا کو ماننا دشوار ہو جائے گا۔

اوتار کے فلسفہ کا یہ ایک علمی تجزیہ تھا۔ تاریخی لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس فلسفے نے خدا کی عظمت اور اس کے صحیح تصور کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ خدا کی مخلوقات میں سے بعض کو اس کے اوتار تو قرار دے دیا گیا لیکن ان کو خدا کی طرح بے عیب نہیں ثابت کیا جا سکا۔ ان کے اندر بالآخر اس طرح کی کمزوریاں بھی تسلیم کی گئیں جو ان جیسی مخلوقات میں ہوتی ہیں۔ اوتاروں میں رام چندر جی کامل اوتار سمجھے جاتے ہیں اور ان کا مقام دوسرے اوتاروں سے بہت اونچا ہے لیکن ان کے حالات اور سوانح سے جہاں غیر معمولی شان ظاہر

ہوتی ہے مگر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا علم و فہم اور قوت و طاقت محدود تھی، وہ جذبات سے خالی نہیں تھے اور ان سے بعض غلط حرکتیں اسی طرح سرزد ہوتی تھیں جس طرح دوسرے انسانوں سے ہوتی ہیں۔ مثلاً سیتاجی کو لے کر راون لنکا فرار ہو گیا لیکن رام چندر جی اور ان کے بھائی لچھمن جی کو، جو خود بھی اوتار مانے جاتے ہیں، اس کا پتہ نہیں چلا۔ بالآخر گِدھوں اور چیلوں کے بادشاہ جٹایو کے ذریعے ان کو اس کی خبر ہوئی۔ اب رام چندر جی کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ سمندر پار کرکے کیسے راون کو ختم کریں اور سیتا کو اس کے قبضے سے نکالیں۔ اس معاملے میں رکشش نے ان کی راہ نمائی کی اور ان کو مشورہ دیا کہ وہ بندروں سے مدد لیں۔ بندروں کے سردار سگریو اور اس کے بھائی بالی کے درمیان مقابلہ ہوا۔ رام چندر جی سگریو کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن اپنی اس خواہش کے باوجود اس کی مدد نہیں کر سکے۔ کیونکہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ تھے کہ رام چندر جی کے لیے ان کے درمیان فرق کرنا مشکل تھا۔ اسی طرح راون کا بھائی کنبھ کرن میدان جنگ میں آیا تو ان کو پوچھنا پڑا کہ اس زبردست قد و قامت کا آدمی کون ہے۔ ایک موقع پر لچھمن جی کہتے ہیں کہ رام چندر جی کو انسان تو کیا ایشور بھگوان بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن لنکا کی اس جنگ میں رام اور لچھمن دونوں ہی زخمی ہوئے اور ہنومان کے علاج سے ٹھیک ہوئے۔ جنگ کے دوران راون کے لوگوں نے سیتاجی کا ایک مجسمہ تیار کرکے اسے اس طرح توڑا جیسے وہ سچ مچ ان کو قتل کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر رام چندر جی روتے روتے بے ہوش ہو گئے اور لچھمن جی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اب دھرم کا ماننا بے فائدہ ہے۔ اگر دھرم کا کچھ پھل ہوتا تو رام کو اس قدر مصائب نہ اٹھانے پڑتے۔ بعد میں دونوں کو معلوم ہوا کہ حقیقی سیتا نہیں بلکہ مصنوعی سیتا قتل کی گئی تھیں۔ راون کے ہاتھ سے خود لچھمن جی مارے گئے اور رام چندر جی ان کو بچا نہ سکے اور آہ و زاری کرنے لگے۔ ہنومان کے علاج سے ان کو دوبارہ زندگی ملی۔ ایک وقت رام چندر جی فرماتے ہیں کہ سیتا اگر نہیں ملی تو وہ تینوں لوک برباد کر دیں گے لیکن اس جنگ میں جن مشکلات کا ان کو سامنا کرنا پڑا ان کو دیکھتے ہوئے ان کے اس دعوے میں کوئی معنویت نظر نہیں آتی۔ جنگ کے بعد سیتاجی ان کو واپس ملیں تو وہ یہ جان نہیں سکے کہ ان کی عصمت محفوظ ہے یا نہیں بلکہ ان کے بارے میں بدگمانی کی، حالانکہ وہ بے گناہ تھیں۔ سیتاجی کو جنگل بھیجنے کے بعد ان کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہاں انھوں نے دو بچوں کو جنم دیا ہے اور والمیکی جی ان کی نگہداشت اور تربیت کر رہے ہیں۔ اپنے ان بچوں کی خبر ان کو اس وقت ہوئی جب کہ انھوں نے ایک مجمع

ہیں اُن کے سامنے والمیکی جی کی لکھی ہوئی راماین سنائی اور اس میں سیتا جی کی جلاوطنی اور ان کی پیدائش کا ذکر تھا۔ راون کے قبضے سے سیتا جی کو نکالنے کے بعد رام چندر جی نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا اسے ہم کسی طرح صحیح نہیں کہہ سکتے۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے ان کے بارے میں ایک وہمی انسان کی طرح بار بار شبہہ کیا اور پھر ان کی پاک دامنی کا قطعی ثبوت فراہم ہونے کے باوجود ان کو جلاوطن کر دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں انھوں نے عوام کی اس خواہش کا احترام کیا کہ دشمن کے قبضے میں گئی ہوئی بیوی کو انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہیے۔ حالانکہ ان کے شایانِ شان بات یہ تھی کہ جب وہ بے قصور تھیں تو عوام کی مخالفت کے باوجود ان کو اپنے ساتھ رکھتے۔ دوسروں کی مخالفت کی بنا پر ایک بے گناہ کو سزا دینا کسی منصف آدمی کا کام ہرگز نہیں ہو سکتا اور اوتار تو خدا سمجھا جاتا ہے اسے اس طرح کی غلط حرکت سے بہت بلند ہونا چاہیے۔

آپ آپ کرشن جی اوتار کو لیجیے جن کا مقام ہندو قوم میں رام چندر جی کے بعد سب سے اونچا ہے۔ ارجن ان کے رشتہ دار تھے۔ ایک عرصے سے ان کے ساتھ رہ رہے تھے لیکن انھوں نے ان میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں دیکھی کہ وہ ان کو خدا یا اوتار خیال کرتے۔ وہ اس پوری مدت میں ان کو محض اپنا ایک دوست اور ساتھی سمجھتے رہے۔ ان کا اوتار ہونا مہا بھارت کی جنگ میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر خدا کی تمام خصوصیات کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کوروں اور پانڈوں کی یہ جنگ اٹھارہ دن جاری رہی تب کہیں جاکر کورو مارے گئے لیکن پھر بھی ان میں سے تین شخص باقی رہ گئے اور ان تینوں نے پانڈوں کے سارے لشکر کو جب کہ وہ سو رہا تھا قتل کر دیا اور کرشن جی ان کو بچا نہ سکے۔ اس قتل عام سے صرف پانچ پانڈو اور ان کی بیوی بچی۔ خود کرشن جی کی موت ایک معمولی انسان کی طرح ہوئی جنگل میں ایک شکاری نے غلط فہمی میں ان پر تیر چلایا۔ تیر لگا اور وہ مر گئے۔ ظاہر ہے یہ حالات خدا کی عظمت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔

یہاں ہم نے صرف رام چندر جی اور کرشن جی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ورنہ عام اوتاروں کی جو سیرت بیان کی جاتی ہے ان میں ایسے حالات بھی ملتے ہیں کہ ان کو کسی شائستہ انسان کی طرف بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا، چہ جائے کہ خدائے قدوس کی طرف منسوب کیا جائے۔

قومی یک جہتی اور اتحادِ مذاہب[1]

(ڈاکٹر عبدالحق صاحب انصاری، شعبہ عربی و فارسی و اسلامیات وشوا بھارتی شانتی نکیتن)

بڑی مسرت ہے کہ قومی یک جہتی کونسل کی بھاگل پور یونیورسٹی کی شاخ نے اپنے زیر اہتمام وقت کے ایک اہم موضوع پر اظہار خیال کا موقع دیا ہے۔ اس سمینار کے کارکنان ہمارے دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو آپس کی مشترک باتوں کی کھوج لگانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے ہمارے اندر اپنی مشترک چیزوں کا شعور بیدار ہوگا۔ اور ہم قومی یک جہتی کے مقصد سے قریب آئیں گے۔ ذاتی طور پر میں اس سمینار میں شرکت کو اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں اور اس کے لیے کارکنان سمینار کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میں اپنا مقالہ چند مسائل تک محدود کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ ہندوستان میں رہنے والے مختلف مذاہب میں جو باتیں مشترک ہیں، ان کو پیش کروں۔ پھر میں اس مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مشترک باتیں کس حد تک قومی یک جہتی، پرامن زندگی، خوش حال سماج اور روحانی اعتبار سے بلند ملک کی تعمیر کے لیے بنیاد بن سکتی ہیں، اور آخر میں اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ ان مشترک باتوں اور ان مقاصد کے سلسلے میں اسلام کا رجحان کیا ہے اور اسلام ان کے حاصل کرنے اور ان کو قوی بنانے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔

ہم اگر ہندوستان کے مذہبوں کا معروضی مطالعہ کریں اور پہلے سے سوچے ہوئے فلسفوں اور نظریات سے اور اپنے محبوب اور پسندیدہ رجحانات سے بلند ہو کر صرف اس مقصد سے ان پر نظر ڈالیں کہ ان کے درمیان کیا باتیں واقعتہً مشترک ہیں تو پہلی بات ہمیں یہ نظر آنے گی کہ ہمارے سارے مذاہب انسانی زندگی

---

[1] یہ مقالہ بھاگلپور یونیورسٹی کی قومی یک جہتی کمیٹی کے ایک سمینار منعقدہ ۱۴ر ۱۵ اگست کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔

کی چند عام اور بنیادی قدروں پر متفق ہیں۔ سچائی، انصاف، پاس عہد، امانت کو سب تعریف کا مستحق سمجھتے ہیں جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو سب برا کہتے ہیں۔ ہمدردی، رحم، فیاضی اور فراخ دلی کی سب قدر کرتے ہیں۔ خود غرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو سب حقیر سمجھتے ہیں، صبر و تحمل، ضبط نفس، نرمی اور شائستگی سب کے نزدیک خوبیاں ہیں، چھچھوراپن، بندگی نفس، درشتی اور کج خلقی سب کے یہاں برائیاں ہیں، فرض شناسی، وفا شعاری، مستعدی اور احساس ذمہ داری کی سب عزت کرتے ہیں، فرض نشناسی، بیوفائی کام چوری اور غیر ذمہ داری کو سب بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اسی طرح سماجی زندگی کے لیے نظم و ضبط، ڈسپلن، تعاون، امداد باہمی، آپس کی محبت، خیر خواہی اور اجتماعی انصاف کو سب ہی ضروری قرار دیتے ہیں۔ تفرقہ، انتشار، بدنظمی، انفاق، آپس کی بدخواہی ظلم اور ناہمواری کو سب نقصان دہ اور مہلک مانتے ہیں۔ چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، جعل سازی، رشوت خوری سب ہی کے نزدیک گناہ ہیں۔ بدزبانی، مردم آزاری، غیبت، چغل خوری، حسد، بہتان تراشی اور فساد انگیزی سب کے یہاں پاپ ہیں۔ والدین کی خدمت، رشتہ داروں کی امداد، پڑوسیوں سے سلوک، دوستوں سے رفاقت، کمزوروں کی حمایت، یتیموں اور بے کسوں کی خبرگیری، مریضوں کی تیمارداری اور مصیبت زدوں کی اعانت کو سب نیکی کے کام سمجھتے ہیں۔ پاک دامن، نرم مزاج، خیر اندیش، راست باز اور ایسے لوگ جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو، جو اپنے حق پر مطمئن ہوں اور دوسروں کا حق دینے میں فراخ دل ہوں، جو خود شانتی سے رہیں اور دوسروں کو شانتی دیں، جن کی ذات سے ہر ایک کو بھلائی کی امید ہو اور کسی کو برائی کا خطرہ نہ ہو۔ ایسے ہی نیک نفسوں اور مہاپرشوں کا پیدا کرنا ہر مذہب کا اول مقصد ہے۔

یہ قدریں انسانی زندگی اور انسانی سماج کی عام قدریں ہیں، کسی مذہب کی ان پر اجارہ داری نہیں یہ ہر مذہب کی یکساں میراث ہیں، ان کے سلسلے میں کوئی مذہب اپنے اور غیر کی تمیز نہیں کرتا، کوئی مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ انصاف، خیر خواہی، ہمدردی اور محبت صرف اپنے مذہب کے لوگوں کے ساتھ برتو، اور دوسرے مذہب کے ساتھ ظلم، بدخواہی، بے رحمی اور دشمنی سے پیش آؤ، اپنے ہی لوگوں کی جان، مال، عزت، آبرو کی حفاظت کرو، ان ہی کے ساتھ اشتراک و تعاون کا ہاتھ بڑھاؤ اور دوسرے لوگوں کا مال لوٹ لو، ان کو گھر سے بے گھر کرو، ان کی جائدادیں غصب کرو، انھیں قتل اور بے عزت کرو۔ کوئی مذہب اس رویے کو روا نہیں رکھتا۔

اپنوں اور دوسروں کے ساتھ سلوک میں اگر کسی معنے میں فرق کیا گیا ہے تو صرف اس قدر کہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر برتاؤ، زیادہ ایثار اور احسان کرنا چاہیے مگر کسی مذہب نے یہ جائز نہیں رکھا ہے کہ اپنوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے لیے دوسروں کا حق مارا جائے اور ان پر ظلم و زیادتی کی جائے، دوسرے کے ساتھ برائی میں اپنوں کی بھلائی کی کوئی مذہب تعلیم نہیں دیتا۔

ان عام انسانی قدروں میں جو نیکیاں ہیں سارے مذاہب کے نزدیک وہ انسان کی فضیلت، عظمت اور بزرگی کا معیار ہیں اور ان میں جو برائیاں ہیں وہ انسان کی ذلت اور پستی کی نشانی ہیں، پوجا پاٹ، یا نماز، روزوں کی کثرت، گنگا اشنانوں یا تراؤں، زیارتوں اور حجوں سے نہ ان نیکیوں کی کمی پوری ہو سکتی ہے اور نہ ان برائیوں کی ذلت دور ہو سکتی ہے، یہ ہر مذہب کا عقیدہ ہے۔

ان بھلائیوں کا کرنا ہر مذہب میں بڑے ثواب اور پُن کا کام مانا گیا ہے، اور ان برائیوں کا ارتکاب کرنا ہر دھرم میں مہا پاپ اور گناہ کبیرہ تسلیم کیا گیا ہے، مکتی اور نجات کے تصور میں مذاہب کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اس باب میں کسی کا اختلاف نہیں کہ ان نیک کاموں کے انجام دیے بغیر اور ان برے کاموں سے دامن بچائے بغیر مکتی نصیب ہو سکتی ہے، نجات کے لیے دوسری ضروری باتوں میں چاہے جس قدر اختلاف ہو کم از کم ان عام انسانی قدروں کے ضروری ہونے کے بارے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے، ہر مذہب کی تعلیم ہے کہ ان عام بھلائیوں کو نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ انجام دیا جائے اور ان عام برائیوں سے سچے دل سے توبہ کی جائے، دکھاوے اور نمائش کا جذبہ، یا کسی چیز کا لالچ، یا کسی نقصان کا اندیشہ ہماری راست روی اور حسن سلوک کا محرک نہ ہو، ہم نیکی کو نیکی کی خاطر یا خدا کی محبت اور رضا جوئی کے جذبے سے کریں اور برائی کو برائی سمجھ کر اور خدا کی ناخوشی کا خیال کر کے اس سے باز رہیں۔

ہر انسان کی ذاتی زندگی کی سدھار اور سماج کی بناؤ اور تعمیر کی تفصیلات میں مذاہب کے درمیان اختلافات ہیں، مگر جو ذاتی اور سماجی خوبیاں یا خرابیاں اوپر بیان کی گئی ہیں ان کے سلسلے میں مذاہب کے درمیان ہرگز دو رائے نہیں ہے، افرادِ انسانی کا تزکیہ ہو، یا سماج کی تعمیر، ان خوبیوں کو پیدا کرنا اور ان برائیوں سے بچنا ہر مذہب کے نزدیک ضروری ہے۔ کوئی سدھار، کوئی اصلاح اور کوئی تعمیر اور کوئی بھلا منصوبہ اور اچھا پروگرام اس کے بغیر انجام ہی نہیں پا سکتا۔ ہر مذہب کے نزدیک یہ قدریں بنیادی اور اہم (Essential) ہیں کوئی ان کو غیر ضروری، غیر اہم اور سطحی نہیں کہتا۔

مذاہب کے درمیان پوجا پاٹ، پرستش وعبادت، ذکر وفکر، ریاضت اور ضبط نفس کے طریقوں اور مقاصد میں فرق ہے، لیکن اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ ان سارے طریقوں، آداب رسوم اور اعمال کے مختلف مقاصد میں سے ایک بڑا اور اہم مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ، اختیار و ارادے کی ایسی تربیت ہو جائے کہ انسانیت کی عام نیکیاں اس کو محبوب ہو جائیں اور اس سے بے اختیار سرزد ہو جانے لگیں اور انسانیت کی عام برائیوں کے خلاف اس میں شدید نفرت پیدا ہو جائے اور وہ ان سے طبیعت کے تقاضے کے طور پر دور رہنے لگے، نیکیاں کر کے اس کو خوشی اور مسرت محسوس ہو اور اگر غلطی سے کوئی برائی کر بیٹھے تو نادم اور شرمسار ہو۔

انسانی محبت، حسن خلق، احسان، ایثار و خدمت کے بارے میں یہ تو اختلاف مذاہب کے درمیان ہے کہ یہ انتہائی اور آخری قدریں ہیں، یا ان سے بلند تر کچھ دوسری قدریں بھی ہیں، اگر ہیں تو کیا ہیں لیکن اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں کہ انسانیت کی تکمیل ان قدروں کے بغیر ممکن نہیں، عبادتیں اور ریاضتیں جتنی چاہیں کرلیں، ہزاروں بار جاپ کرلیں، ہمہ وقت دھیان وگیان میں لگے رہیں لیکن اگر ہم ان عام انسانی قدروں میں کوتاہ ہوں گے، تو ہم ہر مذہب کی نگاہ میں اور ہر روحانیت کے معیار سے ناقص اور ادھورے ہی رہیں گے۔

انسانیت کی یہ عام قدریں اور ان کے بنیادی تقاضے ہر مذہب میں مشترک ہیں۔ ان کے علاوہ مذاہب میں جو باتیں مشترک ہیں وہ صوری (Formal) اور منفی (Negative) زیادہ ہیں۔ معنوی (Natural) اور مثبت (Positive) کم۔ اس بات کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

ہر مذہب میں یہ احساس مشترک ہے کہ یہ کارخانۂ قدرت اور یہ وجود انسانی صرف طبیعی علوم کا موضوع نہیں ہے۔ کچھ اور حقیقتیں بھی ہیں جو ان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ یہ نظام ہست وبود خود مکتفی (Self) نہیں ہے۔ اس منفی احساس میں ہر مذہب شریک ہے، لیکن جب یہ مثبت سوال اٹھتا ہے کہ وہ غیر طبیعی حقیقت کیا ہے۔ ایک ہے یا متعدد، کن صفات کی حامل ہے، کائنات اور انسان سے اس کا کیا تعلق ہے تو ان جیسے اہم مسائل کے بارے میں ہر مذہب کی راہ جدا ہوتی ہے۔

اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے نزدیک کائنات حقیقی وجود رکھتی ہے، ایک ہی ذات ہے جس نے

اس کی تخلیق کی ہے، وہ شعور، علم، قدرت، اختیار اور ارادے کی مالک ہے۔ وہی اس کائنات کی مدبر منتظم اور حکمراں ہے۔ انسان روح اور جسم کا ایک انوکھا مرکب ہے۔ وہ اپنے خالق کی طرح علم، قدرت اختیار اور ارادے کا مالک ہے، لیکن اس یکسانیت کے باوجود وہ محض ایک مخلوق اور بندہ ہے۔ خدائی میں شریک نہیں۔ اپنے وجود، اختیار اور عمل میں خدا کا محتاج ہے اور اس کے حکم کا پابند۔ اس کی بلند ترین سعی خدا کی اطاعت اور محبت ہے۔

زردشت توحید کے قائل تھے۔ مگر ان کے مذہب میں دھیرے دھیرے تغیرات شروع ہوئے اور آج ان کے پیرو خیر و شر، نور و ظلمت کے دو متوازی اور مستقل تصورات پر یقین رکھتے ہیں، اور کائنات اور انسانی تاریخ کو ان ہی دونوں قوتوں کی آویزش کا نتیجہ کہتے ہیں

جینزم انسانی روح (jiva) کو ایک مستقل ازلی اور ابدی حقیقت سمجھتا ہے جو غیر معلوم طریقے سے لا روح (ajiva) سے ملوث ہو کر زندگی کے ایک لامتناہی سلسلے میں گرفتار ہو گئی ہے۔ یہ کائنات اور اس کا ہر وجود چاہے وہ بظاہر کتنا ہی بے حس اور بے شعور ہو، روح ہی کی مختلف ارتقائی اور انحطاطی حالتوں کا نام ہے۔ روح ایک نہیں ہے، بلکہ بے شمار اور لاتعداد روحیں ہیں ان سے الگ کوئی وجود نہیں ہے نجات یافتہ حالت سے بلند تر کوئی حقیقت نہیں۔

بدھزم میں کوئی حقیقت لازوال نہیں ہے۔ شعور انسانی لمحاتی شعوروں کے پے بہ پے متعدد آفات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، اگر حقیقت کوئی شے ہے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں اور اسی سلسلے کا انقطاع انسانی کوششوں کی وہ آخری غایت ہے جسے نروان کہتے ہیں۔

ہندوازم کا کوئی ایک متعین فکر نہیں ہے اس میں توحید بھی ہے، ثنویت بھی ہے، کثرت بھی ہے اور الحاد بھی، مگر غالباً یہ بات زیادہ صحیح ہو گی کہ بحیثیت مجموعی ہندوازم میں ایک خدائے عظیم کا تصور غالب ہے۔ اگرچہ خدائی اس کے لیے مخصوص نہیں سمجھی گئی، ہندوازم نے خدا اور دوسرے وجودوں میں خدائی عنصر مشترک سمجھا ہے، خالق اور مخلوق کا وہ تصور جو اسلام، یہودیت اور عیسائیت میں مشترک ہے، وہ ہندوازم کا تصور نہیں ہے۔ یہاں خدا کو ایک غیر شخصی وجود تسلیم کیا گیا ہے اور پوری کائنات اور ہر انسان کو اس لامتناہی وجود کا ایک متعین اور محدود ظہور قرار دیا گیا ہے۔ انسان کی سب سے اونچی منزل اسی وحدت کا شعوری عرفان اور عملی حصول ہے۔

مذاہب کے درمیان حقیقت، کائنات اور انسان کے بارے میں یہ اصلی اختلافات حقیقی ہیں اور انتہائی اہم۔ کیونکہ اس بنیادی اختلاف کا اثر ان کے پورے نظام پر بحیثیت مجموعی اور اس کی تمام تفصیلات پر علیحدہ علیحدہ مرتب ہوتا ہے۔ مذاہب کی مثال مختلف قسم کے درختوں کی ہے، اگرچہ سارے درخت اس اعتبار سے ایک ہیں کہ ان میں ہر ایک جڑ، تنا، شاخوں، پتیوں، پھولوں اور پھلوں پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن اس صوری (Formal) اتحاد کے بعد ان میں سے ہر ایک دوسرے سے جدا ہے۔ بیج سے کر جڑوں کی ترتیب، تنے کی ساخت، شاخوں کا انداز، پھولوں کا رنگ اور پھلوں کا مزہ، غرضیکہ ہر چیز میں فرق اور اختلاف ہے۔

اس اختلاف کی ایک ادنیٰ مثال پوجا، عبادت، ذکر و فکر، دعا اور استمداد کے طریقے ہیں، جن کے ذریعے اہل مذاہب اپنے اپنے مذہب کے اعلیٰ حقائق سے تعلق قائم کرتے ہیں۔ جن مذاہب میں سب سے بڑی حقیقت ایک غیر شخصی وجود ہے، اور انسان سے اس کا تعلق ایک لامتناہی (Infinite) حقیقت اور اس کے متناہی (Finite) آئین کا ہے ان میں تفکر (Contemplation) کو مرکزی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جن مذاہب میں خدا کا تصور شخصی ہے اور انسان سے اس کا تعلق شخصی نوعیت کا ہے ان میں پوجا، پرستش، ذکر اور دعا اہم ترین عبادات ہیں۔ ان میں خدا کے ارادے پر سر تسلیم خم کرنا اور اس کا حکم بجا لانا، اس کی مرضی پوری کرنا حاصل زندگی ہے۔

اسی طرح جن مذاہب میں انسان کی روح کو ایک مادی جسم میں مقید سمجھا گیا ہے اور دونوں میں تضاد کو بنیادی حقیقت قرار دیا گیا ہے، ان میں ترک دنیا، زہد اور شدید جسمانی ریاضتوں کو لازمی ٹھیرایا گیا ہے اور جن میں روح اور جسم کے تعاون کو بنیادی حقیقت سمجھا گیا ہے، ان میں صبر و ضبط کے ساتھ ساتھ تمتع اور شکر کی بھی تعلیم دی گئی ہے اور دنیا کو برتنے کی چیز اور اس زندگی کو ساری قوتوں کے بروئے کار لانے اور ان کی آزمائش کی مدت قرار دیا گیا ہے۔

مذاہب کے درمیان اختلاف نظریات اور عقائد، عبادات اور تزکیہ نفس کے طریقوں تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ اخلاق اور دوسری قدروں میں بھی اختلاف ہے، عام انسانی قدروں میں اشتراک اور اتحاد کے بعد جس کی تشریح پہلے کی گئی ہے، اختلاف کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ قدروں کے بنیادی تصور، زندگی کی اسکیم میں ان کا مقام، دو طرح کی قدروں مثلاً اخلاقی اور جمالیاتی قدروں کی باہمی اہمیت، ایک ہی طرح کی قدروں مثلاً اخلاقی قدروں میں سے ہر قدر کی اہمیت اور قیمت، ان میں ٹکراؤ کے وقت ترجیح کے اصول، پھر قدروں کے حصول

کے طریقے اور ان طریقوں میں فرد اور معاشرے کا رول، یہ اہم مسائل ہیں جن میں مذاہب کے درمیان بے حد اختلاف ہے۔ مثلاً ایک کے نزدیک اہنسا مستقل اور انتہائی قدر بلکہ عقیدہ ہے، دوسرے کے نزدیک یہ دوسری قدروں کی طرح صرف ایک قدر ہے۔ ایک کے نزدیک برہنگی ترک دنیا کی تکمیل اور ضبط نفس کا آئیڈیل ہے اور دوسروں کے نزدیک ایک ناپسندیدہ فعل۔

بنیادی نظریات، عقائد اور قدروں میں اختلاف کی وجہ سے مذاہب کے مذہبی اور سماجی نظام میں جو اختلافات ہیں وہ اور بھی زیادہ نمایاں ہیں۔ یہ اختلافات اس قدر واضح ہیں کہ ہر آدمی انہیں محسوس کرتا ہے اس وجہ سے ان کی تشریح میں وقت صرف کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے جن اختلافات کی اوپر نشان دہی کی ہے، بعض لوگ ان کو حقیقی نہیں سمجھتے، صرف ہماری ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ پھر جن اختلافات کو وہ تسلیم کرتے ہیں ان کو جزئی اور فروعی اور غیر اہم (Unessential and unimportant) کہہ کر ان کی اہمیت گھٹاتے ہیں۔

میں ان حضرات کے اخلاص کا معترف ہوں لیکن مجھے ان کی رائے سے اخلاص اور سچائی کی بنیاد پر ہی اختلاف ہے، میں مذاہب کے درمیان جس کی یکسانیت، اشتراک اور اتحاد کی وضاحت کر چکا ہوں اس سے زیادہ اتحاد کی چیز نہیں پاتا۔ پھر صراحت کے ساتھ یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ میں جس حد تک اشتراک اور اتحاد پاتا ہوں اس کو واقعی حقیقی اور اہم (Essential) سمجھتا ہوں، میرے نزدیک اتحاد کا یہ پہلو سطحی اور غیر اہم نہیں ہے، مگر میرے خیال میں یہی پہلو تنہا ساری قدر و قیمت کا حامل بھی نہیں ہے، دوسرے پہلو بھی اسی طرح اہم ہیں، دوسرے الفاظ میں میں مذاہب کے درمیان ایک اہم پہلو میں اشتراک اور اتحاد کا قائل ہوں، لیکن جن امور میں اختلاف واقعتہً ہے، ان سارے امور کو غیر اہم بھی نہیں سمجھتا ورنہ ان کے درمیان اختلاف کو ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ میرے نزدیک اہم اور غیر اہم بنیادی اور سطحی کا جو معیار ہے وہ معروضی ہے، کوئی ذاتی نظریہ نہیں ہے۔ میں ہر مذہب کی ہر اس بنیاد کو اہم اور بنیادی کہنے کے لیے تیار ہوں جس کو اس کے مذہب کے ماننے والے اہم اور بنیادی سمجھیں۔ چاہے میرے مذہب میں وہ اہم نہ ہو اور ہر اس بات کو غیر اہم تسلیم کرتا ہوں جس کو اس کے ماننے والے غیر اہم اور جزئی کہیں، خواہ وہ میرے مذہب کے اندر اہم ہی کیوں نہ ہو۔

آنجہانی ڈاکٹر بھگوان داس نے اپنی کتاب (The Essential unity of

all religions) میں یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ سارے مذاہب نہ صرف بنیادی انسانی قدروں میں متحد ہیں، بلکہ بنیادی نظریہ عقیدہ، عبادت، اخلاق اور بنیادی سماجی اصولوں میں بھی متحد ہیں، ان کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کا تعلق بنیادی اور اہم چیزوں سے نہیں ہے، بلکہ صرف غیر اہم باتوں اور جزئی تفصیلات سے ہے، ایک بنیادی مذہب ہے، جو قدیم اور دائمی ہے، وہ سارے مذاہب کا مشترک جز ہے، باقی اجزاء عارضی اور وقتی ہیں، سارے مذاہب کو اپنے غیر اہم جزئی اور عارضی اختلافات کو بھلا کر اس مشترک قدیم اور دائمی مذہب پر جمع ہو جانا چاہیے، اور اسی متحدہ بنیاد پر زندگی کی از سر نو تعمیر کرنی چاہیے۔

اسی قدیم دائمی اور مشترک مذہب کی جو وضاحت انھوں نے کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ کائنات دراصل ایک عظیم غیر شخصی وجود کا مظہر ہے۔ ساری چیزیں اور تمام انسان اسی لامتناہی اور غیر محدود وجود کے متناہی اور محدود تعفیات ہیں۔ انسان کی ساری جد و جہد کی آخری غایت اپنے شخصی اور جزئی وجود کو اس غیر شخصی اور کلی وجود میں ضم کر دینا اور اس سے مل کر اسی طرح لامحدود ہو جانا ہے، جس طرح قطرہ دریا میں فنا ہو کر بے کراں ہو جاتا ہے، اسی میں انسان کی نجات ہے، اور صرف اسی اصول پر دنیا میں انسان کی سندعا اور سماج کی تعمیر ممکن ہے۔

یہ نظریہ ایک فلسفہ کی حیثیت سے یا انسانی زندگی کی تعمیر کے نقطہ نظر سے یا مذاہب کے درمیان مشترک عنصر کی توجیہ کے اعتبار سے کیا اہمیت رکھتا ہے، یہ سوال الگ ہے۔ اس سلسلے میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں لیکن میرے خیال میں مذاہب کا معروضی مطالعہ اگر سامنے ہو تو اس نظریہ کی صحت مشتبہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نظریہ چند مذاہب پر صادق آئے، لیکن بہت سے مذاہب پر صادق نہیں آئے گا۔ مثال کے طور پر اسلام میں خدا کا تصور ایک شخصی وجود کا ہے، خدا اور انسان کے درمیان تعلق ایک آقا اور بندہ کا شخصی تعلق ہے، اسلام میں انسان کی بلند ترین منزل اپنے جزئی وجود کو فنا کر کے خدا میں مل جانا نہیں بلکہ اس کے حکم کی اطاعت اور اس کی مخلصانہ رضا جوئی کے طریقے سے اس کی معیت اور قربت میں اپنے انفرادی وجود کی تکمیل کرنا ہے۔ آں جہانی ڈاکٹر بھگوان داس نے اسلام کا مطالعہ کرتے وقت مسلم صوفیا کے ایک محدود گروہ کو اسلام کا ایک حقیقی نمایندہ سمجھ لیا ہے۔ اگر وہ پورے اسلامی تصوف ہی کا بذات خود مطالعہ کر سکتے تو وہ اس فکر کو اسلام کا فکر ثابت کرنے سے پرہیز کرتے اور اگر وہ براہ راست قرآن کریم اور رسول اکرم ؐ کی سنت کی ورق گردانی کرتے تو یقیناً اپنی رائے میں ترمیم کر لیتے۔

اپنشد کے فلسفہ میں یقین رکھنا اور اس کی برتری کا قائل ہونا ایک الگ بات ہے' اس کا اختیار ہر شخص کو پہنچتا ہے لیکن اس کو ہر مذہب کا واحد فکر ثابت کرنا دوسری بات ہے۔ میرے خیال میں مذاہب کے معروضی مطالعہ سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ یہ فکر ہر مذہب کا مشترک فکر ہے۔ ہر مذہب تو کجا' ہندوستان میں بنے والے سارے مذاہب مثلاً بدھزم اور جینزم کا بھی فکر وہ نہیں ہے جو اپنشدوں کا ہے۔

مذاہب کے درمیان فکری اتحاد کی تلاش کا ایک مظہر ایف شئوان (Faithj of Schuon) کی کتاب (The cendental unity of religions) ہے۔ شئوان کا خیال ہے کہ صداقتیں دو طرح کی ہیں۔ مابعد الطبیعاتی اور مذہبی۔ مابعد الطبیعاتی صداقت (Metaphysical Truth) ایک ہے اور مذہبی صداقتیں (Religious truth) بہت سی ہیں' لیکن یہ سب ہی مابعد الطبیعاتی صداقت کے مختلف مظاہر اور مختلف شکلیں ہیں۔ یہ مابعد الطبیعاتی صداقت ایک پر اسرار اور ناقابل بیان شئے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ بلند صداقت سربستہ راز ہے تو پھر یہ کیونکر معلوم ہوا کہ وہ ایک ہی ہے اور یہ کیسے پتہ چلا کہ سارے مذاہب اس کی ظاہری شکلیں ہیں۔

مذاہب کے درمیان نظریاتی اتحاد تلاش کرنے کی اور دوسری کوششوں کا ذکر بے فائدہ ہے اور اس مختصر مقالہ میں اس کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ مذاہب میں یکسانیت اور اتحاد عام انسانی قدروں کے حدوں میں ہے اور یقیناً ہے اور یہ اتحاد (Unity) ضروری اور اہم (Essential) ہے۔ اس حد سے آگے اتحاد کی طلب کا کوئی حاصل نہیں۔

(۲)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حد سے آگے اتحاد کی ضرورت کیا ہے؟ کیا اس حد میں اتحاد اور اتفاق مختلف مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے' ساتھ رہنے' امن و شانتی سے زندگی گزارنے' ایک دوسرے سے محبت اور اخلاص سے پیش آنے' ایک دوسرے کے ساتھ انصاف' رحم دلی اور ایثار کا سلوک کرنے' ایک دوسرے کی مذہبی روایتوں' مقدس شخصیتوں اور نازک احساسات کا احترام کرنے اور مل جل کر ایک خوش حال' پر امن' ترقی پسند اور اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بلند سماج کی تعمیر کے لیے کافی نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں قومی اتحاد اور یک جہتی ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ زبانوں' ذاتوں' علاقوں اور قبیلوں کی کثرت کے ساتھ مذہبوں کی کثرت کو بھی اس اتحاد اور یکجہتی کی راہ میں حائل سمجھا جاتا ہے۔ یہاں دوسرے اسباب

[illegible] ہے۔ ہماری توجہ صرف مذاہب کی کثرت اور قومی یکجہتی اور اتحاد سے اس کے تعلق تک محدود رہے گی۔

—

میرے خیال میں مذاہب کی کثرت بذاتہ اتفاق اور اتحاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے رجحانات، مقاصد اور خیالات اس راہ میں رکاوٹ ہیں جن کا واقعی کوئی تعلق کسی مذہب سے نہیں ہے بلکہ وہ ہر مذہب کی بنیادی تعلیمات کی ضد اور مخالف ہیں۔ لوگوں نے ان کو صرف اپنے چھوٹے اور حقیر ذاتی اور گروہی مقاصد کے لیے اپنا لیا ہے۔ جب ایک فرد یا گروہ ان مقاصد کو اپنا تاہے تو دوسرے بھی ان کو دیکھ کر اور ان کی ضد میں ایسے ہی متضاد مقاصد اختیار کر لیتے ہیں۔ اور پھر ضد اور خود غرضی کا ایک گھناؤنا چکر چل پڑتا ہے۔ آج ملک اسی چکر اور اس کے برے نتائج کا شکار ہو رہا ہے۔ اس عمل اور ردِ عمل میں کوئی بھی نہیں سوچتا کہ وہ جو رویہ اختیار کرتا ہے وہ خود اس کے مذہب اور اچھی روایات سے کس قدر دور ہے۔ وہ کس طرح اپنی ہی قدروں، اپنی ہی روایتوں کو مٹی میں ملا رہا ہے، اور اپنے کو گناہوں اور پاپوں کی موٹی زنجیروں میں کستا اور اپنی نجات اور مکتی کو مشکل سے مشکل تر بناتا جا رہا ہے اور کس قدر انسانیت اور شرافت سے دور حیوانیت اور درندگی کی پستیوں میں گرتا جا رہا ہے۔ اس کے غلط کار اور غلط اندیش لیڈر اپنے مذہب کی تعلیمات کے بر خلاف اس کی غلط رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کا ضمیر اس غلط رہنمائی پر ٹوکتا ہے مگر وہ اپنے ضمیر کی آواز کو کچلتا ہوا حقیر اغراض اور چھوٹے مقاصد کے سبز باغوں سے مسحور ہو جاتا ہے اور پھر وہ کچھ سوچتا ہے اور وہ کچھ کرتا ہے جو اس کے اپنے مذہب اور اپنی اونچی روایات ہی کا نہیں عام انسانی قدروں کا بھی خون ہوتا ہے۔

مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں افتراق اور نا اتفاقی کے کچھ اسباب ہیں:۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان ایک مذہب کے ماننے والوں کا نہیں، سارے مذاہب کے ماننے والوں کا ملک ہے جو یہاں سینکڑوں اور ہزاروں سال سے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اس ملک کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بدیسی کہتے ہیں اور ان کے مذہب کو اپنے مذہب کے برابر تسلیم نہیں کرتے

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر مذہب کا ماننے والا اپنے مذہب کی باتوں کو سچا ماننے اور ان میں یقین رکھنے اپنے رسم و رواج، روایتوں، قدروں اور بزرگوں کو بہتر اور برتر سمجھنے کے معنے غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ دوسروں

پر زبردستی اپنے مذہب کی باتوں کو لادا جائے، قوت اور دوسرے طریقوں سے دوسروں کو اپنا ہمنوا بنایا جائے ان کے مذہبی خیالات پر پھبتی کسی جائے، ان کی بزرگ ہستیوں کا مذاق اڑایا جائے، ان کے رسم و رواج کی بے حرمتی کی جائے، ان کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچائی جائے، حالانکہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اگر کسی عقیدے کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہوں تو اس سے یہ نتیجہ کب نکلتا ہے کہ میں دوسرے کو برا بھی کہوں اور اس کا مذاق اڑاؤں، اسی طرح اگر میں اپنے مذہب کی چیزوں کو صحیح سمجھتا ہوں اور دوسرے کے مذہب کی باتوں کو غلط، تو اس سے مجھے کب یہ حق پہنچتا ہے کہ میں اپنی باتوں کو زبردستی اس سے منواؤں، اور اگر وہ نہ مانے تو اس کو برا بھلا کہوں، اور اس کو تکلیف پہنچاؤں۔ میں اگر ایسا کروں گا تو انسانیت جمہوریت اور خود اپنے مذہب کی اعلیٰ قدروں کا گلا گھونٹوں گا جو انسانی احترام اور محبت کا سبق دیتی ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ایک مذہب کا آدمی جس احترام، جس عزت اور جس آزادی رائے اور ضمیر، جس آزادی کی اشاعت و تبلیغ اور جن حقوق کا اپنے کو مستحق سمجھتا ہے، اس آزادی اور عزت، آزادی اور حق کا دوسرے مذہب کے آدمی کو حق دار سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، وہ اپنے حقوق تو سارے حاصل کرنا چاہتا ہے مگر دوسروں کو ان کا معمولی حق بھی دینا نہیں چاہتا، وہ ذرا بھی نہیں سوچتا کہ اس کا یہ طریقہ اس کے مذہب کی عزت نہیں الٹا اس کی ذلت کا باعث ہوگا۔

میرے خیال میں مذاہب کے لوگوں میں نا اتفاقی اور عداوت کے یہی تین بڑے اسباب ہیں۔ ان کا علاج میرے نزدیک یہ ہے کہ

۱۔ ہم ہندوستان کو ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، بدھوں، جینیوں، پارسیوں اور ان کے سارے فرقوں کا ملک سمجھیں جو پشتہا پشت سے اسی میں بستے اور رہتے چلے آرہے ہیں۔ ہم سچے دل سے مانیں کہ سارے مذاہب اور سب کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔

۲۔ اپنے مذہب اپنے رسم و رواج، اپنی قدروں اور اپنی روایات کو زبردستی دوسروں پر مسلط نہ کریں۔ دوسروں کے عبادت خانوں، مذہبی بزرگوں، کتابوں، روایتوں، تقریبوں اور طور طریقوں کا احترام کریں۔

دوسروں کے مذہب اور مذہبی امور اور شخصیتوں کے احترام کے یہ معنے ہرگز نہیں ہوتے کہ ہم اپنے مذہب

کی باتوں کی تشہیر کریں' نہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم ہر مذہب کو یکساں حق ماننے لگیں' اور کسی کو کسی کے مقابلے میں ترجیح نہ دیں' اور کسی بات کو صحیح اور کسی کو غلط نہ ٹھیرائیں۔ ہر انسان کو اپنی باتوں کو صحیح اور دوسرے کی باتوں کو غلط سمجھنے کا حق حاصل ہے، لیکن کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کی چیزوں کی بے عزتی اور بے حرمتی کرے۔

۳۔ ہمیں ہر انسان کا یہ حق سمجھنا چاہیے کہ وہ کسی مذہب میں یقین رکھنے' یا ایک کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اپنانے میں آزاد اور مختار رہے۔ اس کو اپنے خیالات و نظریات کو عام اخلاقی ضابطوں اور حدود میں رہتے ہوئے ظاہر کرنے اور اس مقصد کے لیے نشر و اشاعت کے سارے ذرائع' پریس اور اخبار استعمال کرنے' کتابیں شائع کرنے' اسکول اور مدرسے قائم کرنے' ہر چیز کا یکساں حق پہنچتا ہے۔

۴۔ آخری بات یہ کہ ہم اپنے مذہب کی عام انسانی قدروں کو نہ بھولیں' ان کو اپنے مذہب کا بنیادی اور اہم حصہ سمجھیں۔ مذہب اور ملت کا فرق کیے بغیر ان کو ہر انسان کے ساتھ برتنا سیکھیں۔ ہر انسان کی خدمت اور محبت کو اپنا دھرم جانیں' اور اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کو بہت بڑا گناہ سمجھیں۔ یہ بات خوب دل میں بٹھالیں کہ کسی ایک انسان کو ناحق ستا کر اس کو جائز حق سے محروم کرکے' اس کی جان' مال' عزت و آبرو کو نقصان پہنچاکر ہم نہ اپنی خدمت کریں گے' نہ اپنے مذہب کی اور نہ اپنے ملک کی۔ حق و انصاف کے خلاف ہمارا ہر قدم انسانی' اخلاقی' مذہبی اور روحانی ہر اعتبار سے غلط ہے اور ہماری نجات کی راہ میں پہاڑ جیسی رکاوٹ۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ہر مذہب کے لوگ ان باتوں کو جو اُن کے اپنے مذہب کی سچی تعلیمات ہیں صدق دل سے اپنالیں' ان پر خود عمل پیرا ہوں اور اپنے بھائیوں کو عمل کرائیں تو ہم ایک اچھا' مضبوط' ترقی یافتہ خوش حال اور بہتر سماج پیدا کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ ان باتوں کے علاوہ ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳)

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ قومی یکجہتی' اتفاق اور اتحاد کی ان ساری باتوں کی پوری تائید کرتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سارے الہامی مذاہب یکساں احترام کے مستحق ہیں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں' شخصیتوں' کتابوں' رسوم اور طریقوں کا احترام کرے۔ کسی معبد کو نقصان پہنچانا' کسی

مذہبی شخصیت کو برا کہنا، کسی دینی کتاب کی بے حرمتی کرنا اسلام کی نظر میں گناہ ہے۔ یہ کام کوئی مسلمان آج کرے یا کسی مسلمان نے تاریخ میں کبھی کیا ہو وہ غلط ہے اور اس کا کرنے والا خطا کار ہے۔ خواہ اس نے جس خیال سے بھی کیا ہو۔ جو کام اسلام کے اصولوں کے خلاف ہو اس کو اسلام کے نام پر کرنا بھی اسلام کی کوئی خدمت نہیں ہے، بلکہ الٹی اس کی رسوائی ہے۔ اس باب میں قرآن وسنت نے واضح حکم دیا ہے اور اسلامی قانون میں صریح دفعات موجود ہیں۔ کسی مسلم بادشاہ کے عمل سے، کسی قاضی کے فیصلے سے، کسی حاکم کے حکم سے، یا کسی مفتی کے فتوے سے اس اصول میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں ہے۔

اسلام ہر انسان کو اختیار وانتخاب کی آزادی دیتا ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے اس کی تبلیغ کرنے، اس کے لیے اسکول کھولنے، پریس اور اخبار استعمال کرنے، کتابیں اور رسالے شائع کرنے کا حق دار سمجھتا ہے، اور کسی کو تبدیلِ مذہب پر مجبور کرنے کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی جائز نہیں۔) یہ قرآن کا حکم ہے۔ اسلام مذاہب کے رسوم اور تقریبات، تنظیموں اور پرسنل لا میں دخل دینے کو صحیح نہیں سمجھتا۔ مسلمان حکمرانوں نے اسلامی تعلیمات کا تقاضا سمجھ کر اپنے ماتحت قوموں کو ان کے مذہبی معاملات میں پوری آزادی دی ہے، ان کے پرسنل لا کی حفاظت کی ہے اور اس کو نافذ کرنے کے لیے ان کے اپنے آدمی مقرر کیے ہیں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے ان کے اپنے جج متعین کیے ہیں یہی طرزِ عمل اسلامی تعلیمات اور اس کی صحیح روایات کے مطابق ہے اس کے خلاف اگر کچھ کہیں ملتا ہے تو وہ غیر اسلامی اور غلط ہے۔

اسلام ہر انسان کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد سمجھتا ہے، سارے انسانوں کو بھائی بھائی اور سب کو برابر قرار دیتا ہے، یہ بات صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر مذہب، ہر ملت، ہر ملک اور ہر طبقے کا انسان ہر دوسرے انسان کا بھائی اور اس کے برابر ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے سب کی جان، سب کی مال، سب کی عزت، سب کا مسلک، سب کا مذہب یکساں احترام کے لائق ہو اور سب کی حفاظت اور سب کا احترام ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسلام ہر ظلم کو ظلم ہی کہتا ہے خواہ وہ کسی کے خلاف ہو یا کسی بھی جذبے سے کیا جائے۔

اسلام ساری انسانیت کو "عیال اللہ" (خدا کی اولاد) کہتا ہے، اور ہر انسان کی خدمت کو خدا کی عبادت قرار دیتا ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اپنے پڑوس، اپنے محلے، اپنے شہر اور اپنے ملک کے لوگوں

کا حق دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بتاتا ہے، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، ایثار و قربانی، احسان اور حسن سلوک خواہ وہ جس انسان کے لیے ہو اسلام کے نزدیک بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے اور خدا کی محبت اور قربت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کی تائید کے لیے قرآن و حدیث سے چند جملے نقل کیے جائیں اور ان پر اس مقالے کو ختم کر دیا جائے۔

آپس میں بدگمانی نہ کرو۔ ایک دوسرے کے معاملات کی کھوج نہ کرو۔ ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اکساؤ، آپس کے حسد اور بغض سے بچو، ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو، اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔ (حدیث)

غیر حق میں اپنی قوم کی حمایت کرنا ایسا ہے جیسے تمہارا اونٹ کنوئیں میں گرنے لگا تو تم بھی اس کی دم پکڑ کر اس کے ساتھ جا گرے۔ (حدیث)

کسی کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دو۔ (حدیث)

دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو (حدیث)

نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ساتھ دو اور بدی اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ (حدیث)

تمہاری دوستی اور دشمنی خدا کی خاطر ہونی چاہیے (حدیث)

تم وہ اچھی امت ہو جسے دنیا والوں کی بھلائی کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ تمہارا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی کو روکنا ہے۔ (قرآن)

دشمن قوم سے انصاف

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ ناانصافی کرو۔ انصاف کرو کہ یہی بات تقویٰ سے قریب تر ہے۔

(قرآن)

حضرت ابوشحمہ ابن عمرؓ کا صحیح واقعہ

مولانا محمد امین اثری مدرسہ لطیفیہ عربیہ علی گڑھ

امیر المومنین فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حق پرستی، انصاف پروری، اجراء حدود الٰہی میں عزیز و بیگانہ کے ساتھ ان کے یکساں برتاؤ کی روشن اور درخشاں حیثیت کو (ان کے فرزند ابوشحمہ) کے متعلق ایک بے بنیاد و بے اصل خود ساختہ واقعہ کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے حالانکہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بے نظیر انصاف پروری اور عدل گستری آپ کے دور خلافت کے طریق کار یہ سب ایسے صحیح اور معتبر تاریخی روایات سے ثابت اور مشہور ہیں کہ ان کے بعد اس قسم کے گھڑے ہوئے قصوں کے ذریعے ان کی انصاف پروری اور دینی صلابت کو اجاگر کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ حضرت ابوشحمہ کے متعلق قصہ، داستان گو واعظین، غیر محتاط صوفیا اور غیر محقق واقعہ نگاروں کی رنگ آمیزیوں کا رہین منت ہے۔ اصل حقیقت کچھ اور ہے جو ان کی رنگ آمیزیوں میں گم ہو کر رہ گئی اور حضرت ابوشحمہ کا پاک دامن، غلط کاری کے مکروہ و معیوب دھبوں سے داغدار ہو گیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض مصنفین نے ایک ایسے واقعہ کو جس کا تعلق برگزیدہ مقدس ہستیوں سے ہے تاریخ اور اصول روایت کے مطابق چھان بین کیے بغیر شائع کر دیا۔

اس واقعہ کے متعلق ماہرین فن اور معتبر و مستند مورخین کی تصریحات درج کی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو اصل واقعہ معلوم ہو جائے اور یہ حقیقت ان کے ذہن نشین ہو جائے کہ ابوشحمہ کا دامن معصیت کے داغ سے پاک و صاف ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے اپنی مشہور کتاب اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ میں اس قصہ کو مختصر اور مطول دو طرح سے ذکر کیا ہے۔ مختصر واقعہ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ پچاس کوڑے خود حضرت

عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے مارے اور پچاس کوڑے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے۔ سیوطیؒ نے اس واقعہ کے متعلق اپنا تحقیقی فیصلہ اور تحقیق مبارک یوں تحریر فرمایا ہے۔

موضوع وضعه القصاص و في الاسناد من هو مجهول

یہ واقعہ سرتاپا بے اصل و بے بنیاد گھڑا ہوا ہے جسے داستان گو واعظین نے بنا اور گھڑ لیا ہے سلسلہ سند میں نامعلوم اشخاص موجود ہیں۔

اور مطول قصے کے بعد لکھتے ہیں۔

موضوع فيه مجاهيل قال الدارقطني حديث مجاهد عن ابن عباس في حديث ابي شحمة ليس بصحيح وروي من طريق عبد القدوس بن الحجاج عن صفوان عن عمر وعبد القدوس كذاب يضع وصفوان بينه وبين عمر رجال

یہ گھڑی ہوئی اور بالکل بے سند بات ہے سلسلۂ سند میں کئی نامعلوم افراد ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ مجاہد کی وہ حدیث جو ابن عباس سے ابوشحمہ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے صحیح نہیں ہے عبدالقدوس بن حجاج سے بھی یہ قصہ مروی ہے لیکن یہ عبدالقدوس جھوٹا اور کذاب ہے۔ حدیثیں خود اپنی طرف سے بنا بنا کر بیان کرتا تھا اور اس کے اوپر راوی صفوان اور عمر کے درمیان سلسلہ سند منقطع ہے۔

علامہ محمد طاہر تذکرۃ الموضوعات صنشا میں لکھتے ہیں:۔

حديث ابي شحمة لعمر رضي الله عنه وزناه واقامة عمر عليه الحد وموته بطول لا يصح بل وضعه القصاص انتهى وهكذا في

ابوشحمہ ابن عمرؓ کا واقعہ زنا، ان پر حد جاری کرنا اور اس کی وجہ سے ان کی موت یہ پورا قصہ غلط ہے اور گھڑا ہوا ہے

ابن سعد، ابن الجوزی وغیرہم کی تصریحات کے مطابق واقعہ اس قدر ہے کہ ابوشحمہ رضی اللہ عنہ

اصل واقعہ مصر میں جہاد کی غرض سے تشریف فرما تھے۔ عرب میں نبیذ استعمال کرنے کا عام دستور تھا کھجور یا کشمش شام کو پانی میں بھگو دیتے۔ صبح تک پانی میٹھا ہو کر شربت تیار ہو جاتا۔ صبح کے ناشتے یا کھانے کے ساتھ اس شربت کو استعمال کرتے۔ اسی طرح صبح کو بھگو دیتے اور شام کو کھانے کے ساتھ یہ شربت پیتے

اس شربت کو جس میں نہ کوئی خاص بو پیدا ہوتی اور نہ ذرہ بھر نشہ، نبیذ کہا جاتا ہے جس کا استعمال باتفاق علماء جائز اور مباح ہے۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے استعمال فرماتے تھے۔ (ابو داؤد ص ۱۶۶ ج ۲ بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) نشہ کا شبہہ اور گمان ہو جانے کے بعد جس کی خاص ظاہری علامتیں ہیں نبیذ کا پینا حرام اور ممنوع ہے۔

حضرت ابو شحمہ رضؓ جو نہایت متورع اور متدین شخص تھے سنت نبوی کے مطابق نبیذ استعمال فرماتے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اس اطمینان کے بعد کہ نبیذ میں سکر (نشہ) کا اثر نہیں آیا ہے انھوں نے نبیذ استعمال کی کچھ دیر کے بعد انھیں نشہ کا معمولی اثر محسوس ہوا۔ شرعاً انھوں نے کوئی تقصیر نہیں کی تھی اس لیے ملامت یا تعزیر و حد کے مستوجب قطعاً نہ تھے، نہ دیانۃً اور نہ قضاءً لیکن غلبۂ خوف الٰہی اور غایت ورع وخشیت الٰہی کی وجہ سے انھوں نے اپنے کو قصور وار سمجھا محض اس لیے کہ اس معاملے میں حسب غایت درجہ احتیاط و اطمینان کی ضرورت تھی اس سے انھوں نے کام نہ لیا۔ بہرکیف وہ حضرت عمرو بن العاص (فاتح مصر، گورنر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ مجھ پر حد شرعی جاری کی جائے۔ گورنر نے انہیں شرعی حکم سمجھاتے ہوئے حد جاری کرنے سے انکار کر دیا لیکن ان کا دل مطمئن نہیں ہوا اور عرض کی کہ حد جاری کیجیے ورنہ دربار خلافت میں رپورٹ کر دوں گا کہ عمرو بن العاص حدود الٰہی کے جاری کرنے میں کمزور اور سست ہیں۔ فاروق اعظم کی جلالت اور تصلب فی الدین کا نقشہ سامنے آ گیا۔ ابو شحمہ پر ان کے اطمینان قلب کے لیے حد جاری کر دی لیکن قصر حکومت میں جہاں عام مجمع نہ تھا۔ واقعہ نگاروں نے واقعہ کی اطلاع دربار خلافت میں کر دی۔ امیر المومنین نے گورنر مصر کو ملامت آمیز خط لکھا کہ میرے بیٹے ابو شحمہ کے ساتھ اجراء حدود الٰہی میں عام مسلمانوں جیسا برتاؤ کیوں نہیں کیا گیا۔ یعنی عبرت کے لیے عام مجمع میں کیوں نہ حد جاری کی گئی۔ پھر جب ابو شحمہ مدینے پہنچے تو خلیفہ وقت نے عام مجمع میں ابو شحمہ کو بے احتیاطی کرنے پر تنبیہاً سزا دی جیسے باپ بیٹے کو اس کے کسی قصور پر سزا دیا کرتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ابو شحمہ اتفاقی طور پر بیمار پڑتے ہیں اور اسی بیماری میں انتقال کر جاتے ہیں۔

یہ ہے اصل واقعہ جس کو داستان گو واعظین نے کچھ کا کچھ بنا دیا۔

علامہ سیوطی اللآلی المصنوعہ میں لکھتے ہیں۔

"زبیر بن بکار اور ابن سعد نے طبقات میں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی قول ہے کہ عبد الرحمٰن الاوسط جن کی کنیت ابو شحمہ تھی مصر میں مجاہد اور غازی کی حیثیت سے تھے، ایک رات کو نبیذ پی لی جس سے کچھ نشہ

محسوس کیا اس وقت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ مجھ پر حد لگائیے۔ (چونکہ شرعی نقطۂ نظر سے حد کے سزاوار نہ تھے اس لیے) عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اقامت حد سے انکار کیا لیکن ابوشحمہ اپنے اوپر حد لگوانے کے لیے اڑے رہے اور کہا کہ اگر آپ اس سے گریز فرمائیں گے تو میں اپنے باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آپ کے وہاں پہنچنے پر اس کی شکایت کر دوں گا۔ الغرض عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ابوشحمہ کے (اصرار سے) قصر حکومت کے اندر ان پر حد قائم کی جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص کو ملامت آمیز لہجہ میں تحریر فرمایا کہ جس طرح عام مسلمین پر حدیں جاری کی جاتی ہیں۔ اس طرح ابوشحمہ پر بھی حد کیوں نہ قائم کی گئی؟ پھر جب ابوشحمہ واپس (مدینہ) آئے تو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (تادیبی طور پر) جسمانی سزا دی اس کے بعد اتفاقی طور پر عبدالرحمٰن بیمار ہوئے اور یہی علالت ان کی وفات کا باعث بنی وہکذا فی فوائد المجموعہ ص۶۹ وتذکرۃ الموضوعات ص۱۸۱ وخاتمہ مجمع البحار ص۵۱۸ ج۳ واسد الغابۃ ص۲۱۳ ج۳ الاستیعاب لابن عبدالبر ص۳۹۴ ج۲

جمہوریہ چاڈ

(جناب بشیر حسین جعفری)

بے شک تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ مغربی اقوام نے سترھویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی کے اواخر تک براعظم افریقہ ایشیا کے بیسیوں ممالک کو تباہ کیا۔ ان کی آزادی چھینی۔ انہیں غلام بنایا۔ ان ممالک سے دولت اکٹھی کر کے پیرس، لندن، برلن اور روم کے شہرۂ آفاق شہروں کو ترقی دی لیکن یہ سب کچھ جنگ عظیم دوم کی نذر ہو گیا۔ دولت بھی نہ رہی، شہر بھی کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے اور جنگ کے خاتمہ پر افریقہ اور ایشیا کے ان ممالک نے باری باری آزادی حاصل کر لی۔ چاڈ بھی ایک ایسا ملک ہے جو مدت تک فرانسیسیوں کے قبضے میں رہا ہے اور آج سے ۸ برس قبل آزادی کی دولت سے ہم کنار ہوا لیکن یہاں ابھی اقتصادی اور سیاسی آزادی نہیں ہے۔ اب بھی فرانس یہاں بلاواسطہ موجود ہے۔ گزشتہ ۲۰ برس کی مدت میں آزاد ہونے والے اسلامی ممالک کی تعداد تین درجن کے قریب ہے لیکن ان ممالک کی اقتصادی بدحالی نے آزادی کی نعمت کا بھرپور فائدہ نہیں اٹھانے دیا۔ چاڈ میں ۹۵ فی صد مسلمان آباد ہیں اس لیے ہم اسے اسلامی ملک سمجھتے ہیں۔

محل وقوع ملک کا رقبہ ۴ لاکھ ۹۵ ہزار ۸ سو مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۶۵ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۲ لاکھ ہے۔ چاڈ کے شمال میں لیبیا، جنوب میں سنٹرل افریقن ری پبلک، مشرق میں سوڈان اور مغرب میں کیمرون، نائیجیریا اور نائیجر ہیں۔ اس ملک کی سرحدیں چھ ممالک سے ملتی ہیں۔ ملک کا دارالحکومت فورٹ لیمی ہے۔ ۲۲ اپریل ۱۸۹۰ء تک اس جگہ کا نام دیکوا تھا۔ فرانسیسی جنرل لیمی اپریل ۹۰ء میں یہاں لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اور اسی نسبت سے اس جگہ کا نام فورٹ لیمی پڑ گیا۔ اب آزادی کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ فورٹ لیمی کا نام بدل کر ربیع رکھا جائے کیونکہ ربیع نے اپنے ملک کی حفاظت میں لڑتے ہوئے

جہاں جبرل لیمی کو ہلاک کیا وہاں خود بھی شہید ہو گیا۔ اب یہ سوال غور طلب ہو کہ استعماری طاقتوں کے نشانات مٹائے جائیں یا نہیں؟

فورٹ لیمی کی آبادی ایک لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ دوسرے مشہور شہروں میں فورٹ آرکمبلٹ، مانڈو اور ابیچ شامل ہیں۔ زیادہ لوگ دور دراز دیہات میں رہتے ہیں اور ملک اس قدر وسیع ہے کہ ۵ مربع میل میں اوسطاً ایک آدمی آباد ہے۔ ۵ فی صد عیسائی اور ماندہنگ آباد ہیں۔ فرانسیسی اگرچہ سرکاری زبان ہو لیکن اکثر لوگ عربی بولتے ہیں۔ دوسری جو علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں شاری، وادین اور شاریان قابل ذکر ہیں۔

چاڈ میں جو قبائل آباد ہیں یہ میگرو اور عربی نسل سے ہیں۔ عربوں کے حوسا، ودائی، بیول اور کینبی بان قبیلوں کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ جبکہ غیر مسلموں کا تعلق سارین ماسا اور ہوہنڈنگ کے میگرو قبائل سے ہے۔ مسلمان شمالی علاقوں میں اکثریت میں ہیں۔ جبکہ عیسائی وغیرہ جنوب مغرب میں نسبتاً زیادہ ہیں۔

جغرافیائی پس منظر اس وسیع ملک کو جغرافیائی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جنوب مغربی علاقے میں "شاری" دریا بہتا ہے، خاصا زرخیز ہے اور یہاں آبادی بھی زیادہ ہے۔ اس علاقے میں پھل دار درخت اور پتے دار جھاڑیاں ہیں۔ سبزہ خوش نظر منظر پیش کرتا ہو اور شمال کا علاقہ صحرا ہے۔ جہاں زیادہ مسلمان آباد ہیں اور کوئی ۵ ہزار خانہ بدوش بھی اپنے ریوڑوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ شمالی علاقہ میں میلوں فاصلے طے کر جائیے کہیں ایک گھر آباد ہو گا۔ زیادہ علاقہ صحرائی ہے۔ ملک سے تین دریا گذرتے ہیں ـــ "شاری" بحر الغزل اور "لون گون" ـــ یہ تینوں دریا ملک میں زراعت کی ترقی کا سبب ہیں۔ دریائے شاری میں اگست سے دسمبر تک جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ یہ دریا سنٹرل افریقن ری پبلک سے نکلتے ہیں۔ بحر الغزل کی لمبائی ... میل ہے لیکن جہاز رانی کے قابل نہیں ہو

جھیل چاڈ اس ملک کا نام جھیل چاڈ کے نام پر پڑا ہے۔ جھیل چاڈ ملک کے مغربی سرحد کے قریب دس ہزار مربع میل رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے اور پورے براعظم افریقہ میں اتنی وسیع جھیل اور کوئی نہیں ہے جب بارشوں کا موسم نہ ہو تو جھیل نسبتاً سکڑ جاتی ہے

اس جھیل کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہو کہ میلوں میں پھیلی ہوئی ہونے کے باوجود اس کی گہرائی ۳-۴ فٹ سے زیادہ نہیں ہے اور اس لحاظ سے یہاں نہ جہاز رانی ہو سکتی ہے، نہ کشتیاں بے خوف و خطر چلائی جا سکتی

ہیں ۔ دریائے شاری اور لوگون اسی جھیل سے نکلتے ہیں ۔

آب و ہوا کے لحاظ سے چڈ کو تین خطوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ فورٹ آرکمبیٹ کے جنگلات کا علاقہ جو گرم مرطوب ہے فورٹ لیمی اور ینگور کا خطہ ۔ جو خشک اور گرم ہے اور شمالی صحرائی علاقہ جہاں انتہائی شدید گرمی پڑتی ہے اور سبزہ کہیں نظر نہیں آتا جو جھاڑیاں اگتی ہیں وہ بھی پتوں سے محروم دکھائی دیتی ہیں ۔ یہاں کی زندگی سخت تکلیف دہ ہے اور خانہ بدوش قبائل زیادہ تر اسی علاقے میں رہتے ہیں سال کے دو نمایاں موسم ہیں سخت گرم اور موسم برسات ۔ فورٹ لیمی کے خطے میں بارش کی سالانہ

. . . .

. . ۵ فٹ سے پانچ ہزار فٹ تک تدریجی بلندی ہے ۔ شمال میں تیبستی کا آتش فشاں پہاڑ ہے جس کی بلندی دس ہزار فٹ ہے ۔ جنوب میں گوتری کا پہاڑی سلسلہ ہے جس کی اوسطا اونچائی ساڑھے ۵ ہزار فٹ ہے اور یہ سلسلہ ملک کی جنوبی سرحد کا کام بھی دیتا ہے ۔

اس ملک کو دور قدیم میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے مشرقی ممالک سے براعظم افریقہ کی تجارت اسی راستے سے ہوتی رہی ہے ۔ جھیل چڈ کے کناروں پر ہزاروں اور لاکھوں کارواں اترے اور ٹھہرے ۔ یہ سلسلہ صدیوں سے قائم رہا ہے اس ملک کی سرحدیں چھ ممالک سے ملتی ہیں اس لیے تجارت کے لیے اسی ملک سے گزرنا پڑتا رہا ہے ۔ اس لحاظ سے براعظم افریقہ میں چڈ کے دور عروج کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔

تاریخی پس منظر

پرانے دور میں نائیجر اور دریائے نیل کے درمیانی علاقے میں کئی مشہور حکمران گذرے ہیں اور یہ علاقہ معلوم دنیا کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ جھیل چڈ کے سبب اس ملک کی شہرت براعظم افریقہ سے نکل کر دوسرے ممالک میں پہنچ گئی تھی جو مشہور سلطنتیں یہاں قائم ہوئیں ان میں سلطنت وادائی اور بیگرمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔

اسلام کا آفتاب طلوع ہوتا ہے

غار حرا سے جو روشنی پھوٹی اس سے نہ صرف مکہ اور مدینہ روشن ہوئے بلکہ تھوڑی مدت میں یہ روشنی چار سو پھیل گئی ۔ چڈ پر کسی اسلامی لشکر نے حملہ نہیں کیا تھا بلکہ اسلام آہستہ آہستہ پھیلتا یہاں پہنچ گیا اور ۱۱۹۰ء میں جب چڈ میں نیگرو قبیلہ ام جس کا دارالحکومت کینم تھا ۔ ایک مقامی مسلمان سردار نے اس پر فتح پائی اور اس طرح یہاں مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہوا ۔ اور اسی سردار کے خاندان نے بعد میں بورنو سلطنت کی بنیاد رکھی ۔ سولھویں صدی میں اسلام

کے پیر وجھیل چاڈ کے علاقہ تک قبضہ کر چکے تھے۔ سترھویں صدی کے اوائل میں یہاں مسلمانوں کی ایک اور حکومت قائم ہوئی جو "بیگرمی" کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ اس کا پہلا فرماں روا محمد عبداللہ تھا۔ اسی دوران یہاں کے ایک مسلمان جن کا نام صالح تھا، تبلیغ کے لیے نکلے اور قرب وجوار کے علاقوں میں اسلام پھیلایا۔ اس کے بعد ربیع زبیری کے دورِ حکومت میں جو انیسویں صدی کے اواخر تک قائم رہا۔ اسلام کی تبلیغ و تعلیم جاری رہی اور دور دراز تک لوگ مسلمان ہو گئے۔

فرانسیسیوں کی آمد

انیسویں صدی میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی وغیرہ براعظم افریقہ میں اپنے ناپاک قدم مضبوط کر چکے تھے۔ مشرقی افریقہ کے ساحلی ممالک پر قبضہ جما لینے کے بعد فرانسیسیوں نے جھیل چاڈ کے خوب صورت اور زرخیز حصے پر نظریں جمالیں۔ ان دنوں چاڈ میں مسلمانوں کی چار حکومتیں تھیں۔ جو کینیم، بورکو، وادی اور بیگرمی کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ یہ چھوٹی حکومتیں ربیع زبیری کے ماتحت تھیں جو بذات خود المہدی سوڈانی سے متاثر تھا اور اس کے ساتھ بھی "درویشوں" کا ایک لشکر جرار تھا۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۷ء کے دوران فرانسیسیوں نے ایمل جینٹل کی وساطت سے چاڈ کے حکمرانوں سے معاہدے کرنے کی ابتدا کی جیسا کہ ان مغربی طاقتوں کا طریقہ واردات رہا ہے۔ یہ لوگ بڑے مہذب تاجر، خوش اخلاق بن کر دوسرے ممالک میں گھسے اور پھر وہاں قبضہ کر کے بربریت کا مظاہرہ کیا۔ چاڈ کے ایک حکمران اور مرد غازی ربیع زبیری نے فرانس سے مصالحت کو ٹھکرا کر آزادی کی موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دینے کا اعلان کر دیا۔ فرانسیسیوں کا ایک بھاری لشکر ربیع زبیری کے خلاف چاڈ میں جنگ لڑنے گھس آیا لیکن اس کا مقابلہ ربیع سے تھا جو آزادی کی موت کو ابدی زندگی سمجھتا تھا۔ چنانچہ ربیع نے اس لشکر جرار کو ۱۸۹۹ء میں شکست فاش دی۔ اس پر فرانس کی حکومت سیخ پا ہو گئی۔ چنانچہ فرانس نے ایک اور فوج تیار کی جو ربیع زبیری کا مقابلہ کر سکے۔ اگلے سال یعنی اپریل ۱۹۰۰ء میں فرانس کی تازہ دم فوج چاڈ میں آگئی اور کوسری کے مقام پر سخت معرکے ہوئے۔ زبیری کے درویشوں نے نہایت پامردی سے فرانسیسی فوج کا مقابلہ کیا اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک ان کی روح اور جسم کا ساتھ رہا۔ فرانس کی فوجی طاقت کئی گنا زیادہ تھی اور مقامی کئی عیسائی قبائل بھی فرانس سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ اس لیے ربیع زبیری کو بالآخر شکست ہو گئی۔ لیکن ربیع نے شکست کھانے سے پہلے فرانسیسی فوج کے جرنل لیمی کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر کے تاریخ میں اپنا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رکھا اور دوسرے مسلمانوں کے لیے مثال قائم کر گیا۔ چاڈ میں جرنل لیمی کا جو حشر ہوا، سوڈان میں برطانوی جرنل گارڈن کا المہدی سوڈانی کے ہاتھوں بھی ایسا

ہی انجام دیکھنا پڑا۔ ربیع زبیری آخری دم تک لڑتا ہوا شہید ہوگیا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مرد غازی شہید زبیری کی شہادت کے بعد یکم مئی ۱۹۰۰ء کو فرانسیسیوں نے دکیار پر قبضہ کیا جو اس حکومت تھا اور دیکوار کا نام بدل کر فورٹ لیمی رکھا گیا۔

جس طرح سلطان حیدر علی کا بیٹا سلطان ٹیپو (شہید) بہادر نکلا تھا۔ اسی طرح ربیع زبیری کا لخت جگر فضل اللہ بھی مرد میدان نکلا۔ اس نے اپنے بچے کھچے ساتھیوں کو اکٹھا کیا ان کو آزادی شمع کے پروانے بنایا اور دوبارہ فورٹ لیمی پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کا مقابلہ فرانسیسیوں نے بڑی ہمت اور طاقت سے کیا۔ لیکن جو لوگ اپنی زندگی خدا کے سپرد کر آئے تھے وہ کس طرح ناکام رہتے۔ فضل اللہ نے دوبارہ فورٹ لیمی فتح کرکے اسلامی جھنڈا لہرا دیا۔ اس پر فرانس کی حکومت کو بے حد تشویش ہوئی۔ اس نے پوری فوج ڈیا میدان میں جھونک دی اور فضل اللہ سے فورٹ لیمی چھین لیا۔ اس کے بعد فضل اللہ کے ساتھیوں سے کوئی دس برس تک فرانسیسی لڑائیاں لڑتے رہے۔ بالآخر ۱۹۱۲ء میں پورے چاڈ پر فرانس کا قبضہ ہوگیا۔

فرانس نے ۱۹۱۳ء میں چاڈ کو پہلا کمشنر جنرل مقرر کیا اور اس ملک کو اپنی نوآبادی بنا لیا۔ جنگ عظیم اول میں چاڈ کو بھی شرکت کرنا پڑی۔ جنگ عظیم دوم میں چاڈ اتحادی فوجوں کا کیمپ رہا۔ اور یہاں سے مشرقی افریقہ میں لڑنے والی اتحادی فوجوں کے لیے سپلائی جاری رہی۔ بحر روم کی جنگ لڑنے کے لیے بھی چاڈ ہی کو اتحادیوں نے اپنی دوسری دفاعی لائن قرار دیا تھا۔ لیبیا میں اگر اتحادی پسپا ہو جاتے تو چاڈ میں معرکے لڑنا پڑتے۔ تیونس، فزان اور موری تانیہ میں فرانس کی جن فوجوں نے جنگ لڑی ان کے ہیڈکوارٹرز چاڈ ہی میں تھے۔ ۱۹۴۴ء میں فرانسیسیوں نے چاڈ کو بیرون سمندر نوآبادی قرار دیا۔

آزادی کی طرف

۱۴ اپریل ۱۹۵۷ء کو فرانس نے ۲۳ جون ۱۹۵۶ء کے چارٹر پر عمل کرتے ہوئے استوائی افریقہ کو آزادی دینے کے لیے حالات سازگار کیے اور اس طرح چاڈ کو اندرونی طور پر ذرا سی آزادی ملی۔ اور ملک کی سیاست ابھرنے لگی۔ سیاسی جماعتیں معرض وجود میں آئیں اور حقوق کا سوال پیدا ہونے لگا۔

۲۶ نومبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں انتخابات ہوئے اور اسمبلی قائم ہوئی۔ ملک کو آزادی تو مل رہی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اقتدار کس کو سونپا جائے۔ برطانیہ نے جس طرح ہندوستان کو آزاد کرتے وقت ہندؤں

اور مسلمانوں کے درمیان گڑبڑ کروائی تھی۔ اسی طرح چاڈ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے حقوق کا خیال رکھا اور مسلمانوں کی اکثریت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

مئی ۱۹۵۹ء کو دوبارہ انتخابات ہوئے اور نئی قانون ساز اسمبلی معرض وجود میں آئی۔ اس انتخاب میں تمام بالغوں نے ووٹ کا استعمال کیا۔ چنانچہ ۱۱ راگست ۱۹۶۰ء کو چاڈ نے اپنی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ البتہ اس کو اپنی اقتصادی اور فوجی ضرورتوں کے لیے ابھی فرانس کی مسلسل امداد کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت اب تک قائم ہے۔ اگرچہ ملک کو آزاد ہوئے آٹھ برس کی مدت گزر چکی ہے۔ آزادی کے بعد ایم فرانکو تمبال بئی نے ملک کے صدر اور وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ جس طرح نائیجیریا میں حکمران پارٹی کا توازن عیسائیوں اور مسلمانوں میں ڈول رہا ہے یہی حال چاڈ میں ہے۔ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن حکومت میں عیسائیوں کا عمل دخل زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعت پارٹی نیشنل افریقن (بامخفف پی۔ این۔ اے) ہے اور اسمبلی میں اس کی تیرہ نشستیں ہیں۔ کچھ مدت سے پی' این' اے اور پارٹی پراگرسسٹ چیڈین (پی۔ پی۔ ٹی) کا آپس میں اتفاق ہوگیا ہے اور اسمبلی کی ۸۵ نشستوں میں سے ۷۷ ان کے پاس ہیں۔ یہاں کے اسلام پسندوں نے سوڈان میں "خانہ بدر حکومت" قائم کی تھی لیکن ناکام رہی ہے سوڈان کی حکومت نے اعلان کردیا ہے کہ وہ چاڈ کے خلاف کسی مذہبی یا سیاسی تنظیم کی امداد نہیں کرے گا اس اعلان کے بعد چاڈ اور سوڈان کے تعلقات خوش گوار ہوگئے ہیں۔ صدر حکومت نے ۱۹۶۳ء میں متعدد مسلم وزراء کو الگ کردیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی چاڈ کے مسلمان حکومت سے نفرت کرنے لگے۔ چنانچہ ۲۲ر مارچ ۶۳ء کو صدر نے اسمبلی توڑ دی اور ہنگامی حالات کا اعلان کیا۔ اس طرح ملک میں بدامنی پھیل گئی اور دارالحکومت میں دو درجن کے قریب آدمی لڑائی میں مارے گئے۔ سینکڑوں گرفتار ہوئے۔ اس گڑبڑ کی ذمہ داری مسلمان وہاں کے صدر کے سر تھوپتے ہیں اور عیسائی صدر کا خیال ہے کہ وہ اس کے وفادار نہیں ہیں۔

۱۹ر اپریل ۶۶ء کو صدر نے جو دوبارہ وزارت قائم کی تو اس میں اس نے وزارت دفاع اور وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ بھی اپنے ہی پاس رکھ لی اور اس طرح وہاں کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق پامال ہورہے ہیں۔ حالانکہ آبادی کے لحاظ سے یہ ملک اسلامی ہے اور صرف ۵ فی صد عیسائی حکمراں بنے بیٹھے ہیں اور مسلمانوں کو برائے نام حکومت میں جگہ دے رکھی ہے۔

اقتصادی حالت چاڈ کے وسیع علاقے میں بے شمار معدنی دولت ہے اور جھیل چاڈ کے علاوہ تین دریا بہتے ہیں۔ ان وسائل سے فائدہ اٹھا کر اتنا اناج پیدا کیا جا سکتا ہے کہ درجنوں ممالک کی خوراک کا کام دے لیکن وسائل کی اس قدر کمی ہے کہ کوئی پروگرام شروع نہیں ہو سکا۔ زراعت اور مویشی پالنا یہاں کے لوگوں کا عام پیشہ ہے۔ تیسرے نمبر پر ماہی گیری ہے لیکن ملک کی دولت اتنی نہیں ہے کہ کوئی تعمیری یا ترقیاتی کام کیا جا سکے۔ یہاں کی روئی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جو ملک کے لیے زرمبادلہ کماتی ہے۔ اچھی قسم کی ایک لاکھ ٹن روئی سالانہ پیدا ہوتی ہے۔ فرانس اس کا بڑا خریدار ہے یہاں چاول، چقندر، کھجور وغیرہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر جدید آلات کشاورزی اور جدید طریقہ زراعت سے کام لیا جائے تو پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن یہاں تو نہریں ہیں اور نہ ہی کوئی بند تعمیر ہو سکا۔ دس لاکھ سے زیادہ مویشی موجود ہیں اور پانچ لاکھ کے قریب بھیڑ بکریاں پائی جاتی ہیں شمالی علاقوں کے خانہ بدوش قبائل لمبے بالوں والی بھیڑ بکریاں پالتے ہیں اور ملک کو روئی چمڑے، اون، پھل اور مچھلی پر زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ دس ہزار افراد جھیل چاڈ سے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔

(المنبر لائل پور)

شب قدر

شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ (قرآن)

جس شخص نے ایمان و احتساب کے ساتھ شب قدر جاگ کر بسر کی اس کے اگلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ (حدیث)

"ایمان و احتساب کے ساتھ قیام شب قدر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اجر و ثواب پر کامل یقین، اس کی تصدیق اور رضائے الٰہی کے حصول و طلب اجر کی نیت سے پوری رات اللہ کی عبادت میں بسر کی جائے۔

شب قدر کو رمضان کے اخیر عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ (حدیث)

۲۱-۲۳-۲۵-۲۷-۲۹۔ یعنی ۲۰ دن گزار کر اکیسویں رات اور اسی طرح پانچ راتیں اخیر عشرے کی طاق راتیں ہوں گی۔

رمضان آنے کے بعد ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پاس رمضان آگیا ہے اور اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے تو جو شخص اس رات کے خیر و برکت سے محروم رہ گیا وہ بڑا محروم ہے۔ (حدیث)

رسائل و مسائل

ایک گزارش

بہت سے لوگ دفتر زندگی کو دریافت مسائل کے لیے خطوط لکھتے اور ساتھ ہی ساتھ ٹکٹ یا لفافے یا پوسٹ کارڈ بھی بھیجتے ہیں تاکہ ان کو فوراً یا جلد سے جلد جواب بھیجا جائے ایسے تمام حضرات کی آگاہی کے لیے عرض ہے کہ دفتر زندگی میں کوئی دارالافتا قائم نہیں ہے اور نہ اس کام کے لیے الگ سے کوئی شخص مقرر ہے اس لیے اگر جلد اور فوری جواب کی ضرورت ہو تو یہاں ہرگز خط نہ لکھیے ورنہ آپ کے پیسے ضائع ہوں گے۔ یہ کام مدیر زندگی ہی کو کرنا پڑتا ہے اور وہ بسا اوقات خواہش اور کوشش کے باوجود جواب جلد نہیں بھیج سکتا۔ یہاں ایسے سوالات آنے چاہئیں جن کے جواب کی فوری ضرورت نہ ہو۔ سوالات کے جوابات رسائل و مسائل میں شائع کر دیے جائیں گے۔ (ادارہ)

سحر و ساحری اور چند دوسرے مسائل

خط

(۱) بعض افراد جب نامعلوم اسباب کی وجہ سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز حرکتیں کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ اس پر شیطان اور جن وغیرہ کا سایہ ہو گیا ہے اسی طرح بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص پر فلاں بزرگ کی روح مسلط ہو جاتی ہے۔ میں اس کی بالکل قائل نہیں ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وخیرہم کے زمانہ میں ہمیں اس طرح کی چیزیں نہیں ملتی ہیں۔ آپ بتائیے

کہ اس کا کہیں ثبوت ہے؟ کیا ہماری رہنمائی کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول کافی نہیں ہیں؟

(۲) جادو کے بارے میں بھی لوگ بہت کچھ کہتے ہیں۔ بتائیے کہ جادو کی کوئی حقیقت ہے؟

(۳) کیا رسول اکرمؐ پر جادو کیا گیا تھا اور کیا معوذتین اسی موقع پر نازل ہوئی تھیں؟

(۴) تعویذ گنڈے کا بھی ایک جال پھیلا ہوا ہے اور یہ بھی ایک بڑا کاروبار بن گیا ہے کیا اس کا کوئی ثبوت ہے؟

جواب

ان چار سوالات کے جواب سے پہلے مناسب ہے کہ تین باتیں واضح کر دی جائیں۔ ایک یہ کہ مسلمان کے لیے اصل دلیل، اللہ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہے جیسا کہ آپ نے خود لکھا ہے "کیا ہماری رہنمائی کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول کافی نہیں ہیں؟" بے شک کتاب و سنت ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں جو باتیں ان سے ثابت ہوں گی وہی صحیح ہوں گی اور جو ان دونوں سے الگ اور ان کے خلاف ہوں گی وہ غلط ہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ ایک سوال کسی چیز کے وجود کا ہے یعنی یہ کہ وہ حقیقت میں موجود بھی ہے یا نہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ مسلمان کو اس چیز کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ تیسری بات یہ واضح کرنی ہے کہ کسی شخص کو جو نفع یا نقصان بھی پہنچتا ہے وہ اللہ کی مشیت سے پہنچتا ہے وہ نہ چاہے تو کوئی چیز نہ کسی کو نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان۔ نفع و ضرر کا اصل اختیار اسی کے دست قدرت و حکمت میں ہے۔

ان تین باتوں کو سامنے رکھ کر اپنے ہر سوال کے بارے میں میرا جواب پڑھیے۔

(۱) آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن یا صحیح احادیث میں ہمیں اس چیز کا ثبوت نہیں ملتا جس کو لوگ شیطان، جن اور بھوت پریت کا سایہ کہتے ہیں۔ البتہ لوگ اس کے بارے میں اپنے مشاہدات و تجربات بیان کرتے ہیں۔ شیطان کا وجود بھی ہے اور جنات کی بھی ایک مستقل مخلوق موجود ہے۔ ان میں بھی اچھے اور برے ہر طرح کے جن ہوتے ہیں۔ اسی طرح روحیں بھی اچھی اور بری ہوتی ہیں لیکن یہ بات کہ شیطان یا جن یا بری روح انسان پر مسلط ہو کر اس کو اپنا معمول و محکوم بنا لیتی ہے قرآن اور احادیث سے ثابت نہیں ہے۔ اگر اس طرح کی کوئی بات پیش آئے تو اصل سوال یہ ہے کہ مسلمان کو اس کے دفعیہ کے لیے کیا تدبیر اختیار کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں سب سے پہلے اس کی تحقیق کرنی چاہیے کہ کہیں یہ کوئی

بیماری یا جعل سازی تو نہیں ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ نہ بیماری ہے نہ جعل سازی تو پھر اس کے دفعیہ کے لیے جائز تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ پیشہ ور عاملوں کے چکر میں پھنس کر کوئی ایسی تدبیر نہ کرنا چاہیے جو شرعاً ناجائز ہو۔

کسی بزرگ کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی روح کسی انسان پر مسلط ہو کر اس کو اذیت پہنچاتی ہے اس بزرگ کی سخت توہین ہے کسی پاک روح کا یہ کام نہیں ہو سکتا۔

(۲) آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سحر اور جادو کی مطلق نفی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ساحروں کے مقابلے کا ذکر قرآن میں کئی جگہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ البقرہ آیت ۱۰۲ میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہودیوں نے توریت پر عمل ترک کر کے شیاطین کے سکھائے ہوئے سفلی علوم کی پیروی شروع کر دی تھی جن میں ایک سحر و ساحری کا علم بھی تھا۔ جادو کی کئی اقسام ہیں۔ ان میں ایک قسم یہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی انسان کو جسمانی امراض و آلام میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے وجود یا اس کی حقیقت کا انکار صحیح نہیں ہے۔ ہمارے جاننے کی اصل بات یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں جادو کا حکم کیا ہے اور یہ کہ کسی مسلمان پر جادو کیا گیا ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اسلامی شریعت میں اس علم کا سیکھنا سکھانا اور کسی پر جادو کرنا حرام ہے اور یہ ایک ایسی معصیت ہے جو انسان کو کفر تک پہنچا سکتی ہے ـــــ اگر تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا ہو کہ کسی پر جادو کیا گیا ہے تو خود اس مریض کو اور اس کے رشتہ داروں کو اس کے دفعیہ اور علاج کے لیے نہ پیشہ ور عاملوں کے پاس جانا چاہیے اور نہ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہیے جو شریعت میں ناجائز ہو بلکہ اس کے دفعیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعاؤں کی تدبیر اختیار کرنا چاہیے۔ نیز جائز اور صحیح تدابیر اختیار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تحقیق کی بات میں نے اس لیے لکھی ہے کہ جاہل اور وہمی لوگ عموماً بعض خاص قسم کی بیماری کو جادو کا نتیجہ سمجھ لیتے ہیں۔

(۳) آپ کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ علماء کا ایک گروہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیے جانے کا انکار کرتا ہے لیکن اس کے بارے میں چونکہ صحیح احادیث موجود ہیں اس لیے عام طور سے علماء و فقہاء اس کے قائل ہیں کہ حضورؐ پر سحر کیا گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا اثر بس اتنا پڑا تھا کہ حضورؐ کو کچھ تکلیف لاحق ہو گئی تھی جس طرح حضورؐ کو زہر دیا گیا تھا یا بعض دوسرے جسمانی عوارض لاحق ہوئے تھے اسی طرح آپؐ پر جادو

بھی کیا گیا تھا۔ انبیاء کرام علیہم السلام جسمانی امراض و آلام سے مستثنٰی نہیں تھے — معوذتین کے بارے میں کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ اسی موقع پر نازل ہوئی تھیں البتہ اس کے بارے میں ضعیف حدیثیں موجود ہیں۔ صحیح احادیث سے اتنا ثابت ہے کہ آپ بیماری کی حالت میں ان سورتوں کو پڑھ کر دم کیا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ سونے کے وقت بھی معوذتین اور سورۂ اخلاص پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کرتے اور پھر ان ہاتھوں کو چہرۂ مبارک اور جسم کے دوسرے حصوں پر پھیرتے تھے۔

(۴) آپ کے چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ آیات قرآنی یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی دعاؤں کو پڑھ کر مریض پر دم کرنا جائز بلکہ بعض صورتوں میں مسنون ہے۔ اسی طرح آیات اور دعاؤں کو لکھ کر تعویذ کی شکل میں استعمال کرنا بھی جائز ہے لیکن تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کو پیشہ بنانا غلط ہے۔ آج کل جو لوگ اس کو ذریعۂ معاش بناتے ہیں ان میں ننانوے فی صدی کتاب و سنت سے ناواقف ہوتے ہیں اور ان میں تقویٰ اور پرہیز گاری بھی نہیں پائی جاتی اسی لیے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک میں ایسی چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں جو شریعت میں ناجائز اور حرام ہیں۔ اس صورت حال میں اس کے استعمال سے بچنا ہی بہتر ہے۔

قرض اور دین

سوال

اکتوبر کے شمارے میں رسائل و مسائل کے تحت "چند زراعتی مسائل" کے عنوان سے آپ نے چند سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ ان میں سوال ۵ یہ تھا:-

"ایک زمیندار اپنی کھیتی باڑی کے لیے ایک نوکر اس شرط پر رکھتا ہے کہ اگر تم سال بھر کے لیے پانچ سو روپیہ بطور قرض ہم سے لیتے ہو تو ہم خدمت کی مزدوری چار سو روپیہ دیں گے اور اگر قرض نہیں لیتے ہو تو ہم تمہیں مزدوری پانچ سو روپے دیں گے۔ چونکہ اس شخص کو روپیوں کی ضرورت ہے اس لیے وہ ایک سو کم معاوضے پر خدمت قبول کر لیتا ہے — اس بارے میں کیا حکم ہے؟"

اس سوال کا آپ نے یہ جواب دیا ہے کہ سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے وہ مزدور کو سو روپیہ جو کم دے گا وہ دراصل پانچ سو روپیے قرض کا سود ہو گا — اور سوال ۶ (الف)

یہ تھا کہ:۔

"ایک زمیندار غلے کے دام دو طرح کے رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی نقد دے تو پچیس ۲۵ روپیے من اور ادھار لے تو تیس روپیے من' کیا اس طرح کی بیع جائز ہے؟

اس سوال کا جواب آپ نے یہ دیا ہے کہ اس طرح کی بیع جائز ہے۔ اگر ان دونوں صورتوں میں کوئی صورت طے کر کے خرید و فروخت ہو۔

اب مجھے شبہہ یہ ہوا ہے کہ ادھار لینے کی شکل میں بھی تو جو قیمت خریدار کے ذمے باقی ہے وہ قرض ہی ہے اور نقد قیمت کے مقابلے میں پانچ روپیے زائد ہے تو پھر یہ جائز کس طرح ہوا۔ اس شبہے کو دور ...۔

جواب

ادھار لینے کی شکل میں خریدار کے ذمے جو قیمت باقی ہے وہ قرض نہیں ہے بلکہ دَین ہے۔ قرض کے مقابلے میں دَین کا لفظ فقہ کی اصطلاح میں زیادہ عام ہے یعنی ہر قرض پر دین کا لفظ بھی صادق آتا ہے لیکن ہر دَین پر قرض کا لفظ صادق نہیں آتا۔ دَین ہر اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کے ذمے واجب الادا ہو خواہ وہ کسی کی خریدی ہوئی چیز کے دام کے طور پر ہو یا کسی کی چیز برباد کر دینے کی پاداش میں تاوان کے طور پر ہو یا کسی مزدور کی اجرت کے طور پر ہو یا بیوی کے مہر کے طور پر ہو یا دست گرداں لی ہوئی رقم کے طور پر ہو ـــــ اور قرض یہ ہے کہ آپ کسی کو کوئی ایسی چیز جس کا مثل واپس کرنا ممکن ہو اس معاہدے کے ساتھ دیں کہ وہ شخص آپ کو اس کا مثل ادا کر دے گا مثلاً آپ نے کسی کو پانچ روپیے یا پانچ سیر گیہوں اس معاہدے کے ساتھ دیے کہ وہ پانچ روپیے یا پانچ سیر گیہوں آپ کو واپس کر دے گا۔ اسی مخصوص معاملے کو قرض کہتے ہیں اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تیس روپیے من کے حساب سے جو غلہ خریدا گیا ہو اور اس کے دام خریدار کے ذمے باقی ہوں وہ قرض نہیں ہیں کیونکہ قرض میں جو چیز لی جاتی ہے اس کے مثل وہی چیز واپس کی جاتی ہے۔ قرض خرید و فروخت کا کوئی معاملہ نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی چیز بیچی اور خریدی جاتی ہے۔ بیع کے احکام اور قرض کے احکام الگ الگ ہیں۔ بیع اور قرض میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ بائع اپنی چیز پر جو نفع لیتا ہے وہ اس کے لیے حلال و طیب ہے اور قرض دینے والا اپنے قرض پر نفع لے تو وہ اس کے لیے حرام اور خبیث ہے سوال ۵ کے مسئلے میں عدم جواز کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اجارے اور قرض کے معاملے کو خلط

کر دیا گیا ہے اور دوسری یہ کہ مزدور کو سو روپیہ کم معاوضہ دے کر ان پانچ سو روپیوں کا سود حاصل کیا گیا ہے جو مزدور کو بطور قرض دیے گئے تھے ۔ اور سوال ۲ (الف) کے جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے بائع کو اس کا پابند نہیں کیا ہے کہ وہ نقد اور ادھار دونوں صورتوں میں اپنے مال کے دام یکساں وصول کرے ۔

استنجا کے لیے پانی کا استعمال لازمی نہیں ہے

سوال

امریکہ سے مجھے ایک مسلم نوجوان طالب علم نے لکھا ہے کہ وہاں "ضرورت" سے فارغ ہونے کے بعد طہارت کے لیے پانی کے بجائے صرف کاغذ ہی استعمال کیا جاتا ہے تو کیا اس طریقے سے طہارت کے بعد وضو کر کے نماز پڑھی جاسکتی ہے ؟ میں نے جواب میں ان کو لکھا تھا کہ اگر وہ کاغذ خاص قسم کا ہے جس کے استعمال سے نجاست صاف ہو جاتی اور طہارت کا منشا پورا ہو جاتا ہے تو پھر ایسے کاغذ سے طہارت حاصل ہو جانی چاہیے ۔ یہ جواب تو میں نے دے دیا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ آیا فقہ میں طہارت کے لیے پانی کے استعمال کو لازم گردانا گیا ہے یا کسی اور ذریعے سے بھی پاکی حاصل کرنے کی گنجائش موجود ہے ۔

جواب

آپ نے جواب ٹھیک دیا ہے ۔ جو کاغذ طہارت حاصل کرنے ہی کی غرض سے بنایا جاتا ہے اور اس سے نجاست دور بھی ہو جاتی ہے ۔ اس سے پاکی حاصل کرنا درست ہے ۔ پیشاب پاخانے کے بعد طہارت حاصل کرنے کے لیے پانی کا استعمال لازمی نہیں ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پانی کی کمی کی وجہ سے استنجا کے لیے عام طور سے پتھر اور ڈھیلے استعمال کیے جاتے تھے خود حضور ؐ نے بھی پاکی حاصل کرنے کے لیے پتھر استعمال فرمائے ہیں فقہائے احناف کے نزدیک پانی کے علاوہ دوسری پاک چیزوں سے بھی طہارت حاصل کی جاسکتی ہے ۔ فقہ حنفی کی مشہور و مستند کتاب البدائع الصنائع میں ہے :۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ ہو)

روداد اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ

منعقدہ ستمبر ۶۸ء

الحمدللہ کہ مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس کی کارروائی زیر صدارت امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب مرکز جماعت اسلامی ہند واقع محلہ چتلی قبر میں بحسن وخوبی انجام پائی۔

مجلس شوریٰ کی نشستیں ۲۲ ستمبر ۶۸ء بروز یکشنبہ صبح کو شروع ہو کر ۲۴ ستمبر سہ شنبہ مغرب بعد تک جاری رہیں۔ اس کے علاوہ ۲۶ اور ۲۹ ستمبر نیز یکم اکتوبر کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے بعض نشستیں منعقد ہوتی رہیں۔

ایجنڈے کا خاص آئٹم "دستور میں ترمیم سے متعلق تجاویز پر غور" تھا۔ نیز گذشتہ مجلس شوریٰ کے موقع پر جو مسائل ملتوی کر دیے گئے تھے ان پر بھی غور و فیصلہ کرنا تھا۔

مندرجہ ذیل ارکان شوریٰ شریک اجلاس رہے۔

۱۔ جناب انیس الدین احمد صاحب۔ ۲۔ محمد نجات اللہ صاحب۔ ۳۔ عبدالرزاق لطیفی صاحب ۴۔ جناب محمد مسلم صاحب۔ ۵۔ مولانا صدرالدین صاحب۔ ۶۔ مولانا عروج قادری صاحب۔ ۷۔ جناب محمد عبدالحی صاحب۔ ۸۔ جناب محمد یوسف صدیقی صاحب۔ ۹۔ جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب۔ ۱۰۔ سید حامد حسین صاحب۔ ۱۱۔ جناب شمس پیرزادہ صاحب۔ ۱۲۔ سید حامد علی صاحب۔ ۱۳۔ جناب افضل حسین صاحب۔ ۱۴۔ محمد یوسف قیم جماعت۔

جناب کے۔ سی عبداللہ صاحب مولوی (حلقہ کیرلہ) بعض مجبوریوں کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔ نیز دو چار نشستوں میں دو ایک رکن شوریٰ شرکت سے معذور رہے جس کے لیے انھوں نے امیر جماعت سے اجازت حاصل کر لی تھی۔

افتتاح امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب نے خطبہ مسنونہ اور دعا سے کارروائی کا افتتاح فرمایا

جس کے بعد تفصیلی ایجنڈا مرتب کیا گیا اور اوقات کار کی تعیین کی گئی۔

ان چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد قیم جماعت نے گزشتہ اجلاس شوریٰ منعقدہ ۱۵ تا ۲۳ مئی ۶۸ء کی روداد پڑھ کر سنائی جس پر حاضرین ارکان مجلس نے دستخط ثبت کیے۔

دستور میں ترمیم

کچھ ارکان جماعت نے دستور جماعت میں بعض ترمیمات تجویز کی تھیں جن پر مجلس شوریٰ کو غور کرکے ان کے بارے میں سفارشات مرتب کرنی تھیں اور کچھ ترمیمات کی سفارش اس کمیٹی نے کی تھی جو ترمیم دستور سے متعلق امیر جماعت کی تجویزوں پر غور کرنے کے لیے گزشتہ مجلس شوریٰ منعقدہ مئی ۶۸ء کے موقع پر بنائی گئی تھی اور مجلس کو ان پر بھی غور کرکے اپنی سفارشات منظور کرنی تھیں۔ چنانچہ مجلس شوریٰ نے ان میں سے اکثر تجویزوں پر غور کیا اور مجلس نمائندگان میں پیش کرنے کے لیے اپنی سفارشات مرتب کیں جو اجلاس نمائندگان میں پیش ہوئیں اور بعض جزوی ترمیمات کے ساتھ وہ سب منظور کرلی گئیں۔ (یہ ترمیمات اجلاس نمائندگان کی کارروائی میں پہلے شائع ہوچکی ہیں۔)

ترمیم دستور سے متعلق بعض دیگر تجاویز کافی غور و فکر کی طالب تھیں چنانچہ ان پر غور آئندہ کے لیے ملتوی کردیا گیا۔

تعبیر دستور

تبادلۂ خیالات کے دوران مجلس نے یہ بھی محسوس کیا کہ دستور جماعت کی بعض دفعات کی تعبیر کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان کی تعبیر بھی کردی گئی۔

دفعہ ۱۰ دفعہ ۱۰ کے تحت یہ ضروری نہیں ہے کہ امیر جماعت اس بارے میں بھی مجلس شوریٰ سے مشورہ کرے کہ ضلعی نظام کہاں کہاں قائم کیے جائیں اور ان کے حدود کیا ہوں؟

دفعہ ۴۶ (الف) کسی تنظیمی حلقہ کے امیر کے تقرر کے سلسلے میں ارکان حلقہ کا مشورہ لینے کی مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کوئی بھی صورت امیر جماعت اختیار کرسکتا ہے۔

(۱) ارکان حلقہ سے معلوم کرنا کہ امارت حلقہ کے لیے کس کو موزوں سمجھتے ہیں

(۲) ایک یا چند نام اپنی طرف سے تجویز کرکے ان کے متعلق معلوم کرنا کہ امارت حلقہ کے لیے ان میں کس کو زیادہ موزوں سمجھتے ہیں۔

(۳) اجتماعات وغیرہ کے موقع پر گفتگو کرکے یہ اندازہ لگالینا کہ ارکان حلقہ کی اکثریت امارت حلقہ کے لیے کس فرد کو موزوں سمجھتی ہے۔

رایوں اور مشوروں کی پابندی دفعہ ۱۴، ۵۳ (الف) ۶۴ (الف)، ۷۰ اور ۷۱ میں ایک جماعت رایوں اور مشوروں کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند نہیں ہے۔

دفعہ ۱۵ اس دفعہ میں "خاص معاملہ" میں قرار دادوں اور ان کی اشاعت کا معاملہ بھی داخل ہے

قواعد وضوابط

دستور جماعت کی دفعہ ۱۷ کے تحت دستور کے منشا کو پورا کرنے اور دعوتی سرگرمیوں کو منظم کرنے کے لیے امیر جماعت نے اخراج ارکان اور تعلیمی نظم وغیرہ کے سلسلے میں جو ذیلی قواعد مرتب کیے تھے ان کے سلسلے میں ارکان شوریٰ سے مشورہ بھی طلب کیا اور ان کے مشورہ کے مطابق کہیں کہیں جزوی ترمیم کرکے ان کے اتفاق رائے سے ان کو آخری شکل دی (یہ قواعد الگ سے شائع کیے جائیں گے۔)

مجلس کی آخری نشست یکم اکتوبر کو بعد مغرب ہوئی لیکن محسوس یہ ہوا کہ ترمیم دستور کی بعض تجاویز کے علاوہ گزشتہ شوریٰ کے جو ملتوی شدہ مسائل زیر غور آنے سے باقی رہ گئے ہیں ان پر غور وفکر کے لیے بھی کافی وقت درکار ہوگا اور مجلس شوریٰ، پھر مجلس نمائندگان کی مسلسل مصروفیتوں کی وجہ سے رفقاء کافی تھک چکے تھے۔ نیز امرائے حلقہ جات کا اجتماع بھی منعقد کرنا ضروری تھا۔ اس لیے بقیہ مسائل پر غور ملتوی کرنا پڑا اور پر اجلاس برخاست کیا گیا۔

محمد یوسف

(بقیہ صفحہ ۵۳)

السنۃ ھو الاستنجاء بالاشیاء	سنت یہ ہے کہ پاک چیزوں سے استنجا
الطاھرۃ من الاحجار والامدار و	کیا جائے جیسے پتھر، مٹی کے ڈھیلے، مٹی اور
التراب والخرق البوالی	پرانے کپڑے کے ٹکڑے۔

مثال میں پرانے ٹکڑوں کا ذکر اس لیے نہیں ہے کہ نئے کپڑے کے ٹکڑوں سے طہارت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس لیے ہے کہ نئے ٹکڑوں کو گندہ کرکے برباد کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم کہ یورپ وامریکہ میں طہارت ہی کے لیے مخصوص کاغذ سے پاکی حاصل کرنے کے بعد وضو کرکے بلاکراہ نماز پڑھی جاسکتی ہے البتہ نظافت کے لیے قیام گاہ پہنچ کر پانی سے بھی استنجا کرلینا بہتر ہے۔

روداد اجتماع اُمرائے حلقہ جات

منعقدہ ۳۰ ستمبر و یکم اکتوبر ۶۸ء

الحمدللہ کہ مجلس نمائندگان کے اجلاس کے بعد امرائے حلقہ جات کا اجتماع زیر صدارت مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند ۳۰ ستمبر ۶۸ء کو بعد نماز عشاء ۹ بجے شروع ہوا۔ رات میں ایک مختصر نشست ہوئی۔ پھر دوسرے دن یکم اکتوبر ۶۸ء کو صبح ۷½ بجے سے اجلاس شروع ہو کر قبل نماز عصر بحسن وخوبی اختتام پذیر ہوا

اس اجتماع میں مندرجہ ذیل امرائے حلقہ جات شریک ہوئے۔

۱۔ جناب ابوالفتاح صاحب (مغربی بنگال واڑیسہ) ۲۔ جناب عبدالباری صاحب (شمالی بہار) ۳۔ جناب انیس الدین احمد صاحب (جنوبی بہار) ۴۔ مولانا حبیب اللہ صاحب (مشرقی یوپی) ۵۔ مولانا عبدالغفار صاحب (وسطی یوپی) ۶۔ جناب محمد شفیع مونس صاحب (مغربی یوپی) (۷) مولانا منظور الحق صاحب (راجستھان) ۸۔ مولانا نظام الدین صاحب (بھوپال) ۹۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب (بمبئی) ۱۰۔ جناب محمود احمد خاں صاحب (اورنگ آباد) ۱۱۔ جناب عبدالرزاق لطیفی صاحب (حیدرآباد) ۱۲۔ جناب عبدالعزیز صاحب (آندھرا و مدراس) ۱۳۔ جناب سراج الحسن صاحب (میسور) ۱۴۔ مولانا اے کے عبدالقادر صاحب (کیرلہ)

خصوصی دعوت پر جناب سید حامد حسین صاحب بھی شریک اجتماع ہوئے نیز شعبہ تنظیم سے متعلق افراد افضل حسین صاحب، سید حامد حسین صاحب، عبدالعظیم خاں صاحب اور محمد یوسف بھی شریک رہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد امیر جماعت نے اجلاس کا افتتاح فرمایا اس کے بعد امرائے حلقہ جات کے اجتماع منعقدہ ۱۰ مئی تا ۱۵ مئی ۶۷ء کی روداد پڑھ کر سنائی گئی اور پھر ۱۵ اپریل ۶۸ء کو امرائے

حلقہ جات کا جو اجتماع منعقد ہوا تھا اس کی روداد کی خواندگی ہوئی اور شرکاء نے ان رودادوں پر دستخط ثبت کیے۔

اس کے بعد تفصیلی ایجنڈا مرتب کیا گیا اور اوقات کار کی تعیین کی گئی۔

اس اجتماع میں گفتگو اور تبادلۂ خیالات کا خاص موضوع جماعت کا چہار سالہ پروگرام تھا۔ چنانچہ اس کے خاص خاص نکات کی تفہیم و توضیح پیش نظر رہی۔ اس ضمن میں سب سے پہلے امیر محترم نے ان امرائے حلقہ جات کو جنہیں اپنے حلقے کی جماعتوں اور منفرد ارکان سے بعض متعین معلومات ابھی تک وصول نہیں ہوسکی ہیں ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد ان معلومات کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح اپنے پروگرام میں شامل کرکے اس کو مکمل کرلیں۔

علاقائی دار الاشاعتیں

جماعت کے چہار سالہ پروگرام میں علاقائی دار الاشاعتوں کو وسعت دینا بھی طے کیا گیا ہے تاکہ مقامی زبانوں میں بنیادی لٹریچر زیادہ سے زیادہ تیار ہوسکے۔ چنانچہ مختلف علاقائی دار الاشاعتوں کے مسائل اور مشکلات سامنے آئیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

ملیالم، آسامی، تیلگو، تامل، گجراتی، مرہٹی، کنڑی اور بنگلہ دار الاشاعتوں کو مرکز سے رقمی اعانت کی منظوری بھی دی گئی۔ نیز ہندی دار الاشاعت کو بہتر بنانے پر غور کیا گیا۔

اشاعت قرآن کی اسکیم

علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کی اشاعت کی ضرورت اور اہمیت پر امرائے حلقہ جات کے اجتماع منعقدہ مئی ۱۹۶۶ء میں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ مرکز سے جاری کردہ سرکلر مورخہ ۵ اپریل ۱۹۶۶ء کے پیش نظر اس کام پر پوری توجہ صرف کی جائے۔ چنانچہ یہ مسئلہ خصوصی اہمیت کے ساتھ اس مرتبہ بھی زیر غور آیا اور جملہ شرکاء کو اس کام کی ضرورت و افادیت سے اتفاق تھا۔ اس سلسلے میں ایک بڑی رکاوٹ مالیات کی ہے۔ علاقائی دار الاشاعتوں کو مرکز کی جانب سے یہ اجازت بھی دی جاچکی ہے کہ وہ قرآن مجید، حدیث شریف اور سیرت طیبہ کی اشاعت کے سلسلے میں اصحاب خیر سے مالی تعاون حاصل کرسکتے ہیں لیکن چونکہ اس کام کے سلسلے میں کافی ذرائع و وسائل کی ضرورت ہے اس لیے ابھی اس کام میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہوسکی صرف تامل اور ملیالم میں کچھ کام ہوا ہے۔

اس مرتبہ ایک متعین تجویز سامنے آئی جس پر اتفاق کیا گیا کہ اس کام کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں ایسے اشاعتی بورڈ تشکیل دیے جائیں جن میں امت کے وہ تمام حضرات حصہ لے سکیں جن کو اس کارِ خیر سے دلچسپی ہو اور یہی حضرات بورڈ کے نظم و نسق کے چلانے اور اشاعت کے کاموں کے ذمہ دار ہوں۔ ایسے بورڈ اگر وقف ہوں تو اور بھی بہتر ہے۔ اس طرح امید کی جاتی ہے کہ قرآن مجید، حدیث شریف اور سیرت طیبہ کی اشاعت کی ایک قابل عمل صورت بن سکے گی۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ جماعتی لٹریچر کو حسب سابق مختلف علاقوں میں جماعتی دارالاشاعتوں کے ذریعہ ہی شائع کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں امراء کو توجہ دلائی گئی کہ علاقائی دارالاشاعتوں کے تحت بنیادی لٹریچر کی اشاعت کا خاکہ جن علاقوں میں ابھی مرتب نہیں ہوا ہے اس کو مرتب کر لیا جائے اور مرکز کی منظوری کے بعد اس کو زیر عمل لانے کی کوشش کی جائے۔

حلقۂ متفقین پروگرام میں زیادہ سے زیادہ متفقین بنانے اور ان کے حلقے قائم کرنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ "جس مقام پر دو یا دو سے زائد متفقین ہوں وہاں حلقۂ متفقین قائم کیا جا سکتا ہے" (شق ۵) بعض شرکاء اجتماع نے اس عبارت کی وضاحت معلوم کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس عبارت کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے امیر جماعت نے فرمایا کہ حلقۂ متفقین کا قیام امیر حلقہ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ اگر کسی مقام پر مقامی جماعت کی موجودگی میں بھی وہ ضرورت محسوس کرتا ہے تو حلقۂ متفقین الگ سے قائم کر سکتا ہے۔

آپ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ امرائے حلقہ جات اپنی سہ ماہی رپورٹوں میں جن کو وہ مرکز بھیجا کرتے ہیں اس بات کا تذکرہ بھی ضرور کر دیا کریں کہ متفقین کی جملہ تعداد کتنی ہے اور متعلقہ سہ ماہی کے اندر اس میں کیا اضافہ ہوا ہے۔

دوروں کے پروگرام امرائے حلقہ جات نے اپنے اپنے حلقوں کے سلسلے میں یہ معلومات بھی فراہم کیں کہ ان کے حلقوں میں اجتماعات یا دوروں کے لیے کون کون سی تاریخیں مناسب ہوں گی تاکہ مرکز کے ذمہ دار اسی کی مناسبت سے اپنے آئندہ دوروں کا پروگرام مرتب کر سکیں۔ بعض حلقوں کے دوروں اور اجتماعات کی تاریخیں آخری طور سے طے بھی کر دی گئیں اور بقیہ حلقوں کے اجتماعات اور دوروں کی تاریخیں مرکز بعد کو طے کر کے امرائے حلقہ جات کو مطلع کر دے گا۔

قواعد و ضوابط امیر جماعت نے امرائے حلقہ جات کو ان قواعد و ضوابط سے بھی مطلع کیا جو دستور جماعت کے منشاء کو پورا کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور جن کو الگ سے شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ ضوابط ارکان جماعت کے اخراج، مقامی اور حلقہ کے بیت المال، نظام ضلع وغیرہ سے متعلق ہیں۔

جماعتی اخبارات و رسائل چہار سالہ پروگرام میں جماعتی اخبارات و رسائل کی توسیع اشاعت کے لیے بھی پوری جد و جہد کرنا اور اس مقصد کے لیے ہر حلقے میں ہر سال کم از کم ایک ہفتہ منانا طے کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں شرکاء میں سے بعض نے اپنے حلقے کے لیے ہر حلقے میں ہر سال کم از کم وقت کی نشان دہی کی اور بعض دیگر شرکاء نے بعد میں اس موضوع پر آپس میں تبادلۂ خیالات کر کے پروگرام مرتب کیا۔

پروگرام کی افہام و تفہیم کے علاوہ بھی بعض ملکی و ملی مسائل زیر غور آئے۔ نیز وقتاً فوقتاً الگ بھی اپنے اپنے حلقوں کے خصوصی مسائل کے سلسلے میں امرائے حلقہ جات امیر جماعت سے مشورے اور ہدایات حاصل کرتے رہے۔ یکم اکتوبر کو نماز عصر سے تھوڑی دیر پہلے دعا پر اجتماع ختم ہوا۔

محمد یوسف قیم جماعت اسلامی ہند ۱۲ر نومبر ۱۹۶۸ء

زندگی

ماہنامہ زندگی رام پور۔ یوپی ایک سنجیدہ، دینی اور علمی مجلہ ہے جس کی زبان اور معیار بھی خالص علمی ہے۔ یہ اقامت دین کا داعی اور جماعت اسلامی ہند کا دعوتی و علمی آرگن ہے۔ ذہنی و فکری انقلاب پیدا کرنے والی ہر تحریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ علمی میدان میں بھی اپنی ساکھ باقی رکھے، بلکہ اس کو ترقی دے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس ماہنامے کو ملک کے اہل علم حلقوں میں متعارف کیا جائے اور ان حلقوں میں اسے پھیلانے اور پہنچانے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام ہو۔

منیجر ماہنامہ "زندگی" رام پور

فہرست مندرجات زندگی از جولائی ۶۹ء تا دسمبر ۶۹ء

مضمون نگاروں کے نام	موضوع کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
جناب شمس نوید عثمانی	وہ لوگ جن کا انجام بخیر ہوا	۴۱	۵	نومبر ،،
مولانا صدرالدین اصلاحی	مسلم پرسنل لا کی اصل حیثیت	،،	،،	،،
ڈاکٹر عبدالحق انصاری	تزکیۂ نفس		۱	جولائی ،،
،،	رضائے الٰہی		۲	اگست ،،
،،	طلب آخرت		۳	ستمبر ،،
،،	مقصد زندگی کا جامع تصور		۴	اکتوبر ،،
،،	،،		۵	نومبر ،،
،،	قومی یکجہتی اور اتحاد مذاہب		۶	دسمبر ،،
جناب فرحت قمر صاحب ایم اے	مغربی انداز فکر		۴	اکتوبر ،،
جناب نجات اللہ صدیقی	تحفظ ملت کا مسئلہ		۱	جولائی ،،
جناب نعیم صدیقی ندوی	رشوت		۳	ستمبر ،،

تراجم و اقتباسات

مضمون نگاروں کے نام	موضوع کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اہم سوالات ۔ واضح جوابات	۴۱	۱	جولائی ،،
،،	،،	،،	۲	اگست ،،
ادارہ	چند علمی و تاریخی واقعات	،،	۴	اکتوبر ،،
جناب عبداللہ منہاس	اشاعت قرآن	،،	،،	،،
	جمہوریہ چڈ	،،	۶	دسمبر

رسائل و مسائل

مضمون نگاروں کے نام	موضوع کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
سید احمد قادری	ہندوستان میں مسلمانوں پر عشر نکالنا واجب ہے	۴۱	۱	جولائی ،،
،،	مسلک شافعی میں تکبیرات عیدین پر ایک سوال	،،	۳	ستمبر ،،
،،	وجوب عشر کے لیے زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں ہے			
،،	شیطان نے جنت میں کس طرح بہکایا			

مضمون نگاروں کے نام	موضوع کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
سید احمد قادری	حج بدل کے بعض مسائل	۴۱	۳	ستمبر ۶۸
	عشر کے بارے میں چند سوالات			
	خطبہ جمعہ کے وقت سلام			
	مہر کا استحقاق اور نان و نفقہ			
	چند زراعتی مسائل		۴	اکتوبر "
	شاعرے اور شعر و شاعری			
	سحر و ساحری اور چند دوسرے مسائل		۶	دسمبر "
	قرض اور دین			
	استنجا کے لیے پانی کا استعمال لازمی نہیں ہے			
	اخبار و افکار			
ادارہ	تشدد کی کالی گھٹا خوں چکاں ہے	۴۱	۱	جولائی "
	کاغذی وجود	"	۳	ستمبر "
	خاندانی منصوبہ بندی			
	علی گڈھ میں ایک سمینار	"	۵	نومبر "
	رودادیں			
قیم جماعت اسلامی ہند	روداد مجلس شوریٰ ۱۵ مئی تا ۲۳ مئی ۶۸ء	۴۱	۲	اگست ۶۸ء
	روداد مجلس نمائندگان ۲۵ تا ۳۰ ستمبر ۶۸ء	"	۵	نومبر "
	روداد مرکزی مجلس شوریٰ	"	۶	دسمبر "
	روداد اجتماع امرائے حلقہ جات	"	"	"
	تنقید و تبصرہ			
[illegible]	تقریب القرآن مولانا عبدالوہاب خاں رامپوری	۴۱	۱	جولائی ۶۸ء
	ماہنامہ الفاروق رام پور	"	۲	اگست "
	ترکی اردو لغت۔ محمد صابر		۳	ستمبر "
	چراغ راہ شرق اوسط نمبر			

[illegible]	شمارہ	جلد	موضوع کا مختصر تعارف	مضمون نگاروں کے نام
ستمبر [illegible]	۳	۴۱	مقام صحابہ - مولانا مودودی	ح - ق
			نزول قرآن مجید مجلہ خلافت کا غیر	
			حضرت اکبر کے روز و شب محمد اکرم سہارنپوری	
			دار السلام مجلہ عمرآباد مدراس	
اکتوبر [illegible]	۴	〃	حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ محمد علی گلاٹھی	
		〃	ہندوستان میں عربوں کی حکومت قاضی اطہر	
			دل لخت لخت عروج زیدی	
			نقش نقا - بقا نظامی	
			ایک لمحۂ فکریہ عبد الحمید صدیقی	
			ایک ادبی تحریک عنایت اللہ فیضی	
			اقبال اور نظریہ پاکستان نعیم صدیقی	
		〃	نقوش راہ - مترجم محمد عنایت اللہ	

Monthly 'ZINDGI' Rampur, Dec. 1968, Regd. No. L-688

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

★ دورِ حاضر کے استدلالی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے۔

★ مغربی افکار سے مرعوبیت کو دور کرنے۔

★ قرآن کی مرکزی دعوت اور تمام اہم مسائل حیات سے اس کے تعلق کی نوعیت واضح کرنے۔

★ اسلام کے جامع نظام حیات کی طرف بصیرت افروز رہنمائی کرنے۔

★ قرآن کی انقلابی دعوت کو دل نشیں انداز میں پیش کرنے کے لئے۔

جلد اول

الفاتحہ ... ... الانعام

ہدیہ مع جلد 12/- روپیہ

جلد دوئم

اعراف ... ... بنی اسرائیل

ہدیہ مع جلد 15/- روپیہ

جلد سوئم

کہف ... ... روم

ہدیہ مع جلد 17/- روپیہ

جلد چہارم

لقمان ... ... الاحقاف

ہدیہ مع جلد 16/- روپیہ

ملنے کا پتہ

منیجر مکتبہ زندگی و کانتی - رامپور - یو - پی

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur